٦٠

آج

ستیہ جیت رے
پرمودیا اننتا تور

اسد زیدی
رالف رسل

ترتیب: اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 60

اکتوبر 2008

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 400 روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 5213916 5650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

رالف رسل

(21 مئی 1918 - 14 ستمبر 2008)

کی یاد میں

Scanned with CamScanner

ترتیب

تعارف

ستیہ جیت رے

13

مداح

26

بارین بھومِک کی بیماری

43

کھگم

62

رتن بابو اور وہ آدمی

80

پروفیسر ہج بج بج

99

فرِتس

110

سنکی بابو

Scanned with CamScanner

125
براؤن صاحب کی کوٹھی
140
سدانند کی چھوٹی سی دنیا

❄

تعارف

پرمودیا اننتا تور

157
قدموں کی آہٹ
(ناول کا پہلا باب)

❄

تعارف

اسد زیدی

185
نظمیں

❄

Scanned with CamScanner

تعارف

رالف رسل

235

کچھ کھویا، کچھ پایا

(خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ: باب 1 تا 6)

❄

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ’’آج‘‘ کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 57 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ’’آج‘‘ کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں ’’گابریئل گارسیا مارکیز‘‘، ’’سرائیوو سرائیوو‘‘ (بوسنیا)، ’’نرمل ورما‘‘، ’’کراچی کی کہانی‘‘ اور ’’محمد خالد اختر‘‘ کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

’’آج‘‘ کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں
اور ’’آج کی کتابیں‘‘ اور ’’سٹی پریس‘‘ کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: 400 روپے

بیرونِ ملک: 60 امریکی ڈالر

Scanned with CamScanner

پاکستانی اردو کتابیں

مولانا حسرت موہانی کی سیاسی زندگی پر عمدہ کتاب
حسرت کی سیاست
تالیف: احمد سلیم
قیمت: 400 روپے

امّاں سین اور دیگر شخصیے
(خاکے)
ڈاکٹر عطش درّانی
قیمت: 250 روپے

طلسمِ ہوش رُبا
انتخاب: محمد حسن عسکری
قیمت: 280 روپے

مسلم فکر و فلسفہ عہد بہ عہد
محمد کاظم
قیمت: 300 روپے

نصف الملاقات
(مشاہیر کے خطوط مع سوانحی کوائف)
ڈاکٹر فرمان فتح پوری
قیمت: 225 روپے

مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ
(شخصیت اور فن)
ڈاکٹر محسنہ نقوی
قیمت: 110 روپے

خواجہ حسن نظامی: خاکے اور خاکہ نگاری
ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری
قیمت: 225 روپے

نذرِ مسعود
مرزا خلیل احمد بیگ
قیمت: 210 روپے

اردو کے نمائندہ کلاسیکی غزل گو
سید عامر سہیل/ ڈاکٹر قاضی عابد
قیمت: 250 روپے

غالب اور غالبیات
ڈاکٹر فرمان فتح پوری
قیمت: 125 روپے

شرح و متن غزلیاتِ غالب
ڈاکٹر فرمان فتح پوری
قیمت: 275 روپے

لیلیٰ کے خطوط
قاضی عبدالغفار
قیمت: 140 روپے

Scanned with CamScanner

ستیہ جیت رے

نو کہانیاں

انتخاب اور ترجمہ

خالد جاوید

Scanned with CamScanner

تعارف

ستیہ جیت رے 2 مئی 1921 کو کلکتہ میں پیدا ہوئے تھے۔ عام طور سے انھیں ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ساز تسلیم کیا جاتا ہے۔ ستیہ جیت رے نے اپنا سفر بطور ایک مصور (Illustrator) شروع کیا تھا۔ وہ ایک اشتہاری کمپنی کے ایڈوائزر بھی رہے۔ 1947 میں انھوں نے کلکتہ فلم سوسائٹی کو قائم کرنے میں اپنا تعاون دیا۔ پاتھیر پنچالی (1955)، اپرا جیتو (1956)، پارس پتھر (1958)، جلسہ گھر (1958)، اَپُر سنسار (1959)، دیوی (1960)، چارولتا (1964)، شطرنج کے کھلاڑی (1977)، سدگتی (1981) اور گھرے با ہرے (1984) ان کی چند ایسی فلموں میں سے ہیں جن کی وجہ سے ستیہ جیت رے کو عالمی شہرت نصیب ہوئی اور ان کا شمار دنیا کے عظیم فلمسازوں میں کیا جانے لگا۔

مگر ستیہ جیت رے صرف ایک فلم ساز ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے ادیب، مصور اور سنگیت کار بھی تھے۔ 1961 میں ستیہ جیت رے نے بنگالی زبان میں شائع ہونے والے بچوں کے مشہور رسالے سندیش کو دوبارہ نکالنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس رسالے کے بانیوں میں ان کے والد اور دادا بھی شامل رہے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے ستیہ جیت رے نے کیمرے کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور سندیش کے صفحات کو اپنی مصوری اور اسکیچوں کے بہترین نمونوں سے بھر کر رکھ دیا۔ انھوں نے سندیش کے لیے بے شمار کہانیاں، نظمیں اور مضامین بھی لکھے۔ بعد میں ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جو بے حد مقبول ہوئے۔ ان میں ''فیلودا سیریز'' کے تحت لکھی گئی جاسوسی کہانیوں کے علاوہ ''پروفیسر شونکو سیریز'' کے سائنس فکشن بھی شامل ہیں۔ ستیہ جیت رے نے بچپن کے دن اور اپو کے ساتھ میرے سال کے عنوانات سے اپنی یادداشتیں بھی تحریر کی ہیں۔

ستیہ جیت رے کا انتقال اپریل 1992 کو کلکتہ میں ہوا اور ان کے ساتھ ہی گویا ایک پورے عہد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

ستیہ جیت رے کی فلمیں عام طور پر بنگلہ ادیبوں کی تخلیقات پر ہی مبنی ہیں۔ وہ فلم کو ایک مغربی آرٹ سمجھتے تھے مگر ان کا مقصد بنگال کے لوگوں کے لیے بھی فلم بنانا تھا۔ ان کی فلموں کو سمجھنے کے لیے ان کی کہانیوں کا مطالعہ بھی کرنا ضروری ہے۔

Scanned with CamScanner

یہ انتخاب ستیہ جیت رے کی ان کہانیوں سے کیا گیا ہے جو پراسرار یا فوق الفطرت کہانیوں کے زمرے میں آتی ہیں، اگرچہ سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی نہیں ہوگا۔ یہ انتہا پسند حد تک مافوق الفطرت عناصر رکھنے والی کہانیاں نہیں ہیں۔ زیر مطالعہ کہانیاں ان کہانیوں میں سے ہیں جن میں ایک دھیما دھیما سا اسرار پوشیدہ ہے۔ ان کہانیوں کا لہجہ بہت مدھم اور نغمہ آمیز ہے۔ ان میں غصے کی کوئی لہر یا تشدد کی کوئی کیفیت نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح ان کی فلموں میں بھی غصے، برہمی یا بلند آواز میں احتجاج کی جگہ انسانی وجود کے نرم پہلوؤں کی ہی زیادہ عکاسی نظر آتی ہے۔ کہانیوں میں اگرچہ واقعہ موجود ہے، اور وہ بہت اہم بھی ہے، مگر ستیہ جیت رے 'واقعے' سے زیادہ تر ایک قسم کی دوری بنائے رکھتے ہیں۔ یہاں سب کچھ، سارا ماجرا، صرف ایک 'اتفاق' نظر آتا ہے۔ کردار جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں، ان کو وہ خود اپنے لیے نہیں پیدا کرتے۔ ان کی فلموں کے کرداروں کی طرح ان کہانیوں کے کردار بھی زیادہ تر ان حالات سے باہر آنے کی جدوجہد کرتے ہیں؛ خوف، بے چینی، اپنی ذات کے کرب، ناقابل یقین واقعات اور اتفاقات کے پراسرار حصار سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی انسانی زندگی کا وقار ہے۔ اپنی خوش مزاجی اور wit کے ذریعے ناقابل یقین اور پراسرار حالات کے بھیانک عناصر کو تحلیل کر دینے والے ان کرداروں کی یہ کوشش انسانی وجود کو ایک بامعنی جہت بخشتی ہے۔

بہت غور کرنے پر یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ستیہ جیت رے کی ان کہانیوں کی زیریں سطح پر ایک قسم کی 'بیراگ' کی دھندلی سی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ دوری، بیراگ اور ایک پُر اسرار مگر روحانی اُداسی کی کیفیت ستیہ جیت رے کو ٹیگور کے ویدانتی فلسفے کے بہت قریب لے آتی ہے۔ اس لیے ان کہانیوں کا پراسرار ہونا محض سطحی نوعیت کا نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کا ناقابل فہم 'روحانی اسرار' ہے۔ اس کائنات، زمان و مکان سے ماورا ایک بھید اور ایک رہسیہ۔ جو حقیقت اور صداقت کے وسیع مفہوم میں ہی اپنی جھلک پیش کر سکتا ہے۔ 'اسرار' حقیقت کے ساتھ منسلک ہے —اسے زندگی کی جاری و ساری کلیات میں ہی دیکھنا ہوگا۔ ستیہ جیت رے نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ بغیر کسی قسم کی سرریئلسٹک تکنیک یا اسلوب کو اختیار کیے، سیدھے سادھے، سچے اور حقیقی بیانیے کے ذریعے ہی اس اسرار کو محسوس کیا جا سکتا ہے، اور دکھایا بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ ستیہ جیت رے کی ان کہانیوں کو اس مذہبی فلسفیانہ فکر کی روشنی میں ہی پڑھا جا سکتا ہے جو کہ ٹیگور کے ویدانتی نظریے کا سرچشمہ ہے، جس کی رو سے انسان اور کائنات کا رشتہ بجائے خود ایک بھید یا اسرار ہے۔ یہیں سے ستیہ جیت رے کی کہانیوں میں ایک وجودی جہت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

ان کی بیشتر کہانیوں میں خیر و شر کی کشمکش کوئی واضح شناخت بنتی نظر نہیں آتی۔ خیر و شر دونوں ہی اضافی

Scanned with CamScanner

ہیں ۔ستیہ جیت رے ان دونوں کے درمیان کوئی تناؤ یا ٹکراؤ پیدا کرنے سے بچتے ہیں۔ان کے یہاں جو 'بھیانک پن' (horror) ہے وہ بھی 'شر' کے پورے قد تک نہیں پہنچتا، بلکہ زندگی کی تفہیم کے واسطے بس ایک دھندلی سی بصیرت کا نشان دکھا کر اوجھل ہو جاتا ہے۔'شر' یعنی شیطانی طاقت کا اظہار ہی 'بھیانک پن' کی کیفیت کا نام ہوتا ہے، مگر ستیہ جیت رے 'شر' کو ویدانت کے اخلاقی نظریے کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔دنیا 'مایا' 'اگیان' اور کھیل تماشے سے بڑھ کر کچھ نہیں رہ جاتی۔

مغربی افکار، فلموں اور نظریات سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خالص ہندوستانی فلسفیانہ نقطۂ نظر نہ صرف ستیہ جیت رے کی تحریروں میں بلکہ ان کی فلموں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ ایک سائنسی اندازِ فکر رکھنے والے دانشور بھی تھے، اس لیے ان کے آرٹ میں انوکھے پن کا پہلو اس سائنسی فکر، جدید خیالات، کھوج بین کے مادے اور ویدانتی فلسفے کے تال میل سے پیدا ہوا ہے۔

ستیہ جیت رے ماحول کی جزئیات نگاری میں گویا قلم سے نہیں بلکہ اپنے اس انوکھے کیمرے سے کام لیتے ہیں جس سے وہ فلمیں بناتے ہیں۔ان کہانیوں کے بیانیے میں ماضی، حال اور مستقبل ایک اسملاژ کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔اکثر ان کے بیانیے میں بصری کمپوزیشن، اچانک زمانہ حال کے صیغے میں اس طرح آکر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے جیسے سنیما گھر کے گاڑھے اندھیرے میں سفید پردے پر کوئی جیتا جاگتا منظر۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ستیہ جیت رے کی ساری فکر اور سارا شعور ہی visual میں تبدیل ہو گئے ہوں۔میری رائے میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اگرچہ ان کا کیمرا ریئلزم (Realism) کی مکمل نمائندگی کرتا تھا مگر اس ریئلزم کے ساتھ وہ اسرار بھی ناگزیر طور پر ان کی بصیرت کا حصہ بن گیا تھا جس کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

دوسری وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ان کی کہانیوں میں جس قسم کا آہنگ ہے اسے ایک قسم کی موسیقی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔جو لَے ان کہانیوں کی ہے وہ ان کی فلموں کے visual کی لَے سے ملتی جلتی ہے۔ستیہ جیت رے مغربی کلاسیکل موسیقی کے بہت قائل تھے۔ان کے خیال میں مغربی کلاسیکل موسیقی میں ایک ڈراما، ایک کہانی کی روایت بھی موجود رہی ہے۔بیتھووِن کی کسی سمفنی کو ایک دردبھری روح کی پکار، تقدیر کے خلاف انسان کی جدوجہد یا بین الاقوامی بھائی چارے کی شکل میں بھی مانا جا سکتا ہے۔ہندوستانی کلاسیکل موسیقی میں یہ بات نہیں ہے۔یہاں صرف ایک راگ ہے، پہلے سے ہی طے کیا گیا ایک موڈ اور ایک سُر جو شروع ہوتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔اس لیے شاید ان کہانیوں میں الفاظ کے ذریعے جو داخلی موسیقی تشکیل دی گئی ہے وہ فلموں کے مناظر کی طرح ہی اپنے آپ میں اس کہانی کو پیوست کیے ہوئے ہے جسے کہا بھی جا رہا ہے۔

خالد جاوید

Scanned with CamScanner

مداح

اَرُوپ بابو— یعنی اروپ رتن سرکار— گیارہ سال کے بعد پوری آئے ہیں۔ شہر میں تھوڑی بہت تبدیلی نظر آ رہی ہے— جیسے کچھ نئے مکان، نئے سرے سے بنائی گئی کچھ سڑکیں، دو چار چھوٹے بڑے ہوٹل— مگر جب وہ سمندر کے کنارے آئے تو انھیں لگا، یہ سمندر بدلنے والی چیز نہیں ہے۔ وہ ساگرِکا ہوٹل میں ٹھہرے ہیں؛ وہاں سے سمندر حالانکہ نظر نہیں آتا، لیکن رات میں جب لوگوں کا شور غل ختم جاتا ہے تو لہروں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس آواز کو سن کر کل اروپ بابو باہر نکل آئے تھے۔ وہ کل ہی پوری آئے ہیں۔ دن کے وقت انھیں کچھ خرید فروخت کرنا تھی، اس لیے سمندر کے کنارے کی طرف نہیں گئے تھے۔ رات میں جا کر دیکھا، اماوس کے اندھیرے میں بھی لہروں کے جھاگ صاف صاف نظر آتے ہیں۔ اروپ بابو کو یاد آیا، بچپن میں انھوں نے کہیں پڑھا تھا کہ سمندر کے پانی میں فاسفورس رہتا ہے اور اس لیے اندھیرے میں بھی لہریں دکھائی دیتی ہیں۔ اروپ بابو کو روشنی سے جگمگاتی پُر اسرار لہروں کو دیکھنا بہت ہی اچھا لگا۔ کلکتہ میں دیکھ کر کوئی انھیں حساس طبیعت کا نہیں کہہ سکتا تو نہ کہے، اروپ بابو جانتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ کتنے حساس تھے۔ کام کے بوجھ تلے کہیں وہ جذبات گم نہ ہو جائیں اس لیے وہ اب بھی بیچ بیچ میں گنگا کے کنارے اور اِیڈن گارڈن میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پیڑوں، پانی اور پھولوں کو دیکھ کر انھیں خوشی ہوتی ہے۔ پرندوں کا گیت سن کر پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کوئل کی آواز ہے یا پپیہے کی۔ اندھیرے میں بہت دیر تک سمندر کی طرف لگاتار دیکھتے رہنے کے بعد انھیں لگا، سولہ سال کی نوکری کی زندگی کی اکتاہٹ یا اداسی بہت کچھ دور ہو گئی ہے۔

آج تیسرے پہر بھی اروپ بابو سمندر کے کنارے آئے ہیں۔ کچھ دور تک پیدل چلنے کے بعد اب ان کی خواہش نہیں ہو رہی ہے کہ چہل قدمی کریں۔ ایک گیروا دھاری، سادھو بابا یا گرو جیسا

Scanned with CamScanner

شخص تیز قدموں سے ریت کے اوپر چلا آ رہا ہے۔ پیچھے پیچھے عورت مرد چیلوں چپانٹوں کا ایک غول اس کے قدموں سے قدم ملا کر ہانپتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اروپ بابو کو یہ منظر بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ تبھی ان کی بائیں جانب سے ایک بچے کی آواز تیرتی ہوئی ان کے کانوں میں آتی ہے:

''منّا کا سپنا کیا آپ نے ہی لکھی ہے؟''

اروپ بابو نے گردن گھما کر دیکھا۔ سات آٹھ سال کا ایک لڑکا ہے، سفید شرٹ اور نیلی پینٹ پہنے۔ ہاتھ کی کہنی تک ریت لگی ہے۔ گردن اٹھا کر حیرت سے وہ اروپ بابو کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اروپ بابو کے جواب کا انتظار نہ کر کے لڑکے نے کہا،'' میں منّا کا سپنا پڑھ چکا ہوں۔ بابو جی نے سالگرہ پر دیا تھا مجھے... مجھے...''

''کہو کہو، اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟'' یہ ایک عورت کی آواز تھی۔

لڑکے کی تھوڑی ہمت بڑھی اور اس نے کہا،'' مجھے وہ کتاب بہت اچھی لگی تھی۔''

اروپ بابو نے اب عورت کی طرف دیکھا۔ تقریباً تیس سال عمر ہوگی، خوبصورت چہرہ۔ مسکراتی ہوئی ان کی طرف دیکھ رہی ہے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔

اروپ بابو نے لڑکے سے کہا،''نہیں منّا، میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ تم شاید غلط فہمی کا شکار ہو۔''

عورت لڑکے کی ماں ہے، اس میں کوئی شک نہیں؛ دونوں کے چہروں میں صاف مشابہت نظر آتی ہے— خاص طور پر ٹھوڑی کے گڈھوں میں۔

اروپ بابو کی بات سے عورت کی ہنسی کم نہیں ہوئی۔ وہ اور بھی آگے بڑھ آئی اور پہلے سے زیادہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیر کر بولی،'' سننے میں آیا ہے کہ آپ لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ میرے ایک دیور نے ایک جلسے میں آپ کو بطور مہمان خصوصی مدعو کرنے کے لیے ایک خط لکھا تھا۔ آپ نے جواب دیا تھا کہ آپ یہ سب قطعی پسند نہیں کرتے، مگر اس بار ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ آپ حالانکہ بچوں کے لیے لکھتے ہیں، لیکن ہم بھی آپ کی تخلیقات پڑھا کرتے ہیں۔''

منا کا سپنا کتاب کا مصنف چاہے جو بھی ہو، مگر ماں اور بیٹا اس کے ایک جیسے مداح ہیں، یہ بات سمجھتے انھیں دیر نہ لگی۔ اس قسم کے بے ڈھب حالات کا سامنا کرنا پڑے گا، اس کا انھوں نے

Scanned with CamScanner

تصور تک نہیں کیا تھا۔ انھیں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہیں، مگر بے رخی سے بتایا جائے تو انھیں تکلیف ہوگی، یہ سوچ کر اروپ بابو تذبذب میں پڑ گئے۔ اصل میں اروپ بابو بہت ہی نرم دل انسان ہیں۔ ایک بار ان کے دھوبی گنگا چرن نے ایک نئے کھادی کے کرتے میں استری کا داغ لگا کر کرتے کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ ان کی جگہ اور کوئی ہوتا تو اسے ضرور ہی دو چار تھپڑ جما دیتا، مگر اروپ بابو نے دھوبی کو شرمندہ اور پریشان حال دیکھ کر نرم لہجے میں صرف اتنا ہی کہا تھا: ''استری ذرا ہوشیاری سے کیا کرو۔''

اپنی اس نرم دلی کی وجہ سے ہی انھوں نے کچھ اور نہ کہہ کر اتنا ہی کہا، ''میں منّا کا سپنا کا مصنف ہوں، آپ اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کیسے کہہ رہی ہیں؟''

خاتون نے حیرت میں آ کر کہا، ''واہ، اس دن ٹیگا نتر میں تصویر چھپی تھی۔ ریڈیو سے اعلان نشر کیا گیا کہ آپ کو بنگلہ زبان میں بچوں کے بہترین ادب کے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ جی ہاں، میرے خیال میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کی بات تھی۔ ہم ہی نہیں، اب بے شمار لوگ املیش مولِک کے چہرے سے واقف ہو گئے ہیں۔''

املیش مولِک — اروپ بابو نام سے واقف ہیں، مگر چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ دونوں کے چہرے میں کیا اتنی مشابہت ہے؟ اتنا ضرور ہے کہ آج کل کے اخبارات میں چھپے چہرے کا صاف صاف پتا نہیں چلتا ہے۔

''آپ پوری آ رہے ہیں، یہ بات چاروں طرف پھیل گئی ہے،'' خاتون نے کہا۔ ''ہم اس روز سی ویو ہوٹل گئے ہوئے تھے۔ میرے شوہر کے ایک دوست کل تک وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کو ہوٹل کے منیجر نے بتایا تھا کہ آپ جمعرات کو آ رہے ہیں۔ آج ہی تو جمعرات ہے۔ آپ سی ویو میں ٹھہرے ہوئے ہیں نا؟''

''ایں؟ او... نہیں۔ میں، وہ... سنا تھا کہ وہاں لذیذ کھانا نہیں ملتا ہے۔''

''آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ ہم یہی سوچ رہے تھے کہ اتنے بہترین ہوٹل ہونے کے باوجود آپ وہاں کیوں ٹھہرنے جا رہے ہیں۔ آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟''

'میں... ساگرِکا میں۔''

Scanned with CamScanner

''اوہ! وہ تو نیا ہوٹل ہے۔ کس طرح کا ہے؟''

''ٹھیک ہی کہیے، کچھ دنوں تک ٹھہرنا ہے۔''

''کتنے دنوں تک ٹھہریں گے؟''

''تقریباً پانچ روز۔''

''پھر کسی روز ہمارے یہاں تشریف لائیے گا۔ ہم پوری ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ آپ کو دیکھنے کے لیے کتنے ہی لوگ انتظار کر رہے ہیں۔ بچوں کا تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ یہ کیا، آپ کے پیر بھیگ گیے؟''

لہر جو آگے بڑھ آئی ہے، اروپ بابو کا اس طرف دھیان ہی نہیں ہے۔ پیر ہی بھیگے ہیں، یہ کہنا غلط ہوگا؛ تیز ہوا ہونے کے باوجود اروپ بابو کا پورا بدن پسینے سے بھیگنے لگا ہے۔ حقیقت بیان کرنے کا موقع کب اور کیسے ٹل گیا، یہ ان کی سمجھ میں آیا ہی نہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ وہاں سے کھسک جائیں۔ مصیبت کہاں تک آگے بڑھ آئی ہے، تنہائی میں بیٹھ کر سوچنے پر ہی یہ بات سمجھ میں آئے گی۔

''میں اب... چلتا ہوں...''

''ضرور ہی کچھ نئی چیز لکھ رہے ہیں۔''

''نہیں، ابھی... کہنے کا مطلب ہے کہ آرام کروں گا۔''

''پھر ملیں گے۔ اپنے شوہر سے کہوں گی۔ کل تیسرے پہر ادھر آ رہے ہیں نا؟''

سی ویو کے منیجر دویک رائے نے ابھی اپنے گال کے اندر ایک پان ٹھونسا ہی تھا کہ اروپ بابو ان کے سامنے حاضر ہو گیے۔

''یہاں املیش مولک آنے والے ہیں؟''

''ہاں۔''

''اب تک نہیں آئے ہیں؟''

''اوں ہوں۔''

''کب... آئیں گے... یہ...؟''

Scanned with CamScanner

''منگلوار۔ٹیلیگرام آیا ہے۔کیوں؟''

منگلوار... آج ہے جمعرات ... اروپ بابو منگل تک ہی ٹھہریں گے۔ٹیلیگرام آنے کا مطلب ہے کہ مولک بابو نے کسی وجہ سے آنے کی تاریخ آگے بڑھا دی ہے۔

منیجر سے پوچھنے پر اروپ بابو کو پتا چلا کہ ان کا اندازہ صحیح ہے۔املیش مولک آج ہی آنے والے تھے۔

وِدیک بابو کے ''کیوں؟'' کے جواب میں اروپ بابو نے انھیں بتایا کہ انھیں املیش بابو سے ایک ضروری کام ہے۔وہ منگل کی دوپہر میں آکر پتا لگائیں گے۔

اروپ بابو سی ویو ہوٹل سے سیدھے بازار کی طرف چلے گئے۔ایک دکان سے املیش بابو کی لکھی چار کتابیں خریدیں۔مدنا کا سپنا وہاں نہیں ملا۔خیر،کوئی حرج نہیں،چار ہی کافی ہیں۔دو ناول ہیں،دو چھوٹی کہانیوں کے مجموعے۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے ساڑھے چھ بج گئے۔سامنے کے دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک کمرہ ہے،اس کے بائیں طرف منیجر کے بیٹھنے کی جگہ ہے،داہنے ہاتھ دس پانچ فٹ جگہ میں ایک بنچ اور دو کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔کرسیوں پر دو آدمی بیٹھے ہوے ہیں۔بنچ پر دو لڑکے اور ایک لڑکی،جن کی عمر دس بارہ کے بیچ ہوگی۔اروپ بابو پر نگاہ پڑتے ہی دونوں آدمیوں نے مسکراتے ہوے ہاتھ جوڑ کر انھیں نمسکار کیا اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔اس کے بعد بچوں کی طرف گردن ہلائی۔بچے شرماتے ہوے اروپ بابو کی طرف بڑھ آئے اور پیر چھو کر پرنام کیا۔اروپ بابو منع کرنے جا رہے تھے،مگر کر نہیں سکے۔

دونوں حضرات بھی آگے بڑھ گئے۔ان میں سے ایک نے کہا،''ہم پوری ہوٹل سے آرہے ہیں۔میرا نام سہردسین ہے اور آپ ہیں مسٹر گانگلی۔مسز گھوش نے بتایا کہ آج آپ سے ان کی ملاقات ہوئی ہے اور آپ یہیں ٹھہرے ہیں۔اس لیے سوچا کہ...''

شکر ہے کتابیں بانس کے کاغذ میں بندھی ہیں ورنہ اپنی ہی کتابیں خود خرید کر لا رہے ہیں،یہ دیکھ کر وہ کیا سوچتے!

اروپ بابو نے ان کی ہر بات پر گردن ہلا کر ہامی بھری۔یہ نہیں کہ اب بھی معاملہ صاف نہیں

Scanned with CamScanner

کیا جاسکتا ہے۔ ایسی کون سی بات ہے؟ اتنا کہنا ہی کافی ہے: دیکھیے صاحب، ایک بہت بڑی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ میں نے خود املیش مولک کی تصویر نہیں دیکھی ہے۔ مگر ہاں، یہ بات مان لیتا ہوں کہ ان کا چہرہ مجھ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ ہوسکتا ہے، ان کی بھی مونچھیں پتلی ہیں، ان کے بال بھی گھنگھرالے ہیں، ان کی آنکھوں پر بھی میرا جیسا ہی چشمہ ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ پوری آنے والے ہیں۔ لیکن صاحب، میں وہ آدمی نہیں ہوں۔ میں بال ساہتیہ کا مصنف نہیں ہوں۔ میں ادب کا آدمی ہوں ہی نہیں۔ کچھ لکھتا بھی نہیں ہوں۔ انشورنس آفس میں نوکری کرتا ہوں۔ تنہائی میں چھٹیاں گزارنے آیا ہوں۔ آپ لوگ مہربانی کر کے میری جان چھوڑ دیں۔ اصلی املیش مولک منگل کو ہوٹل سی ویو میں آرہے ہیں۔

مگر اتنا کہنے سے ہی کیا اس جھنجھٹ سے چھٹکارا مل جائے گا؟ ایک بار جب ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہی املیش مولک ہیں، اور پہلی بار انکار کرنے پر بھی جب کوئی کام نہ بنا تو پھر کیا سی ویو کے منیجر کا ٹیلیگرام دکھایا جائے تبھی ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہوگی؟ یہ لوگ تو مان لیں گے کہ یہ بھی مولک جی کا ایک کرشمہ ہے۔ دراصل وہ فرضی نام سے ساگرِکا میں ٹھہرے ہوے ہیں اور آنے سے پہلے سی ویو میں اپنے نام سے ایک جھوٹا ٹیلیگرام بھیج دیا ہے تا کہ انھیں لوگوں کے مجمعے سے نجات مل سکے۔ مگر شاید سب سے بڑی رکاوٹ ان تین بچوں نے ڈال دی ہے۔ وہ تینوں حیرت و عقیدت بھری نگاہوں سے اروپ بابو کو گھور رہے ہیں۔ اصل بات کہتے ہی ان تینوں بچوں کی امید، خوشی اور جوش پر ایک ہی پل میں پانی پھر جائے گا۔

"بابُن، تم جس چیز کی معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے، املیش بابو سے پوچھ لو۔" دونوں لڑکوں میں جو بڑا ہے، اسے مخاطب کرتے ہوے سہردیبن نے کہا۔

اروپ بابو گھبراہٹ محسوس کرنے لگے۔ اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ بابن اپنی گردن ٹیڑھی کر، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر سوال کرنے کے لیے تیار ہے۔

"اچھا، منا کی آنکھوں میں جس بوڑھے نے نیند لادی تھی، وہ کیا جادو جانتا تھا؟"

کشمکش کی اس گھڑی میں اروپ بابو کو اچانک پتا چلا کہ ان کا دماغ غضب کا کام کررہا ہے۔ سامنے جھک کر بابن کے کان کے پاس اپنا منھ لے جا کر بولے، "تمھیں کیا لگتا ہے؟"

Scanned with CamScanner

تینوں بچے اروپ بابو کی اس بات پر بے حد خوش ہوے۔ جاتے وقت سہرد بابو اروپ بابو کو دعوت دے گئے کہ انھیں آج رات پوری ہوٹل میں آکر کھانا کھانا ہے۔ وہاں آٹھ بنگالی خاندان آکر ٹھہرے ہوے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ چھوٹے بچے ہیں جو املیش بابو کے بھگت ہیں۔ اروپ بابو نے کوئی اعتراض نہیں کیا، کیونکہ اس بیچ انھوں نے مان لیا ہے کہ کچھ وقت کے لیے انھیں املیش مولک کی اداکاری کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے، اس موضوع پر سوچنے کا ابھی وقت نہیں ہے۔ بس، ایک ہی بات انھوں نے سہرد بابو سے کہی۔

"دیکھیے صاحب، میں شورغل پسند نہیں کرتا ہوں۔ لوگوں سے ملنے جلنے کا بھی میں عادی نہیں ہوں، اس لیے آپ لوگوں سے اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ میں یہاں ٹھہرا ہوں، یہ بات مہربانی کر کے کہیں پھیلائیں نہیں۔"

سہرد بابو نے وعدہ کیا کہ کل کی دعوت کے بعد وہ لوگ پھر کبھی انھیں تنگ نہیں کریں گے اور وہ اس کے لیے بھی ہر ممکن کوشش کریں گے کہ اور لوگ بھی انھیں پریشان نہ کریں۔

رات میں کچھ دیر پہلے ہی کھانا کھا کر اروپ بابو بستر پر لیٹ گئے اور املیش مولک کی حابو کے کارنامے کتاب پڑھنے لگے۔ اس کے علاوہ اور جو تین کتابیں ہیں، وہ ہیں نٹل کا ایڈونچر، کشتی مات اور پھولوں کی ڈلیا۔ آخری دو کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ ادبی آدمی نہ ہونے پر بھی اروپ بابو نے نوکری پیشہ زندگی کے پہلے، خاص طور سے اسکول کی زندگی کے آخری تین سالوں کے درمیان، بچوں کی بہت سی دیسی بدیسی کہانیاں پڑھی ہیں۔ اتنے دنوں کے بعد، اناليس سال کی عمر میں، نئے سرے سے بچوں کی کہانیاں پڑھنے پر انھیں حیرت اس بات کی ہے کہ بچپن میں پڑھی ہوئی کتنی ہی کہانیاں انھیں اب بھی یاد ہیں اور ان کہانیوں سے املیش مولک کی کہانیاں بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔

بڑے بڑے حروف میں چھپی سوسوا سو اوراق کی چاروں کتابوں کو پڑھنے کے بعد، جب کمرے کی بتی بجھا کر لیٹ گئے تو اس وقت ساگر کا ہوٹل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سمندر کی آواز آرہی ہے؟ کتنی رات گزر چکی ہے؟ اروپ بابو نے تکیے کی بغل سے گھڑی اٹھالی۔ یہ گھڑی ان کے والد کی تھی۔ پرانے زمانے کا ریڈیم کا ڈائل ہے۔ سمندر کے پھین کی طرح ہی اندھیرے میں چمکتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ پون بج چکا ہے۔

ساہتیہ اکادمی سے بال ساہتیہ میں انعام حاصل کرنے والے مصنف املیش کی زبان سہل ہے، اسلوب منجھا ہوا۔ شروع کرنے پر بغیر انجام تک پڑھے رہا نہیں جاتا۔ پھر بھی مولک جی کی تخلیقات میں نئے پن کا فقدان ہے۔ کتنے ہی طرح کے آدمی، کتنی ہی طرح کے واقعات اور کتنے ہی طرح کے تجربات کی بات ہم ہمیشہ سنتے رہتے ہیں۔ ہم لوگوں کی ذاتی زندگی میں بھی طرح طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ اگر تھوڑے بہت تصورات شامل کر لیے جائیں تو کہانی بن جائے۔ پھر دوسروں کی تخلیقات سے مواد لینے کی ضرورت کیوں پیش آئے؟

اروپ بابو کے دل میں املیش مولک کے تئیں جو عزت تھی، اس میں تھوڑی بہت کمی آ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا دل بھی ہلکا ہو گیا۔ کل سے وہ اور بھی آزادی سے مولک جی کی اداکاری کر سکیں گے۔

پوری ہوٹل کی پارٹی میں املیش مولک کے مداحوں کی عقیدت دگنی ہو گئی۔ اروپ بابو اس بیچ ایک دوسری دکان سے منا کا سپنا کتاب خرید کر پڑھ چکے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہ ننھے منے بھگتوں کے تین سو تینتیس قسم کے سوالات کا جواب اپنے ڈھنگ سے دینے میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ پارٹی ختم ہونے کے پہلے سے ہی بچوں نے انھیں 'شہد چٹا' بابو کہہ کر پکارنا شروع کر دیا، کیونکہ اروپ بابو نے انھیں سکھایا کہ 'مو' کا مطلب ہے شہد اور 'لِک' انگریزی لفظ ہے، جس کے معنی ہے چاٹنا۔ یہ سن کر داس گپت بابو نے اپنی رائے ظاہر کی، ''شہد کی برسات تو آپ کر رہے ہیں اور اسے یہ بچے چاٹ رہے ہیں!'' اس پر ان کی بیوی سرنگنا دیوی نے کہا، ''وہی کیوں، ہم بھی چاٹ رہے ہیں!''

کھانا پینا ختم ہونے کے بعد دو باتیں ہوئیں۔ ایک تو بچوں نے ضد کی کہ انھیں کم سے کم ایک کہانی سنائی جائے۔ اس پر اروپ بابو نے کہا کہ وہ زبانی کہانی سنانے میں ماہر نہیں ہیں مگر ہاں، انھوں نے اپنے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ بچپن میں اروپ بابو بانچھا رام اکرودت لین میں رہتے تھے۔ جب وہ پانچ سال کے تھے تو ان کے گھر سے ایک دن ایک قیمتی کلائی گھڑی چوری ہو گئی۔ چور پکڑنے کے لیے اروپ بابو کے والد گھر پر ایک سُوپ جھاڑنے والے کو لے آئے۔ اس سوپ جھاڑنے والے نے ایک قینچی کو چمٹے کی طرح استعمال میں لا کر اس کے سہارے ایک سوپ کو خلا میں ٹکا

دیا اور مٹھیوں میں چاول بھر کر اس سوپ پر ڈالنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ منتر بھی پڑھنے لگا۔

اس طرح اس نے گھر کے نئے نوکر نٹور کو چور کی شکل میں پکڑ وا دیا۔ اروپ بابو کے منجھلے چاچا نٹور کے بال پکڑ کر جب اسے مکا مارنے جا رہے تھے تو عین اسی وقت دستی گھڑی ایک بستر کی چادر کے نیچے سے باہر نکل آئی۔

تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ کہانی ختم کر کے جب وہ جانے کے لیے اٹھنے لگے تو چار پانچ بچے چلا اٹھے، ''ٹھہریے، ٹھہریے، جایئے گا نہیں!'' اس کے بعد وہ دوڑتے ہوئے اپنے اپنے کمروں میں گئے اور وہاں سے املیش مولک کی لکھی ہوئی سات نئی کتابیں لے آئے اور ان کے سامنے رکھ کر بولے، ''اپنا نام لکھ دیجیے۔''

اروپ بابو نے جواب دیا، ''میں کتابوں پر اپنے دستخط نہیں کرتا ہوں۔ کبھی نہیں۔ میں انھیں لے جا رہا ہوں، ہر کتاب پر ایک ایک تصویر بنا دوں گا۔ تم لوگ پرسوں تیسرے پہر ساڑھے چار بجے میرے ہوٹل میں آ کر کتابیں واپس لے جانا۔''

جن کی کتابیں تھیں انھوں نے تالیاں بجائیں — دستخط کے بجائے تصویر کہیں بہتر رہے گی۔

اروپ بابو کو اسکول میں پڑھتے وقت دو بار اچھی ڈرائنگ کا انعام ملا تھا۔ اس کے بعد سے حالانکہ تصویریں بنائی نہیں ہیں مگر ایک دن اگر ذرا مشق کر لیں تو کیا کسی چیز کی تصویر نہیں بنائی جا سکتی؟

دوسرے دن، ہفتے کی صبح، اروپ بابو اپنا ڈاٹ پین اور کتابیں لے کر باہر نکل گئے۔ مچھیروں کی بستی کی طرف جانے پر انھوں نے دیکھا، وہاں تصویریں بنانے کے لیے مناسب مواد ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہی وہ اپنے کام سے فارغ ہو گئے۔ ایک کتاب میں انھوں نے کیکڑے کی تصویر بنائی، دوسری میں تین سیپیوں کو ریت پر آس پاس پڑے دکھایا، تیسری میں دو کوّوں کی تصویر بنائی، چوتھی میں مچھلی پکڑنے کی ناؤ، پانچویں میں مچھیرے کا مکان، چھٹی میں مچھیرے کے بچے کی تصویر اور آخری کتاب کی تصویر میں چنگی دار ٹوپی پہنے ہوئے مچھیرے کو مچھلی پکڑنے کا جال بنتے ہوئے دکھایا۔

اتوار کو تیسرے پہر ٹھیک ساڑھے چار بجے جھنی، پٹو، چھکی، شانتو، بابن، پرسین اور نویتہ ہوٹل میں آئے اور اپنی اپنی کتابیں لے کر کلکاریاں مارتے ہوئے واپس چلے گئے۔

Scanned with CamScanner

اس دن بستر پر لیٹنے کے بعد اروپ بابو کی سمجھ میں اچانک یہ بات آئی کہ ان کے دل میں مسرت کے جذبے کے ساتھ ایک قسم کی فکر بھی پیدا ہوگئی ہے۔

''میں املیش مولک ہوں،'' یہ بات حالانکہ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے اپنے منھ سے نہیں کہی ہے، پھر بھی ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ پچھلے تین دنوں سے جو کام کرتے چلے آرہے ہیں، وہ دھوکے بازی کے سوا دوسرا کچھ نہیں ہے۔ پرسوں، منگل کی صبح، اصلی املیش مولک آنے والے ہیں۔ اروپ بابو کو ان تین چار دنوں کے درمیان ان بچوں اور ان کے ماں باپ، موسی، بوا سے جو عزت و احترام ملا ہے، اس کے حقدار تو وہ ہیں جو منگل کے روز تشریف لا رہے ہیں۔ وہ جب خود موجود ہوں گے اور سی ویو ہوٹل کے منیجر وویک رائے جب اس خبر کی فخر کے ساتھ تشہیر کریں گے، اس وقت کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا! اس بات کو سوچتے ہی اروپ بابو کے ہوش اڑ گئے۔

تو کیا ایک دن پہلے ہی چلے جانا ان کے لیے عقلمندی ہوگی؟ نہیں تو پھر منگل کی صبح سے رات تک وہ کیا کریں گے؟ اپنے آپ کو کیسے چھپائیں گے؟ اور اگر ایسا نہیں کریں گے تو یہ لوگ انھیں کیسے چھوڑ دیں گے؟ مکار، دھوکے باز کہہ کر ان کی چمڑی نہیں ادھیڑ دیں گے؟ مولک جی کو یہ بات معلوم ہوجائے گی تو وہ کیا بغیر پٹائی کیے چھوڑ دیں گے؟ کوئی کوئی ادیب کیا سانڈ جیسا طاقتور نہیں ہوتا؟ اور پولیس؟ پولیس کا بھی ڈر ہے۔

اس قسم کی دھوکے بازی کرنے سے جیل کی سزا دی جاتی ہے یا نہیں، یہ بات اروپ بابو کو معلوم نہیں ہے۔ اگر دی جاتی ہو تو اروپ بابو کو کوئی حیرانی نہیں ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک بہت بڑا گناہ کر بیٹھے ہیں۔ فکر کی وجہ سے نیند نہیں آئے گی، یہ سوچ کر اروپ بابو نے نیند کی ایک گولی کھالی۔

آخر کار اروپ بابو نے منگل کی رات کی ٹرین سے جانا ہی طے کیا۔ دراصل املیش مولک کو ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کی خواہش کو وہ کس طرح روک نہ سکے۔ پیر کی صبح اپنے ہوٹل میں ہی تلاش کرنے پر ٹیگانتر کا وہ پرچہ انھیں مل گیا جس میں املیش مولک کی تصویر چھپی تھی۔ پتلی مونچھیں، گھنگھرالے بال، موٹے فریم کا چشمہ — یہ ساری چیزیں ہیں، لیکن مشابہت کی مقدار کو ٹھیک سے سمجھنے کے لیے اصل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا، کیونکہ تصویر صاف نہیں چھپی ہے۔ جہاں تک سمجھ میں آرہا ہے، اس سے انھیں پہچاننے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اروپ بابو اسٹیشن جائیں گے، انھیں

نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی کرلیں گے، جیسے ''آپ مسٹر مولک ہیں نا؟ آپ کی تصویر اس دن رسالے میں دیکھی تھی۔ آپ کی کہانیاں میں نے پڑھی ہیں۔ بہت ہی اچھی لگتی ہیں،'' وغیرہ۔ اس کے بعد اپنا سامان اسٹیشن پر رکھ کر اروپ بابو شہر چھوڑ کر نکل جائیں گے۔ کونارک اب تک دیکھ نہیں سکے ہیں۔ مندر دیکھ کر شام کو لوٹیں گے اور سیدھے اسٹیشن جا کر ٹرین میں بیٹھ جائیں گے۔ خود کو چھپانے کا اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ نہیں ہے۔

منگل کے دن پوری ایکسپریس بیس منٹ دیر سے پہنچی۔ مسافر نیچے اتر رہے ہیں۔ اروپ بابو ایک کھمبے کی آڑ میں کھڑے ہو کر فرسٹ کلاس کے ارد گرد کی دونوں بوگیوں کو بغور دیکھ رہے ہیں۔ ایک دروازے سے ہاف پینٹ پہنے دو بدیسی اترے، اس کے بعد ایک گیم شحیم مارواڑی۔ دوسرے دروازے سے ایک بوڑھی عورت اتری، جس کا ہاتھ ایک سفید پینٹ پہنے نوجوان تھامے ہوئے تھا۔ نوجوان کے بعد ایک بوڑھا، اس کے بعد... ہاں، کسی طرح کی کوئی غلطی نہیں ہو رہی ہے، یہی املیش بابو ہیں۔ اروپ بابو سے چہرہ کافی ملتا جلتا ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اگر برابر کھڑے ہو جائیں تو جڑواں بھائی سمجھ لیے جانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مولک کی اونچائی اروپ بابو سے کم از کم دو انچ کم ہے اور جسم کا رنگ دگنا کالا ہے۔ عمر بھی شاید زیادہ ہے، کیونکہ بال بہت پک گئے ہیں— اروپ بابو کے بال اتنے پکے نہیں ہیں۔

سوٹ کیس ہاتھ میں سنبھال کر اترتے ہی انھوں نے قلی کو پکارا۔ اروپ بابو بھی قلی کے ساتھ ان کی طرف بڑھ گئے۔

''آپ ہی مسٹر مولک ہیں نا؟''

انھوں نے تھوڑا حیران ہو کر اروپ بابو کی طرف دیکھا اور ذرا سا سر ہلا کر کہا، ''ہاں۔''

قلی اپنے سر پر سوٹ کیس رکھ چکا ہے۔ اس کے علاوہ املیش بابو کے ساتھ جو سامان ہے وہ ہے کندھے پر لٹکا ہوا ایک بیگ اور تھرماس۔ تینوں لوگ گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ اروپ بابو نے کہا، ''میں آپ کی کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ اخبار میں آپ کو ایوارڈ ملنے کی بات پڑھ چکا ہوں اور تصویر بھی دیکھی ہے۔''

''اوہ!''

''آپ سی ویو میں ٹھہریں گے؟''

املیش مولک نے اور زیادہ حیران ہو کر اس بار اروپ بابو کو ذرا مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ اروپ بابو نے مولک جی کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا، ''سی ویو کا منیجر آپ کا مداح ہے۔ اسی نے یہ خبر پھیلائی ہے۔''

''اوہ۔''

''آپ آرہے ہیں، یہ سن کر بہت سے بچے بے چین ہیں۔''

''ہوں۔''

یہ آدمی اتنا کم کیوں بولتا ہے؟ اس کی چہل قدمی کی رفتار بھی جیسے کم ہوتی جارہی ہے۔ یہ آدمی کیا سوچ رہا ہے؟

املیش مولک اس بار ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور اروپ بابو کی طرف مڑتے ہوئے بولے، ''کافی لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے؟''

''سنا تو یہی ہے۔ کیوں؟ اس سے کیا آپ کو کوئی پریشانی ہوگی؟''

''نہیں، مطلب ہے کہ میں ذرا اکیلے رہنا پ... پ... پ...''

''پسند کرتے ہیں؟''

''ہاں۔''

ہکلاتے ہیں۔ اروپ بابو کو یاد آیا، ایڈورڈ ہشتم نے جب اچانک تخت و تاج ٹھکرا دیا تھا تو ان کا بھائی فکر مند ہو گیا تھا، کیونکہ وہ تتلاتا تھا۔ لیکن بادشاہ اسی کو بننا تھا، اور بادشاہ بننے کے بعد تقریر کرنا بھی ضروری تھا۔

قلی سامان لے کر گیٹ کے سامنے کھڑا ہے، یہ دیکھ کر دونوں پھر سے چہل قدمی کرنے لگے۔

''اسی کو کہتے ہیں شہرت کی ستم ظریفی۔''

-اروپ بابو نے اس بات کا تصور کرنے کی کوشش کی کہ اس ہکلانے والے ادیب سے گفتگو کرنے کے بعد جھنی، پنٹو، چمکی، شانتنو، بابن اور نومیتہ کے چہروں کی کیا حالت ہوگی۔ تصور میں انھوں نے جو کچھ دیکھا وہ انھیں ذرا بھی اچھا نہ لگا۔

Scanned with CamScanner

''ایک کام کریں گے؟'' گیٹ کے باہر آ کر اروپ بابو نے پوچھا۔

''کیا؟''

''آپ کی چھٹی مداحوں کے چکر میں برباد ہو جائے، یہ سوچنے میں ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔''

''مجھے بھی نہیں۔''

''میرا مشورہ ہے کہ آپ سی ویو مت جائیں۔''

''ت... تب؟''

''سی ویو میں کھانا بھی اچھا نہیں ملتا ہے۔ میں ساگرِ کا میں ٹھہرا تھا۔ اب میرا کمرہ خالی ہے۔ آپ وہیں تشریف لے جائیں۔''

''اوہ!''

''اور آپ اپنا نام استعمال نہ کریں۔ بہتر تو یہی ہو گا کہ آپ اپنی مونچھیں صاف کرا لیں۔''

''موں... مونچھ؟''

''ابھی فوراً ویٹنگ روم میں چلے جایئے۔ دس منٹ کی بات ہے۔ ایسا کرنے سے کوئی آپ کی چھٹی برباد نہیں کر سکے گا۔ بلکہ میں کل کلکتہ پہنچ کر آپ کے نام سے سی ویو میں تار بھیج دوں گا کہ آپ نہیں آ رہے ہیں۔''

املیش مولک کی پیشانی سے فکر کی لکیروں کو مٹنے میں تقریباً بیس سیکنڈ لگے۔ اس کے بعد ان کے لبوں اور آنکھوں کے دونوں طرف نئی لکیریں ابھر آئیں۔ مولک جی ہنس رہے ہیں۔

''آپ کا کیا کہہ کر ش... ش... ش...''

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس آپ ان کتابوں پر اپنے دستخط کر دیجیے۔ اس نیم کے درخت کے پیچھے چلے آیئے۔ کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔''

پیڑ کی اوٹ میں جا کر املیش مولک اپنے مداح کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نرم ہنسی ہنسے اور انھوں نے جیب سے ایک لال پارکر قلم باہر نکالا۔ جس دن سے ایوارڈ ملا ہے، ڈھیر سارا کاغذ اور روشنائی خرید کر انھوں نے اپنا ایک بہت خوبصورت دستخط تیار کر لیا ہے۔ پانچوں کتابوں پر انھوں نے دستخط کر دیے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی زبان حالانکہ ہکلاتی ہے، مگر قلم نہیں ہکلائے گا۔

Scanned with CamScanner

بارین بھومِک کی بیماری

کنڈکٹر کی ہدایت کے مطابق 'ڈی' ڈبے میں داخل ہو کر بارین بھومک نے اپنا بڑا سوٹ کیس سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ اسے راستے میں کھولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کنگھی، برش، ٹوتھ برش، داڑھی بنانے کا سامان، ریل میں پڑھنے کے لیے ہیڈلی چیز کا ناول — سب کچھ دستی بیگ میں ہے۔ اس کے علاوہ تھروٹ پلز بھی ہیں۔ ٹھنڈے ڈبے میں سردی گھسنے کی وجہ سے کہیں گلا بیٹھ جائے تو کل گانا نہیں گا سکیں گے۔ جھٹ سے ایک ٹکیہ منھ میں ڈال کر بارین بھومک نے بیگ کو کھڑکی کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

دلی جانے والی ٹرین کے چلنے میں اب صرف سات منٹ کی دیر ہے، لیکن ان کے ڈبے میں کوئی اور مسافر کیوں نہیں ہے؟ اتنی دور کا سفر کیا انھیں اکیلے ہی طے کرنا ہوگا؟ یہ تو ایک طرح سے عیاشی کی انتہا ہے۔ حالات کا تصور کر کے بارین بھومک کے گلے سے خود بخود ایک گانے کے بول پھوٹ پڑے۔

''او باغ کی بلبل، پھولوں کی ڈالی پر نہیں تم جھولو!'' بارین بھومک نے کھڑکی سے ہاوڑا اسٹیشن پلیٹ فارم پر کی بھیڑ کی طرف ایک نظر ڈالی۔ دو نوجوان ان کی طرف تاکتے ہوئے آپس میں کچھ گفتگو کر رہے ہیں۔ بارین بھومک کو ان لوگوں نے پہچان لیا ہے۔ بہت سے آدمی انھیں پہچانتے ہیں۔ کلکتہ ہی نہیں بلکہ بہت سے قصبوں کے لوگ نہ صرف ان کی آواز کو پہچانتے ہیں بلکہ ان کے چہرے سے واقف ہیں۔ ہر مہینے چھ سات پروگراموں میں ان کو مدعو کیا جاتا ہے۔ بارین بھومک نذرل کے نغمے اور جدید موسیقی کا پروگرام پیش کریں گے۔ شہرت اور دولت دونوں چیزیں اب بارین بھومک کی مٹھی میں ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ایسے حالات پچھلے پانچ سال سے ہی ہیں۔ اس سے پہلے انھیں کئی برس تک بے حد جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ نغمے کے لیے نہیں؛ وہ گانا گانے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر صرف گانے سے کام نہیں چلتا، اس کے ساتھ چاہیے قسمت اور بیننگ۔ 1968 میں انیس پلی کے پوجا کے پنڈال پر

Scanned with CamScanner

بھولا دا— بھولا بانڈو جیہ —ان سے اگرز بردستی 'بیٹھ وزن' میں گانا نہ گواتے...

اسی گانے کے بدولت بارین بھومک دلی جارہے ہیں۔ دلی کی بنگالی ایسوسی ایشن اول درجے کا کرایہ دے کر اپنی جوبلی کے موقعے پر نذرل کے گیت گانے کے لیے انھیں لے جارہی ہے۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام بھی ان کی طرف سے کیا جائے گا۔ دو دن دلی میں گزار کر آگرہ، فتح پور سیکری سے ہوتے ہوئے ٹھیک سات روز کے بعد بارین بھومک کلکتہ واپس چلے آئیں گے۔ اس کے بعد پوجا آجائے گی اور تب انھیں فرصت ہی نہیں ملے گی۔ ہر پہر موسیقی کی محفل میں حاضری دینا ہوگی، سامعین کے کانوں میں رس برسانے کے لیے۔

''آپ کے لنچ کا آرڈر، سر...'' کنڈکٹر گارڈ آکر کھڑا ہے۔

''کیا کیا ملتا ہے؟'' بارین نے پوچھا۔

''آپ نان وجیٹیرین ہیں نا؟ دیسی کھانا کھایئے گا یا ویسٹرن اسٹائل؟''

''دیسی چاہیے تو...''

اپنی پسند کے کھانے کا آرڈر دے کر بارین نے ابھی ایک تھری کیسلز سگریٹ سلگائی ہی تھی کہ اسی وقت ڈبے کے اندر ایک اور مسافر داخل ہوا اور اس کے بعد ہی گاڑی روانہ ہوگئی۔

آنے والے مسافر سے آنکھیں ملتے ہی بارین کو وہ آدمی پہچانا سا لگا اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی، مگر اجنبی کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہ پا کر وہ مسکراہٹ ایک ہی پل میں معدوم ہوگئی۔ کیا پھر بارین سے غلطی ہوگئی؟ چھی چھی... اس طرح مسکرانے کی کیا ضرورت تھی؟ کتنے عجیب حالات سے گزرنا پڑا! یاد آیا، ایک بار گھڑ دوڑ کے میدان میں بھورے رنگ کا کرتا پہنے ایک عمر دراز آدمی کو پیچھے کی طرف سے ''کیا حال ہیں تر ودا!'' کہہ کر اس کی پشت پر ایک دھول جمانے کے بعد بارین کی سمجھ میں آیا تھا کہ دراصل وہ تر ودا نہیں ہیں۔ یہ شرمناک یاد بہت دنوں تک ان کے دل کو کریدتی رہی تھی۔ آدمی کو اس طرح کے مشکل حالات میں ڈالنے کے لیے چاروں طرف کتنی پریشانیاں بکھری پڑی ہیں۔

بارین بھومک نے دوبارہ اجنبی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ موصوف چپلیں اتار کر سیٹ پر پاؤں پھیلائے السٹریٹڈ ویکلی کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ کتنی حیرت کی بات ہے! انھیں پھر محسوس

Scanned with CamScanner

ہو رہا ہے کہ یہ شخص جانا پہچانا ہے۔ یہ جان پہچان سرسری نہیں بلکہ کافی لمبی ملاقات ہے۔ مگر کب کی جان پہچان ہے؟ کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ گھنی بھنویں، پتلی مونچھیں، پامیٹر سے رنگے ہوئے بال، گال کے بیچوں بیچ ایک داغ — اس چہرے سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ ہاں، واقف ہی نہیں، وہ جب سینٹرل ٹیلیگراف میں نوکری کرتے تھے تب سے جانتے ہیں۔ کیا یہ یک طرفہ شناسائی تھی؟ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بارین بھومک ان کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔

''آپ اپنے کھانے کا آرڈر...''

کنڈکٹر گارڈ دوبارہ آیا ہے۔ بہت ہی خوش مزاج اور صحتمند شخص ہے یہ۔

''سنیے،'' اجنبی نے کہا، 'کھانا تو بعد کی چیز ہے، پہلے ایک پیالی چائے مل سکتی ہے؟''

''یقیناً۔''

''بس ایک کپ سے ہی کام چل جائے گا۔ میں را ٹی لیتا ہوں۔''

بارین بھومک کو محسوس ہوا ان کے پیڑو سے ناف اور آنتیں باہر نکل آئی ہیں اور وہ جگہ بالکل خالی ہوگئی ہے۔ اس کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ ان کے کلیجے میں ہاتھ پیر اُگ آئے ہیں اور وہ ہاتھ پیر سانس کی نلی کے پنجرے میں اچھل کود کر رہے ہیں۔ نہ صرف اس گلے کی آواز بلکہ خاص زور ڈال کر کہے گئے لفظ ''را ٹی'' (Raw Tea) نے ہی ان کے اندر ہلچل پیدا کر دی۔

بارین نے اس شخص کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ ان کے ساتھ بالکل اسی طرح دلی جاتی ہوئی ٹرین کے فرسٹ کلاس کے اے سی ڈبے میں آمنے سامنے بیٹھ کر قریب قریب آٹھ گھنٹے کا سفر کیا ہے۔ وہ خود پٹنہ جا رہے تھے، اپنی ممیری بہن شپرا کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے۔ اس کے تین دن قبل گھڑ دوڑ کے میدان میں ٹریول ٹوٹ میں ایک ہی ساتھ ساڑھے سات ہزار روپے جیت کر وہ زندگی میں پہلی بار ریل کے اول درجے میں سفر کرنے کی خواہش کو روک نہیں پائے تھے۔ اس وقت ایک گلوکار کی حیثیت سے وہ اتنے مشہور نہیں تھے۔ یہ واقعہ 1964 ہے، نو سال پہلے کی بات۔ اس آدمی کے خاندانی نام کی بھی دھندلی سی یاد آ رہی ہے... چ سے اس لفظ کی شروعات ہوتی تھی... چودھری؟ چکرورتی؟ چٹرجی؟

کنڈکٹر گارڈ کھانے کا آرڈر لے کر چلا گیا۔ بارین کو لگا، اس آدمی کے سامنے بیٹھنے میں وہ

Scanned with CamScanner

گھٹن محسوس کر رہے ہیں۔ باہر کاریڈور میں جا کر کھڑے ہو گئے، دروازے کے سامنے سے پانچ ہاتھ داہنی طرف، 'چ' کی نظروں سے دور۔ اتفاق کے معنی کیا ہیں؟ یہ بات بارین بھومک کو معلوم نہیں۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ ہر آدمی کو زندگی میں اس قسم کے واقعات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ مگر 'چ' نے کیا انھیں پہچان لیا ہے؟ نہ پہچاننے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں: ایک، ہو سکتا ہے 'چ' کی یادداشت کمزور ہو؛ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے ان نو برسوں کے درمیان بارین کے چہرے میں کافی تبدیلی آ گئی ہو۔ کھڑکی سے باہر کے چلتے ہوئے مناظر کی طرف دیکھتے ہوئے بارین نے سوچنے کی کوشش کی، ان کے نو برس پہلے کے چہرے اور ان کے آج کے چہرے میں کتنا فرق ہے۔

ان کا وزن کافی بڑھ گیا ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ ان کا چہرہ بھی پہلے سے زیادہ بھر گیا ہے۔ اور کیا ہو سکتا ہے؟ چشمہ نہیں تھا، مگر اب ہے۔ مونچھیں؟ کب انھوں نے مونچھیں منڈوا دی تھیں؟ ہاں، یاد آیا، زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ہاجرا روڈ کا وہ سیلون... ایک نیا نوجوان حجام دونوں طرف کی مونچھوں کو یکساں نہیں تراش سکا تھا۔ بارین نے خود اتنا محسوس نہیں کیا، لیکن دفتر کے اس گھٹی لفٹ میں شکد یو سے لے کر باسٹھ سال کے بوڑھے خزانچی کیشو بابو نے بھی جب ان کی مونچھوں پر تبصرہ کیا تو بارین کو لاچار ہو کر اپنی پیاری مونچھیں تراشنا پڑیں۔ اس کے بعد سے انھوں نے مونچھیں رکھی ہی نہیں۔

مونچھیں ہٹ گئی ہیں، گال بھر گئے ہیں، آنکھوں پر عینک لگ گئی ہے۔ بارین بہت کچھ مطمئن ہو کر ڈبے کے اندر چلے آئے۔

بیرا ایک ٹرے میں چائے کی پیالی اور چائے لا کر 'چ' کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ بارین بھی کسی مشروب کی طلب محسوس کر رہے تھے، چاہے ٹھنڈا ہو یا گرم۔ لیکن کہتے کہتے رک گئے۔

اگر گلے کی آواز پہچان لے؟

اور پہچاننے کے بعد نتیجہ کیا ہو سکتا ہے، بارین اس کا تصور تک نہیں کرنا چاہتے۔ اتنا ضرور ہے کہ سب کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ 'چ' کس قسم کا آدمی ہے۔ اگر وہ اٹمیش دا کی طرح ہوا تو پھر بارین اطمینان کی سانس لے پائیں گے۔ ایک بار بس میں ایک آدمی اٹمیش دا کی جیب ٹٹول رہا تھا۔ اس بات کا علم ہونے پر بھی شرم کے مارے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ بعد میں گھر آ کر کہنے لگے، "پبلک بس میں اتنے لوگوں کے درمیان ایک سین ہو جائے اور اس میں خاص پارٹ میرا ہی ہو — ایسا کیسے ہونے

دوں؟"

یہ آدمی کیا اسی قسم کا ہے؟ ایسا ہونا بہت مشکل ہے، کیونکہ اُنمیش دا جیسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ چہرے سے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آدمی اس قسم کا نہیں ہے۔ یہ گھنی بھنویں، نکیلی ناک، سامنے کی طرف نکلا ہوا ٹھنا۔ سب کچھ ملانے کے بعد لگتا ہے یہ شخص اگر بارین کو پہچان لے گا تو اپنے روئیں دار ہاتھ سے شرٹ کا کالر کس کر پکڑتے ہوئے کہے گا، "تم ہی وہ آدمی ہونا جس نے سنہ 64 میں میری گھڑی چرائی تھی؟ اسکاؤنڈرل! نو برس سے میں تمھاری تلاش میں ہوں۔ آج میں تمھیں..."

اس کے بعد بارین بھومک سوچ نہیں سکے۔ اس ٹھنڈے ڈبے میں بھی ان کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ ریلوے کے ریکسین منڈھے تکیے پر سر رکھ کر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے اور بائیں ہاتھ سے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔ آنکھوں کو دیکھ کر ہی انسان کو بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے۔

بارین نے بھی آنکھوں کو دیکھ کر ہی شروع میں اسے پہچانا تھا۔

ہر واقعہ انھیں تفصیل سے یاد آنے لگا ہے — نہ صرف 'چ' کی گھڑی کی چوری کی کہانی، بلکہ بچپن سے ہی وہ جن لوگوں کی جو جو چیز چراتے رہے ہیں، وہ تمام منظر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک معمولی ڈاٹ پین بھی ہوسکتا ہے (منکل ماما کا) یا پھر چھینی دا کے ہڈیوں کے کف لنکس، جن کی نہ تو بارین کو ضرورت تھی اور نہ وہ کسی روز انھیں اپنے استعمال میں لائے تھے۔ چوری کی وجہ یہ تھی کہ وہ چیزیں ہاتھوں کے قریب تھیں اور پرائے لوگوں کی تھیں۔ بارہ برس کی عمر سے لے کر پچیس سال تک کم از کم پچاس پرائی چیزیں بارین بھومک کسی طرح ہتھیا کر اپنے گھر لے آئے۔ اسے چوری کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے؟ محض فرق اتنا ہی ہے کہ چور کسی مجبوری یا حالات کے تحت چوری کرتا ہے اور انھوں نے عادتاً چوری کی ہے۔ لوگوں نے کبھی ان پر شک نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ کبھی پکڑ میں نہیں آئے۔ بارین جانتے ہیں کہ اس طرح چوری کرنا ایک قسم کی بیماری ہے۔ ایک بار انھوں نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے باتوں باتوں میں اس بیماری کا نام بھی جان لیا تھا، لیکن اب یاد نہیں آرہا ہے۔

بس اتنا ضرور ہے کہ نو سال قبل 'چ' کی گھڑی چرانے کے بعد سے آج تک ایک بھی بار ایسا

کام نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ چوری کرنے کی وقتی مگر قوی خواہش بھی ان کے اندر ابھی تک نہیں جاگی ہے۔ بارین کو معلوم ہے کہ اس خطرناک بیماری سے چھٹکارا مل چکا ہے۔

ان کی دوسری چوریوں اور اس گھڑی کی چوری میں بس یہی فرق تھا کہ انھیں حقیقت میں اس کی ضرورت تھی۔ وہ دستی گھڑی نہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ کی بنی ایک بہت ہی خوبصورت سفری گھڑی ہے۔ ایک نیلا چوکور بکسا ہے، اس کا ڈھکن کھولتے ہی گھڑی باہر نکل کر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ الارم گھڑی ہے اور اس الارم گھڑی کی آواز اتنی شیریں ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے ساتھ ساتھ کانوں میں میٹھا سنگیت گونجنے لگتا ہے۔ ان نو برسوں کے درمیان بارین بھومک ہمیشہ اسے استعمال میں لائے ہیں۔ وہ جہاں کہیں گئے ہیں، ان کے ساتھ وہ گھڑی رہی ہے۔

آج بھی گھڑی ان کے ساتھ ہے۔ کھڑکی کے سامنے میز پر رکھے اس بیگ کے اندر۔

"کہاں جایئے گا؟"

بارین یوں چونک پڑے جیسے ان کے بدن سے بجلی کا تار چھو گیا ہو۔ یہ آدمی ان سے مخاطب ہے، سوال پوچھ رہا ہے!

"دلّی۔"

"جی؟"

"دلّی۔"

پہلی مرتبہ بے حد احتیاط برتنے کی غرض سے بارین نے بہت ہلکی آواز میں جواب دیا تھا۔

"آپ کا گلا کیا سردی کی وجہ سے بیٹھ گیا ہے؟"

"نہیں۔"

"اکثر ایسا ہوتا ہے۔ دراصل ایرکنڈیشننگ کا صرف ایک ہی فائدہ ہے اور یہ کہ دھول سے نجات ملتی ہے، ورنہ میں فرسٹ کلاس میں ہی سفر کرتا ہوں۔"

بارین چپ ہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو وہ 'چ' کی طرف دیکھتے بھی نہیں، لیکن 'چ' ان کی طرف دیکھ رہا ہے یا نہیں، یہ بات جاننے کی خواہش میں بار بار ان کی نظر اس کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ لیکن 'چ' مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہا ہے۔ اداکاری کر رہا ہے کیا؟ یہ بات بارین کو معلوم نہیں۔ یہ معلوم

Scanned with CamScanner

کرنے کے لیے اس آدمی کو اور زیادہ جاننا ضروری ہے۔ بارین جو کچھ جانتے ہیں، وہ معلومات پچھلی دفعہ کی ہے۔ ایک یہ کہ دودھ چینی کے بغیر چائے اور پان کی عادت۔ دوسری یہ کہ اسٹیشن آتے ہی نیچے اتر کر کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز لے آنے کی عادت۔ نمکین چیزیں، میٹھی نہیں۔ یاد ہے، پچھلی مرتبہ 'ج' کی بدولت بارین بھومک کو کئی قسم کی چٹپٹی چیزیں کھانے کا موقع ملا تھا۔

اس کے علاوہ پٹنہ اسٹیشن کے نزدیک پہنچنے پر اس کے کردار کا ایک اور پہلو سامنے آیا تھا۔ اس واقعے کے ساتھ ہی اس کی گھڑی کا معاملہ بھی منسلک ہے، لہٰذا وہ قصہ بارین کو بخوبی یاد ہے۔ اس بار امرتسر میل گاڑی تھی۔ گاڑی صبح پانچ بجے پٹنہ پہنچتی تھی۔ کنڈکٹر نے آکر ساڑھے چار بجے بارین کو جگا دیا تھا۔ 'ج' بھی غنودگی کی حالت میں تھا، حالانکہ وہ دلی جا رہا تھا۔ گاڑی اسٹیشن پہنچنے کے تین منٹ پہلے اچانک رک گئی۔ کیا بات ہے؟

پٹریوں پر لیمپ اور ٹارچ کی بھاگ دوڑ دیکھ کر محسوس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ آخر میں گارڈ نے آکر خبر سنائی کہ ایک بوڑھا لائن پار کرتے وقت انجن سے کٹ گیا ہے۔ اس کی لاش ہٹنے کے بعد گاڑی روانہ ہوگی۔ یہ سنتے ہی 'ج' بے حد بے چین ہو کر سلیپنگ سوٹ پہنے ہی اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اندھیرے میں چلا گیا۔

اسی موقعے کا فائدہ اٹھا کر بارین نے اس کے بکسے سے گھڑی نکال لی۔ اسی رات انھوں نے 'ج' کو گھڑی میں چابی بھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ گھڑی دیکھ کر لالچ نہ ہوا ہو، ایسی بات نہیں ہے، لیکن یہ سوچ کر کہ موقع نہیں ملے گا، انھوں نے گھڑی کی بات دل سے نکال دی تھی۔ اس وقت اچانک موقع مل جانے سے ان کا لالچ اتنا بڑھ گیا کہ سیٹ پر ایک دوسرے مسافر کے سوئے ہونے کے باوجود انھیں خطرہ مول لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ چند لمحوں کے وقفے میں انھوں نے اس کام کو انجام دے دیا۔ 'ج' لگ بھگ پانچ منٹ کے بعد واپس آیا۔

''بہت دکھ کی بات ہے! گداگر تھا۔ دھڑ ایک طرف ہے تو سر دوسری طرف۔ سامنے کاؤ کیچر رہنے پر بھی انسان کیسے کٹ جاتا ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا کام یہی ہے کہ اگر لائن پر کوئی چیز پڑی ہو تو اسے ہٹا کر باہر پھینک دے!...''

''آپ دلّی کے باشندے ہیں یا کلکتہ کے؟''

Scanned with CamScanner

بارین کو یاد آیا، پچھلی مرتبہ بھی اس نے طرح طرح کے سوال کیے تھے۔ زبردستی کسی سے جان پہچان کرنے کی اس قسم کی عادت کو بارین پسند نہیں کرتے۔

''کلکتہ کا،'' بارین نے جواب دیا۔ انجانے میں ہی اس بار ان کی اصل آواز باہر نکل آئی۔ بارین نے خود کو کوسا۔ آئندہ انھیں اور زیادہ ہوشیار رہنا پڑے گا۔

لیکن یہ کیا! وہ بارین کو ایک ٹک دیکھے جا رہا ہے! ایک دم اس طرح کا تجسس ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ بارین نے محسوس کیا کہ ان کی نبض پھر تیز ہو گئی ہے۔

''آپ کی حال میں اخبار میں کوئی تصویر چھپی ہے؟''

بارین نے سوچا، اس معاملے میں سچائی چھپانا عقلمندی کا کام نہیں ہے۔ ریل میں دوسرے بنگالی مسافر بھی موجود ہیں، وہ بھی انھیں پہچان سکتے ہیں۔ اسے اپنی صحیح پہچان بتانے میں نقصان ہی کیا ہے؟ بلکہ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے کہ بارین ایک مشہور ہستی ہیں تو انھیں تو نو برس پہلے کے گھڑی چور کی شکل میں دیکھنا 'چ' کے لیے ناممکن ہو جائے گا۔

''آپ نے تصویر کہاں دیکھی تھی؟'' بارین نے پوچھا۔

''آپ گانا گاتے ہیں؟'' اس نے دوبارہ سوال کیا۔

''ہاں، تھوڑا بہت . . .''

''آپ کا اسم گرامی؟''

''بارِیندر ناتھ بھومک۔''

''اوہ، یہ کہیے نا، بارین بھومک۔ اسی لیے آپ جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ آپ تو میں ریڈیو پر بھی گاتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''میری بیوی آپ کی فین ہے۔ گانے کے سلسلے میں ہی کیا دلّی جا رہے ہیں؟''

''ہاں۔''

بارین نے سوچا کہ وہ زیادہ تفصیلی گفتگو سے پرہیز کریں گے۔ صرف ہاں یا نہیں میں ہی مختصر بات کریں گے۔

Scanned with CamScanner

''دلّی میں ایک اور بھومک ہیں، فنانس منسٹری میں — اسکاٹش کالج میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ پورا نام ہے نتیش بھومک۔ آپ سے کوئی رشتے داری وغیرہ ہے؟''

رشتے داری ہے۔ بارین کے چچیرے بھائی ہیں۔ سخت نوابی مزاج کے آدمی ہیں، اس لیے بارین کے سگے ہونے پر بھی ایک گوتر کے نہیں ہیں۔

''جی نہیں، میں انھیں نہیں پہچانتا۔''

یہاں جھوٹ بولنا ہی بارین نے غنیمت سمجھا۔ اب یہ آدمی باتیں کرنا بند کردے تو اچھا ہے۔ آخر اتنی جرح کیوں کر رہا ہے؟

خیر، کھانا آگیا ہے۔ امید ہے کچھ دیر تک سوالات کے تیر نہیں برس سکیں گے۔

ہوا بھی یہی۔ 'چ' کھانے کا شوقین ہے۔ ایک بار کھانا شروع ہو جاتا ہے تو گفتگو کا سلسلہ خود بخود ختم جاتا ہے۔ بارین بھومک کا خوف حالانکہ کافی حد تک دور ہو گیا ہے، لیکن پھر بھی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ اب بھی بیس گھنٹے کا راستہ باقی ہے۔ انسان کی یادداشت بھی بڑی غضب کی شے ہے۔ کب دھکا دے کر کس زمانے کی یادوں کو جگا دے کہنا دشوار ہے۔ جیسے اسی بات کو لیجیے۔ بارین کا خیال ہے کہ اگر وہ اُس خاص لفظ کو نہ سنتے تو نو سال پہلے کے گھڑی مالک کی باتیں ان کے ذہن میں ہرگز نہ آتیں۔ اسی طرح بارین کی کوئی بھی حرکت ان کی پرانی واقفیت کو 'چ' کے سامنے لاکر کھڑا کردے تو؟ ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بارین نے طے کیا کہ اب وہ نہ تو گفتگو کریں گے اور نہ ہی کوئی کام۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے چہرے کے سامنے ہیڈلی چیز کی کتاب کھول کر اور تکیے کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔ پہلا ورق ختم کر کے انھوں نے ہوشیاری سے گردن گھمائی اور دیکھا کہ 'چ' سو گیا ہے۔ کم از کم دیکھنے سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ رسالہ ہاتھ سے فرش پر گر پڑا ہے۔ آنکھیں ہاتھ سے ڈھکی ہوئی ہیں، مگر سینے کا پھولنا پچکنا دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ سوئے ہوئے آدمی کی فطری اور آزاد سانسیں ہیں۔

بارین نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ میدان، پیڑ پودوں اور مکانوں کا ملا جلا بہار کا روکھا سوکھا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ کھڑکی کے دوہرے شیشے کو پار کر کے ریل کی آواز نہیں کے برابر سنائی دے رہی ہے، جیسے دور بہت سے مردنگ ایک ساتھ ایک ہی بول میں بج رہے ہوں — دھادھاناک...

ناون ناک . . . دھاون ناک . . . ناون ناک . . . دھاون ناک . . . ناون ناک . . .

اس آواز میں اب ایک اور آواز شامل ہوگئی ہے: 'چ' کے خراٹوں کی آواز۔

بارین بھومک کو بہت اطمینان کا احساس ہوا۔ نذرل کے ایک چنے ہوئے گیت کی سطر گنگنا کر دیکھا۔ صبح کی مانند اتنا شیریں نہ ہونے پر بھی انھیں برا نہ لگا۔ اب گلے کی آواز کو تیز نہ کرتے ہوئے، ایک بار گلے کو کھنکھار کر انھوں نے دوبارہ اس گانے کو گانا شروع کیا۔

ایک چونکانے والی آواز نے ان کے گلے کو خشک کر دیا اور ان کا گیت گانا ختم گیا۔ وہ گھڑی کے الارم کی آواز تھی۔

ان کے بیگ میں رکھی ہوئی سوئس گھڑی کا الارم نہ جانے کیسے بج اٹھا، اور اب بھی بج رہا ہے۔ بارین بھومک کے ہاتھ پیر جیسے ان کے پیٹ کے اندر سما گئے۔ ان کا بدن لکڑی ہو گیا۔ آنکھیں سوئے ہوئے 'چ' پر جا کر ٹک گئیں۔

'چ' جیسے ہل اٹھا ہو۔ بارین مصیبت کے اندیشے سے کانپ اٹھے۔ 'چ' کی نیند ٹوٹ چکی ہے۔ آنکھوں پر سے اس کے ہاتھ ہٹ گئے۔

''گلاس ہے کیا؟ اسے اتار کر رکھ دیجیے۔ وائبریٹ کر رہا ہے۔''

بارین بھومک نے دیوار میں لگے اسٹینڈ کے اندر سے گلاس کو جیسے ہی اٹھایا، آواز ختم گئی۔ اسے میز پر رکھنے سے پیشتر انھوں نے اس کے اندر کے پانی کو پی کر اپنے گلے کو تر کر لیا اور اس سے انھیں تھوڑا آرام ملا۔ پھر بھی گانا گانے میں ابھی وقت لگے گا۔

ہزاری روڈ کے کچھ آگے چائے آئی۔ ایک ایک کر کے دو پیالی گرم چائے پینے کے بعد اور 'چ' کی طرف سے کسی قسم کے جرح یا شک کے نشان نہ پا کر بارین کے گلے کا روندھا پن تھوڑا اور کم ہو گیا۔ باہر تیسرے پہر کی ڈھلتی دھوپ اور دور کے ٹیلے کی طرف دیکھنے کے بعد گاڑی کے چھند سے چھند ملاتے ہوئے جب انھوں نے ایک جدید گیت کا ٹکڑا گایا تو اس مصیبت کا بچا کھچا اندیشہ بھی ان کے دل سے دور ہو گیا۔

1

گیا میں 'چ' اپنی نو سال کی عادت کے مطابق پلیٹ فارم پر اتر کر سیلوفون میں مڑے ہوئے دو پیکٹ چنا چور لے آیا اور ایک پیکٹ بارین کی طرف بڑھا دیا۔ بارین نے اسے خوب مزے سے کھایا۔

Scanned with CamScanner

گاڑی کی روانگی کے وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ ڈبے کی بتیاں جلا کر 'چ' نے کہا:

''ہم کیا دیر سے چل رہے ہیں؟ آپ کی گھڑی کیا بجا رہی ہے؟''

اس وقت پہلی مرتبہ بارین کے ذہن میں یہ بات آئی کہ 'چ' کی کلائی میں گھڑی نہیں ہے۔ اس بات کو سوچ کر انھیں حیرانی ہوئی اور اس حیرانی کا ایک ٹکڑا شاید ان کی آنکھوں سے جھانکنے لگا۔ دوسرے ہی پل انھیں یاد آیا کہ 'چ' کے سوال کا جواب نہیں دیا گیا ہے۔ اپنی گھڑی کی طرف سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا، ''سات بج کر پینتیس منٹ۔''

''پھر تو ہم ٹھیک وقت پر ہی جا رہے ہیں۔''

''ہاں۔''

''میری گھڑی آج صبح ہی... ایچ ایم ٹی بالکل ٹھیک وقت بتاتی تھی!... نوکر نے بستر کو چادر کو یوں کھینچا کہ گھڑی ایک دم...''

بارین خاموش ہیں۔ گھڑی کا ذکر آ جانا ہی ان کے لیے اشبھ ہے۔

''آپ کی کون سی گھڑی ہے؟''

''ایچ ایم ٹی۔''

''اچھی سروس دیتی ہے؟''

''ہوں۔''

''دراصل میری گھڑی کی قسمت ہی خراب ہے...''

بارین نے ایک جماہی لے کر خود کو گھبراہٹ اور بے چینی سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کے اعضا کا سن پن ان کے جڑوں تک پہنچ چکا ہے۔ سننے کی طاقت ختم ہو جاتی تو انھیں بے حد خوشی ہوتی، لیکن ایسا ہونے والا نہیں ہے۔ 'چ' کی آواز بخوبی ان کے کانوں میں پہنچ رہی ہے...

''جانتے ہیں، ایک سونے کی سوئس گھڑی، ٹریولنگ کلاک، میرے ایک دوست نے جنیوا سے لا کر مجھے دی تھی۔ ایک مہینہ بھی استعمال نہیں کر سکا... ریل سے دلی جا رہا تھا، تقریباً آٹھ سال پہلے کی بات ہے... ہم اور آپ جس طرح سفر کر رہے ہیں، اسی طرح ایک ڈبے میں ہم دو آدمی — میں اور

ایک دوسرا شخص... بنگالی... سوچیے تو کتنی خوفناک بات!

''شاید میں باتھ روم گیا ہوں گا، یا اسٹیشن پر اترا ہوں گا یا پلیٹ فارم پر۔ بس، اسی بیچ گھڑی غائب کردی۔ حالانکہ دیکھنے میں ایسا نہیں لگتا تھا۔ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا، بھلا سا آدمی اور خوبرو چہرہ تھا۔ تقدیر اچھی تھی کہ اس نے قتل نہیں کیا۔ اس کے بعد سے میں ریل میں بیٹھا ہی نہیں۔ اس بار بھی ہوائی جہاز سے جاتا، لیکن پائلٹوں کی ہڑتال کے چلتے...''

بارین بھومک کا گلا خشک ہو رہا ہے۔ ہونٹوں کا ہر حصہ بے بس ہو گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لبوں کو کسی نے سی دیا ہے۔ لیکن وہ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ ان تمام باتوں کے باوجود خاموش رہنا غیر فطری لگے گا، یہاں تک کہ مشکوک بھی ہو سکتا ہے۔ جی جان سے کوشش کرنے پر، بے حد ہمت کر کے انھوں نے اپنی زبان سے چند الفاظ ادا کیے۔

''آپ نے تلاش نہیں کی تھی؟''

''تلاش کیا کی جائے؟ ڈھونڈنے سے کیا یہ چیزیں واپس ملتی ہیں؟ بس اتنا ضرور ہے کہ اس شخص کے چہرے کو میں نے بہت دنوں تک یاد رکھا تھا۔ اب بھی دھندلا سا یاد ہے — سانولا رنگ، مونچھیں، آپ کے برابر ہی قد ہوگا، اور ہاں، دبلا پتلا تھا۔ اگر دوبارہ اس سے ملاقات ہو جاتی تو اسے باپ کا نام یاد کرا دیتا۔ جانتے ہیں، کسی زمانے میں میں باکسنگ کیا کرتا تھا۔ لائٹ ہیوی ویٹ چیمپئن تھا۔ اس شخص کے چودہ اجداد کی قسمت اچھی ہے کہ دوبارہ اس پر نظر نہیں پڑی۔''

اس کا نام بھی بارین کو یاد آ گیا — چکرورتی، پلک چکرورتی۔ حیرت ہے! باکسنگ کے بارے میں گفتگو کرتے ہی اس کا نام سنیما کے ٹائٹل کی طرح بارین بھومک کی آنکھوں کے سامنے تیر گیا۔ پچھلی مرتبہ بھی باکسنگ کے بارے میں پلک چکرورتی نے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔

مگر نام جاننے سے بھی کیا ہوگا؟ اس نے تو کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ مجرم تو خود بارین ہیں۔ اور اس جرم کا بوجھ انھیں بے حد مضطرب اور بے چین کر رہا ہے۔ اگر اقبال جرم کر لیں تو کیسا رہے؟ گھڑی واپس کر دیں تو کیسا رہے؟ ہاتھ کے پاس کے بیگ کو کھولتے ہی...

دھت!.. وہ پاگل ہو گئے ہیں کیا؟ وہ اتنے فکر مند کیوں ہو رہے ہیں؟ اپنی پہچان چور کی شکل میں کرائیں گے؟ وہ ایک مشہور گلوکار ہیں، بغیر کہے کیوں وہ پرائی چیز لینے کی بات تسلیم کریں گے؟ اس

Scanned with CamScanner

وجہ سے جب ان کا نام خاک میں مل جائے تو تب کیا گانا گانے کے لیے ان کو مدعو کیا جائے گا؟ ان کے مداحوں کے دل کیا کہیں گے؟ کیا سوچیں گے وہ؟

پلک چکرورتی بار بار ان کی طرف گھور رہا ہے۔ اب دلی پہنچنے میں سولہ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ کسی بھی منحوس گھڑی میں پہچان لیے جانے کا خطرہ ہے۔ ارے، یہ تو وہی آدمی ہے۔ بارین نے تصور کیا، ان کی مونچھیں کھسک کر گر پڑی ہیں، گال سے گوشت جھڑ گیا ہے، آنکھوں سے چشمہ اتر گیا ہے۔ پلک چکرورتی بغور ان کے نو سال پہلے کے چہرے کو گھور رہا ہے۔ اس کی نظر آہستہ آہستہ مرکوز ہوتی جا رہی ہے، لبوں پر ایک بے درد ہنسی ابھر آئی ہے۔ ہاں ہاں، پیارے! اب راستے پر آؤ۔ اتنے دنوں کے بعد تم پکڑ میں آئے ہو۔ مزہ تو لوٹا ہے مگر نتیجہ نہیں دیکھا ہے۔

دس بجے بارین بھومک کو کپکپی کے ساتھ بخار آ گیا۔ گارڈ کو بلا کر انھوں نے ایک اور کمبل طلب کیا۔ اس کے بعد دونوں کمبلوں کو ایک ساتھ ملا کر پاؤں سے ناک تک ڈھک کر لیٹ گئے۔ پلک چکرورتی نے ڈبے کا دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ بتی بجھاتے وقت بارین کی طرف مڑ کر کہنے لگا، ''لگتا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دوا لیجیے گا؟ میرے پاس بہترین ٹکیہ ہے، دو عدد کھا لیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو ایرکنڈیشننگ کی عادت نہیں ہے۔''

بھومک نے دوا کی ٹکیہ کھا لی۔ اب صرف یہی بھروسا ہے کہ اگر پلک چکرورتی گھڑی چور کی شکل میں انھیں پہچان بھی لے تو بیماری کی حالت میں ان پر ترس کھا کر سخت سزا نہیں دے گا۔ اس بیچ انھوں نے ایک بات طے کر لی ہے۔ پلک اگر انھیں نہ پہچانے تب بھی دلی پہنچنے سے قبل ہی موقع ملتے ہی وہ سوئس گھڑی کو اصلی مالک کے بکسے میں رکھ دیں گے۔ اگر ممکن ہوا تو آدھی رات میں ہی اس کام کو انجام دے دیں گے۔ لیکن اگر بخار کم نہیں ہوتا ہے تو کمبل کے نیچے سے نکلنا دشوار ہے۔ اب بھی بیچ بیچ میں پورا جسم کانپ اٹھتا ہے۔

پلک اپنے سر کے پاس ریڈنگ لیمپ جلائے ہوئے ہے۔ اس کے ہاتھ میں کھلی ہوئی ایک پیپر بیک کتاب ہے۔ لیکن کیا وہ واقعی مطالعہ کر رہا ہے یا کتاب کے اوراق آنکھ پر رکھے کچھ سوچ رہا ہے؟ کتاب کو ایک ہی طرح سے کیوں تھامے ہوئے ہے؟ ورق کیوں نہیں الٹ رہا ہے؟ آمنے سامنے کے دو صفحے پڑھنے میں کتنا وقت لگتا ہے!

Scanned with CamScanner

اب بارین نے غور کیا کہ پلک کی نظر کتاب کے صفحے سے ہٹتی جا رہی ہے۔ اس کا سر آہستہ آہستہ بغل کی طرف مڑ گیا۔ آنکھیں گھوم کر بارین کی طرف آ رہی ہیں۔ بارین آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے پڑے رہتے ہیں۔ اب بھی کیا پلک ان کی طرف گھور رہا ہے؟ خوب ہوشیاری سے بارین اپنی پلکوں تھوڑا سا کھولتے ہیں، اس کے بعد پھر بند کر لیتے ہیں۔ پُلک ان کو ہی گھور رہا ہے۔ بارین کو محسوس ہوا کہ ان کی چھاتی کے اندر وہی مینڈک پھر سے کودنے لگا ہے، پسلیوں کی ہڈیوں میں پھر سے دھکا لگ رہا ہے۔

دُھک ٹِک... دُھک ٹِک... دُھک ٹِک... دُھک ٹِک... دادرے کا چھند ہے۔ ریل گاڑی کے پہیوں کے گمبھیر چھند میں گم ہوتا جا رہا ہے۔

ایک بار آہستہ سے کھچ کی آواز ہوتے ہی آنکھیں بند ہونے پر بھی بارین کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ ڈبے کی آخری بتی بجھ چکی ہے۔ اب ہمت کر کے بارین آنکھیں کھول کر دیکھتے ہیں۔ دروازے کے پردے کی درار سے آتی ہوئی ہلکی روشنی نے ڈبے کے اندھیرے کو زیادہ گہرا نہیں ہونے دیا ہے۔ اسی روشنی میں وہ دیکھتے ہیں، پُلک چکرورتی نے اپنے ہاتھ کی کتاب کو بارین کے بیگ کے پاس رکھ دیا ہے، اس کے بعد کمبل کو گھٹنے تک اوڑھ کر کروٹ لی ہے اور پھر بارین کے آمنے سامنے ہو کر ایک جماہی لی ہے۔

بارین بھومک کو احساس ہوا کہ ان کی چھاتی کی دھڑکن آہستہ آہستہ بحال ہوتی جا رہی ہے۔ کل صبح... ہاں، کل صبح، پلک کے ٹریولنگ کلاک کو اپنے بیگ سے نکال کر پلک کے سوٹ کیس میں کپڑے لتوں کے نیچے رکھ دینا ہے۔ سوٹ کیس میں تالا نہیں لگا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی پلک نے سلیپنگ سوٹ نکال کر پہنا ہے۔ بارین کی کپکپی بند ہو گئی ہے۔ شاید دوا کام کر گئی ہے۔ اس نے انھیں کون سی دوا دی تھی؟ نام نہیں پوچھ سکے تھے۔ اپنی بیماری کے باعث کہیں دلی کے موسیقی کے شوقینوں کی واہ واہ سے محروم نہ ہو جائیں، اسی خوف سے انھوں نے بہت تیزی کے ساتھ پلک چکرورتی کی دی ہوئی دوا کھالی تھی۔ لیکن اب لگتا ہے... نہیں، ان فکروں کو اب وہ ٹکنے نہیں دیں گے۔ گلاس کی ٹن ٹن کی آواز کو گھڑی کا الارم سمجھ کر ان کی کیسی حالت ہو گئی تھی۔ ان تمام باتوں کے لیے ذمے دار ہے ان کا احساسِ جرم میں ملوث بیمار دل۔ کل صبح وہ اس احساس سے نجات کا انتظام کریں گے۔ دل اگر پرسکون

Scanned with CamScanner

نہ ہوا تو گلا نہیں کھلے گا، گیت باہر نہیں نکل پائے گا... بنگالی ایسوسی ایشن...

چائے کے سامان کی کھٹ پٹ سے بارین بھومک کی نیند کھل گئی۔ بیرا ٹرے لے آیا ہے۔ چائے، روٹی، مکھن، آملیٹ لایا ہے۔ لیکن یہ سب کیا وہ کھا سکتے ہیں؟ اب بھی بخار ہے کیا؟ شاید نہیں ہے۔ جسم ہلکا ہو گیا ہے۔ کمال کی دوا دی تھی پلک چکرورتی نے۔ اس کے تئیں بارین کے دل میں شکر گذاری کا احساس جاگ اٹھا۔

لیکن وہ کہاں چلا گیا؟ معلوم ہوتا ہے، باتھ روم میں ہے، یا پھر کاریڈور میں۔

بیرے کے چلے جانے کے بعد بارین باہر نکلے۔ کاریڈور خالی ہے۔ بھلا آدمی کب سے باتھ روم میں ہے؟ کیا چانس لیا جا سکتا ہے؟

بارین نے چانس لیا، لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بیگ سے گھڑی نکال کر پلک چکرورتی کے سوٹ کیس کو کھینچ کر نکالنے کے لیے جیسے ہی جھکے، عین اسی وقت تولیہ اور داڑھی بنانے کا سامان ہاتھ میں لیے پلک ڈبے کے اندر داخل ہوا۔ بارین بھومک داہنے ہاتھ کی مٹھی باندھے سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''کیسی طبیعت ہے؟ آل رائٹ؟''

''ہاں، وہ... اسے پہچان رہے ہیں؟''

بارین نے اپنی مٹھی کھول کر گھڑی سمیت اپنا ہاتھ پلک کے سامنے کر دیا۔ اب ان کے دل میں حیرت انگیز توانائی آ گئی ہے۔ چوری کی بیماری سے انھیں کافی پہلے نجات مل چکی ہے، لیکن یہ آنکھ مچولی بھی تو چوری ہی ہے۔ اس فطری حالت کو چھپانے کی عادت، اگر مگر کرنا، احساس جرم، یہ پیڑو کا خالی پن، گلے کی کھسکھساہٹ، کانوں کا گرم ہونا، چھاتی کا دھڑکنا— یہ سب بھی تو ایک قسم کی بیماری ہی ہے۔ اسے دور کیے بغیر نجات نہیں، سکون نہیں۔

پلک چکرورتی نے اپنے ہاتھ کے تولیے کے ایک حصے کو اپنے داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی کے سہارے ابھی کانوں پر رکھا ہی تھا کہ تبھی بارین کے ہاتھ میں گھڑی دیکھ کر اس کا ہاتھ کان پر ہی ٹکا رہ گیا۔ بارین نے کہا، ''وہ آدمی میں ہی ہوں۔ موٹا ہو گیا ہوں، مونچھیں صاف کر دی ہیں اور چشمہ لگ گیا ہے۔ میں پٹنہ جا رہا تھا اور آپ دلی۔ سنہ 64 کی بات ہے۔ وہاں جب ایک آدمی کٹ گیا تھا اور

آپ اسے دیکھنے گئے، اسی وقت میں نے گھڑی نکال لی تھی۔''
پلک کی نگاہ اب گھڑی سے ہٹ کر بارین کی آنکھوں پر جا کر ٹک گئی۔ بارین نے دیکھا اس کے ماتھے کے بیچ میں دو متوازی لکیریں ہیں۔ آنکھیں غیر فطری طور پر باہر نکلی ہوئی ہیں۔ دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے الگ ہو کر کچھ بولنا چاہتے ہیں، لیکن کہہ نہیں پا رہے ہیں۔
بارین کہنے لگے:
''جانتے ہیں، دراصل یہ میری بیماری ہے۔ یعنی میں حقیقت میں چور نہیں ہوں۔ ڈاکٹر اس کا کچھ نام بتاتے ہیں، لیکن اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ بہر حال میں اب میں قطعی طور پر نارمل ہوں۔ اتنے دنوں تک گھڑی میرے پاس تھی، میں نے اسے استعمال بھی کیا ہے، آج بھی وہ میرے ساتھ ہے۔ آپ سے ملاقات ہوگئی، تقریباً معجزے کی طرح، اس لیے آپ کو واپس کر رہا ہوں۔ امید ہے، آپ کے دل میں کوئی میل نہیں رہے گا۔''
پلک چکرورتی ایک دبے دبے ''تھینکس'' کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی گمشدہ گھڑی اسے واپس مل گئی ہے، حیران سے اسے ہاتھ میں لے کر کھڑا ہے۔ بارین نے اپنے بیگ سے دانت کا منجن، دانت صاف کرنے کا برش اور داڑھی بنانے کا سامان باہر نکال کر تولیے کو ریک سے نیچے اتارا اور ڈبے کے دروازے کے باہر آ گئے۔ باتھ روم کے اندر جا کر دروازے کو بند کر لیا۔ نذرل کے ''کتنی راتیں یونہی بیت جاتی ہیں'' گیت کی ایک سطر گانے کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ ان کے گلے میں طاقت لوٹ آئی ہے۔

فنانس منسٹری کے این سی بھومک کو ٹیلیفون پر پانے میں لگ بھگ تین منٹ کا وقت لگا۔ آخر میں ایک مانوس اور سنجیدہ آواز سنائی دی، ''ہیلو!''
''کون، نتیش دا؟ میں بھوندو بول رہا ہوں۔''
'تو پہنچ گیا ہے؟ آج تیری گلے بازی سننے آؤں گا۔ آخر کار تو ناگ ہی نکلا۔ تصور نہیں کیا جا سکتا! خیر، کیا حال چال ہے؟ اچانک نتیش دا کو کیوں یاد کیا؟''
''وہ... پلک چکرورتی نام کے کسی آدمی سے آپ کی واقفیت تھی؟ آپ کے ساتھ اسکاٹش

کالج میں پڑھتا تھا۔ باکسنگ کرتا تھا؟''

''تو جھاڑو دار کے بارے میں بات کر رہا ہے؟''

''جھاڑو دار؟''

''وہ سارا سامان جھاڑ پونچھ لیتا تھا— کسی کا قلم، لائبریری سے کتاب، کامن روم سے ٹینس کا بیٹ۔ میرا پہلا رن سن وہی اڑا کر لے گیا تھا۔ حالانکہ اسے کوئی کمی نہیں ہے، بہت امیر آدمی ہے۔ یہ ایک قسم کی بیماری ہے۔''

''بیماری؟''

''معلوم نہیں ہے؟ کلپٹو مینیا۔۔۔ کے ایل ای پی۔۔۔''

ٹیلیفون رکھ کر بارین بھومک نے کھلے سوٹ کیس کو دیکھا۔ ہوٹل آ کر سوٹ کیس کھولتے ہی انھیں چند چیزیں ندارد ملیں۔ ایک کارٹن تھری کیسلز سگریٹ، ایک عدد جاپانی بائناکلر، ایک ایک سو کے پانچ نوٹ سمیت منی بیگ۔

کلپٹو مینیا— بارین کو یہ نام معلوم تھا، لیکن بھول گئے تھے۔ اب نہیں بھولیں گے۔

Scanned with CamScanner

کھگم

ہم پیٹرومیکس کی روشنی میں بیٹھ کر رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ شاید ابھی انڈے کو دانتوں سے کاٹا ہی ہوگا کہ چوکیدار چھمن سنگھ نے آ کر پوچھا، ''آپ لوگ املی بابا کے دیدار نہیں کریں گے؟''

لاچار ہو کر اس سے کہنا پڑا کہ املی بابا کا نام ہی ہمارے لیے بالکل نیا ہے، اس لیے دیدار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چھمن نے کہا کہ جنگل کے محکمے کی جو جیپ ہم لوگوں کے لیے فراہم کی گئی ہے اس کے ڈرائیور کو کہنے سے وہ ہمیں بابا کے ڈیرے پر لے جائے گا۔ جنگل کے اندر ہی ان کی کٹیا ہے۔ وہاں کا ماحول بڑا ہی سندر ہے۔ اور وہ ایک پہنچے ہوئے سادھو ہیں۔ ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ ان کے دیدار کرنے کے لیے آتے ہیں، وغیرہ۔ جس بات کو سن کر سب سے زیادہ حیرت ہوئی وہ یہ کہ بابا کے پاس ایک پالتو ناگ ہے اور وہ بابا کی کٹیا کے قریب ایک گڈھے میں رہتا ہے۔ ہر روز وہ شام کے وقت گڈھے سے نکل کر بابا کے پاس آتا ہے اور بکری کا دودھ پیتا ہے۔

سب کچھ سننے کے بعد دُھر جٹی بابو نے اپنا خیال ظاہر کیا، ''اس ملک میں دن بدن بازیگری کا بول بالا ہو رہا ہے، خاص طور پر بہروپیے سادھو سنیاسیوں کی تعداد بے حساب بڑھتی جا رہی ہے۔ مغربی ممالک میں سائنس جتنی ترقی کر رہی ہے، ہمارا ملک اتنا ہی اندھیرے کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ ہوپ لیس معاملہ ہے صاحب! سوچتے ہی دماغ گرما جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر دھر جٹی بابو نے کانٹا چمچہ نیچے رکھ دیا اور بغل سے فلائی فلیپ یعنی مکھی مارنے والی چھڑی اٹھا کر اسے میز پر پٹکا اور ایک مچھر کا خون کر ڈالا۔ بابو کی عمر پینتالیس سے پچاس سال ہوگی۔ ناٹا قد، دبلا، گورا، چمکتا ہوا چہرہ، پیلی پیلی آنکھیں۔ بھرت پور آنے پر ہی ان سے جان پہچان ہوئی ہے۔ میں آگرہ سے آیا ہوں اور مجھے منجھلے بھیا کے پاس جے پور جانا ہے۔ وہاں میں دو ہفتے کی چھٹیاں گزارنے جا رہا ہوں۔

Scanned with CamScanner

یہاں آنے پر جب ڈاک بنگلے یا ٹورسٹ لاج میں جگہ نہ ملی تو آخر کافی خرچ کرنے کے بعد شہر کے باہر فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں جگہ ملی۔ اس میں پچھتاوے کی کوئی بات نہیں ہے، کیونکہ جنگل سے گھرے ریسٹ ہاؤس میں رہنے سے ایڈونچر کا احساس ہوتا ہے۔

ڈھر جٹی بابو مجھ سے ایک روز پہلے آئے ہیں۔ وہ کیوں آئے ہیں، یہ بات ابھی تک کھل کر نہیں بتائی ہے، حالانکہ سیر سپاٹے کے علاوہ کوئی دوسری وجہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک ہی جیپ سے سیر سپاٹا کرتے ہیں۔ کل ہم یہاں سے بائیس میل دور، دیگ نام کی ایک جگہ کے قلعے اور محلات دیکھنے گئے تھے۔ آج صبح بھرت پور کا قلعہ بھی دیکھ لیا ہے۔ تیسرے پہر کیولا داس کی جھیل کے پرندوں کا ٹھکانا دیکھنے گئے تھے۔ وہ ایک بہت ہی دلچسپ جگہ ہے۔ جھیل سات میل سے زیادہ ہی لمبی ہوگی۔ بیچ بیچ میں ٹاپو کی طرح اونچی زمین ہے اور انھیں زمین کے ٹکڑوں پر گویا تمام دنیا کے پرندے آکر جمع ہوگئے ہیں۔ ان میں سے آدھے سے زیادہ پرندوں پر کبھی میری نظر نہیں پڑی تھی۔ میں حیران ہوکر پرندوں کو دیکھ رہا تھا اور ڈھر جٹی بابو ہر پل کچھ بڑبڑاتے جاتے تھے اور اپنے ہاتھوں کو نچاتے ہوئے آس پاس کے بھنگوں کو بھگانے کی کوشش کررہے تھے۔ بھنگا ایک قسم کا چھوٹا کیڑا ہوتا ہے۔ یہ جھنڈ بنا کر آتے ہیں اور سر کے چاروں طرف چکر کاٹ کر ناک منھ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انھیں نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے۔ مگر ڈھر جٹی بابو بار بار اُوب رہے تھے۔ اس طرح ہمت ہارنے سے کام کیسے چلے گا؟

ساڑھے آٹھ بجے کھانا کھا کر ہم سامنے کے برآمدے میں بیٹھے چاندنی رات کی خوبصورتی دیکھ رہے تھے۔ میں نے ڈھر جٹی بابو سے کہا، ''وہ جن سادھو بابا کے بارے میں کہہ رہا تھا، انھیں دیکھنے جائیں گے؟''

ڈھر جٹی بابو نے اپنی سگریٹ کو یوکلپٹس کے درخت کے تنے کی طرف پھینکتے ہوئے کہا، ''ناگ پالتو نہیں ہوتا ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ سانپوں کے بارے میں مجھے کافی معلومات ہے۔ بچپن میں میں جلپائی گری میں رہتا تھا اور اپنے ہاتھوں سے ڈھیروں سانپ مار چکا ہوں۔ ناگ خطرناک اور ایک نمبری شیطان سانپ ہوتا ہے، اسے پالنا ناممکن ہے۔ اس لیے سادھو بابا کے بارے میں جو خبر ملی ہے، اس میں کہاں تک سچائی ہے، اس پر مجھے شک ہو رہا ہے۔''

Scanned with CamScanner

میں نے کہا، ''کل تیسرے پہر کوئی پروگرام بھی نہیں ہے۔ صبح بایان کا قلعہ دیکھنے کے بعد ہم فارغ ہو جائیں گے۔''

''کیا آپ سادھو سنیاسیوں کے تئیں عقیدت کا جذبہ رکھتے ہیں؟''

اس سوال کے پیچھے ایک گہرا طنز ہے، یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ لیکن میں نے اس کا جواب سادگی سے ہی دیا۔

''اس میں عقیدت کی بات کہاں آتی ہے! کیونکہ ابھی تک مجھے کسی سادھو کی صحبت کا موقع نہیں ملا ہے۔ ہاں، تجسس ضرور ہے۔''

''کسی زمانے میں مجھے عقیدت تھی، لیکن ایک بار تجربہ ہوا تو پھر...''

ڈھرجٹی بابو کو جو تجربہ ہوا تھا، اس کا بیان کرتا ہوں... وہ بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ دس سال پہلے انھوں نے اپنے تاؤ جی کی باتوں میں آ کر ایک سادھو بابا کی دی ہوئی دوا کھائی تھی جس کی وجہ سے انھیں سات روز تک سخت قسم کے پیٹ درد کا سامنا کرنا پڑا تھا اور بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا۔ اسی روز سے ڈھرجٹی بابو کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے سو میں سے نوے سادھو بہروپیے اور مکار ہیں۔

ان کا سنیاسیوں کے تئیں تعصب مجھے بہت ہی دلچسپ لگ رہا تھا، اس لیے ان کو بھڑکانے کے خیال سے میں نے کہا، ''آپ یا ہم پالتو نہیں ہو سکتے، مگر میں نے سنا ہے کہ ہمالیہ میں سادھو اور شیر ایک ہی گپھا میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔''

''سنا ہی ہے نا؟ دیکھا تو نہیں؟''

مجھے ماننا پڑا کہ میں نے دیکھا نہیں ہے۔

''دیکھیں گے بھی نہیں۔ ہمارا ہندوستان قصے کہانی گڑھنے والا ملک ہے۔ سنیں گے بہت کچھ، مگر آنکھوں سے دیکھنا چاہیں تو دکھائی کچھ بھی نہیں دے گا۔ رامائن، مہابھارت کو ہی لیجیے نا، لوگ کہتے ہیں کہ وہ تاریخ ہے، مگر اصل میں عجیب عجیب کہانیوں کے نمونے ہیں۔ راون کے دس سر ہیں۔ ہنومان دُم میں آگ لے کر لنکا میں آگ لگا رہے ہیں۔ بھیم کی بھوک، گھٹوتکچ، ہڑمبہ، پشپک، کمبھ کرن۔ ان سب سے بڑھ کر نان سینس اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اگر سادھو سنیاسیوں کی بات کریں تو اس کی شروعات پُرانوں سے ہی ہوئی ہے۔ لیکن تمام ملک کے تعلیم یافتہ اور جاہل آدمی اتنے دنوں سے اسی بات پر

Scanned with CamScanner

یقین کرتے آرہے ہیں۔"

بابایان کا قلعہ دیکھنے کے بعد ہم ریسٹ ہاؤس میں لوٹ آئے اور کھانا کھا کر آرام کرنے لگے۔ پھر چار بجے املی بابا کے ڈیرے پر پہنچے۔ اس بار دُھرجٹی بابو نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے بابا کے بارے میں ان میں تھوڑا سا تجسس جاگ رہا ہو۔ جنگل کے بیچ ایک صاف ستھری اور کھلی جگہ میں ایک بڑے سے املی کے درخت کے نیچے بابا کی کٹیا ہے۔ درخت کے نام پر ہی بابا کا نام املی بابا پڑ گیا ہے اور یہ مقامی لوگوں نے ہی دے رکھا ہے۔ بابا کا اصل نام کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ کھجور کے پتے کی کٹیا میں اپنے اکلوتے شاگرد کے ساتھ بابا ریچھ کی کھال پر بیٹھے ہیں۔ شاگرد کم عمر کا ہے۔ بابا کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ سورج غروب ہونے میں ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی دیر ہے، لیکن املی کے پتوں کی گھنی چھاؤں کی وجہ سے اسی وقت یہاں اندھیرا پھیل چکا ہے۔

کٹیا کے سامنے دھونی جل رہی ہے۔ بابا کے ہاتھ میں گانجے کی چلم ہے۔ دھونی کی روشنی میں دیکھا کہ کٹیا کے پاس ہی ایک رسی ٹنگی ہوئی ہے جس پر انگوچھے اور لنگوٹ کے علاوہ سانپوں کی تقریباً دس کینچلیاں لٹکی ہوئی ہیں۔

ہمیں دیکھ کر بابا چلم کی درار سے مسکرا دیے۔ دُھرجٹی بابو نے پھسپھسا کر کہا، "فضول باتیں نہ کر کے اصل بات کا ہی ذکر کیجیے۔ پوچھیے کہ دودھ کس وقت پلایا جاتا ہے۔"

"آپ بال کشن سے ملنا چاہتے ہیں؟"

مجھے حیرت ہوئی کہ املی بابا نے ہمارے دل کی بات کیسے جان لی۔ ناگ کا نام بال کشن ہے، یہ بات جیپ کا ڈرائیور کچھ دیر پہلے ہی ہمیں بتا چکا ہے۔ ہمیں املی بابا کو بتانا پڑا کہ ہم ان کے بھانپ کے بارے میں کافی کچھ سن چکے ہیں اور پالتو سانپ کو دودھ پیتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا ہمیں یہ شرف حاصل ہو سکے گا؟

املی بابا نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ بال کشن ہر روز سورج غروب ہونے کے وقت بابا کی پکار سن کر گڑھے سے نکل کر کٹیا میں آتا ہے اور دودھ پی کر چلا جاتا ہے۔ دو دن پہلے تک وہ یہاں آچکا ہے مگر کل سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آج چونکہ پورنیما ہے، اس لیے آج بھی وہ نہیں آئے گا۔ کل سے آنا شروع کرے گا۔

Scanned with CamScanner

سانپ کی طبیعت خراب ہوتی ہے، یہ بات میرے لیے نئی تھی۔ لیکن پالتو ہونے کی وجہ سے ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ آخر گایوں، گھوڑوں اور کتوں وغیرہ کے لیے اسپتال ہوتے ہی ہیں۔

بابا کے شاگرد نے ایک اور خبر دی۔ ایک تو اس کی طبیعت خراب تھی، اس پر اس کے گڑھے میں کچھ ماٹے داخل ہو گئے تھے اور اسے پریشان کر دیا تھا۔ بابا کی بددعا سے وہ ماٹے خاک میں مل چکے ہیں۔ یہ بات سن کر ڈھرجٹی بابو نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں اصلی بابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے میں یوں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایک معمولی ساجبہ پہنے ہیں۔ سر پر جٹا ہے، مگر ایسی نہیں کہ متاثر کر سکے۔ کانوں میں لوہے کا کنڈل، گلے میں تقریباً چار چھوٹی بڑی مالائیں، داہنے ہاتھ کی کہنی کے اوپر تعویذ۔ ان میں اور دوسرے سادھوؤں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ پھر بھی شام کی ڈھلتی روشنی میں دھونی کے پیچھے بیٹھے اس آدمی کے چہرے پر سے میری آنکھیں دوسری طرف ہٹنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ ہمیں کھڑا دیکھ کر شاگرد دو چٹائیاں لے آیا اور بابا سے تقریباً دس ہاتھ کی دوری پر انھیں بچھا دیا۔ لیکن بابا کا ناگ جب آج آئے گا ہی نہیں تو بیٹھنے سے کیا فائدہ؟ واپسی میں زیادہ دیر کرنے سے رات ہو جائے گی۔

گاڑی تو ہے، مگر راستہ جنگل کے اندر سے ہو کر جاتا ہے اور آس پاس جنگلی جانوروں کی کمی نہیں۔ ہرنوں کے جھنڈ پر ہر دن نظر پڑ جاتی ہے۔ اس لیے ہم وہاں بیٹھے نہیں۔ بابا کو جب ہم نے نمسکار کیا تو چلم کو بغیر ہٹائے، آنکھوں کو بند کر کے اور ماتھے کو جھکا کر انھوں نے بھی ہمیں جواب میں نمسکار کیا۔ ہم دونوں تقریباً سو گز کی دوری پر کھڑی اپنی جیپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دور تک درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی آوازیں ہمارے کانوں میں آتی رہیں، اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔

کٹیا سے نکلنے کے بعد جب ہم کچھ قدم آگے بڑھ گئے تو اچانک ڈھرجٹی بابو نے کہا، ''سانپ ہم نہیں دیکھ سکے، مگر اس کا گڈھا ایک بار دیکھنے میں کیا حرج ہے؟''

میں نے کہا، ''اس کے لیے اصلی بابا کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارا ڈرائیور دین دیال بتا ہی چکا ہے کہ اسے گڈھے کا پتا معلوم ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

گاڑی سے دین دیال کو اپنے ساتھ لے کر ہم لوٹ آئے۔ اس بار کٹیا کی طرف نہ جا کر ہم

Scanned with CamScanner

ایک بادام کے درخت کی بغل سے ہوتے ہوئے ایک پگڈنڈی سے تھوڑی دور آگے بڑھے۔ سامنے ہی کانٹوں کی جھاڑی تھی۔ آس پاس پتھر کے ٹکڑوں کو دیکھ کر لگا کہ کسی زمانے میں یہاں کوئی عمارت رہی ہوگی۔ دین دیال نے بتایا کہ جھاڑی کے پیچھے ہی سانپ کا گڈھا ہے۔ اگر اسے ہی دیکھا جائے تو کچھ بھی پتا نہیں چل سکتا، کیونکہ روشنی اور بھی پھیکی ہوگئی ہے۔ دھر جٹی بابو نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکالی اور جھاڑی پر روشنی ڈالی۔ جھاڑی کے پیچھے کا گڈھا دکھائی دینے لگا۔ خیر، گڈھا تو موجود ہے، مگر سانپ؟ کیا وہ اپنی طبیعت خرابی کی حالت میں ہمارے اشتیاق اور تجسس کو ختم کرنے کے لیے گڈھے سے باہر آئے گا؟

سچ کہوں، سادھو بابا کے ہاتھ سے ناگ کو دودھ پیتے ہوئے دیکھنے کا خواہش مند ہونے کے باوجود گڈھے کے سامنے کھڑے ہوکر سانپ کو دیکھنے کی مجھے ذرا بھی خواہش نہیں تھی۔ مگر دھر جٹی بابو کے دل میں اب مجھ سے کہیں زیادہ تجسس تھا۔ روشنی سے جب کام نہیں بنا تو انھوں نے زمین سے ڈھیلے چن چن کر جھاڑی پر پھینکنا شروع کردیے۔

مجھے ان کی یہ زیادتی اچھی نہیں لگی۔ میں نے کہا، ''کیا ہوا صاحب؟ دیکھ رہا ہوں، آپ پر تو دھن سوار ہوگئی ہے۔ آپ کو تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ سانپ ہے۔''

اس بار انھوں نے ایک بڑا سا ڈھیلا ہاتھ میں اٹھالیا اور بولے، ''مجھے اب بھی یقین نہیں ہو رہا ہے۔ اس ڈھیلے سے بھی اگر کچھ نتیجہ نہ نکلا تو میں سمجھوں گا کہ باباجی کے بارے میں جو کچھ مشہور کیا جا رہا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔''

ڈھیلا زور سے آواز کرتا ہوا جھاڑی پر گرا اور اس نے کانٹوں اور پتوں کو تہس نہس کر دیا۔ دھر جٹی بابو اب بھی گڈھے پر روشنی ڈالے ہوئے تھے۔ چند پلوں تک خاموشی چھائی رہی۔ جنگل کے اندر کہیں سے صرف جھینگر کی آواز آ رہی تھی۔ اس بار اس آواز کے ساتھ ایک اور آواز سنائی دی — ایک پھیکی اور بے سری سسکاری جیسی آواز۔ اس کے بعد پتوں کی کھڑکھڑاہٹ شروع ہوئی اور پھر ٹارچ کی روشنی میں کسی چیز کا کالا اور چکنا حصہ دکھائی دیا۔ وہ چیز بل ڈل رہی ہے، زندہ ہے اور آہستہ آہستہ گڈھے کے باہر نکل رہی ہے۔ اس بار جھاڑی کے پتے ہل اٹھے اور دوسرے ہی لمحے ان کے بیچ سے سانپ کا ماتھا باہر نکل آیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ناگ کی جلتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں، اس کے بعد اس

کی دو حصوں میں بٹی ہوئی زبان، جو بار بار منھ سے نکل کر لپلپانے لگتی تھی اور پھر اندر چلی جاتی تھی۔
دین دیال کچھ دیر پہلے سے ہی لوٹنے کی ضد کر رہا تھا۔ اس بار اس نے بھرائی ہوئی التجائیہ آواز میں کہا،
''چھوڑ دیجیے بابو! اب تو دیکھ چکے، واپس چلیے۔''
شاید ٹارچ کی وجہ سے ہی بال کشن اب بھی اپنا سر نکال کر ہماری طرف گھور رہا ہے اور بیچ بیچ میں زبان باہر نکال رہا ہے۔ میں ڈھیروں سانپ دیکھ چکا ہوں مگر اتنے نزدیک سے اس قسم کے ناگ کو نہیں دیکھا تھا۔ ناگ حملہ کرنے کی کوشش نہ کر کے اس طرح ہماری طرف کیوں گھور رہا ہے؟ ایسا تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اچانک ٹارچ کی روشنی کانپتی ہوئی وہاں سے الگ ہٹ گئی۔ اس کے بعد جو حادثہ پیش آیا اس کے لیے میں قطعی تیار نہیں تھا۔ ڈھرجٹی بابو نے اچانک ایک پتھر اٹھا کر بال کشن پر زور سے پھینک دیا، اس کے بعد ایک ایک کر کے دو پتھر اور پھینکے۔ ایک بھیانک اندیشے سے گھبرا کر میں نے کہا، ''آپ نے یہ کیا کیا ڈھرجٹی بابو؟''
ڈھرجٹی بابو میری بغل میں ہانپ رہے تھے۔ انھوں نے دھیمی آواز میں مگر دبی دبی مسرت کے ساتھ کہا، '' کماگ لیس!''
دین دیال ہکا بکا سا جھاڑی کی طرف تاک رہا ہے۔ ڈھرجٹی بابو کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر اس بار میں نے ہی گڑھے کی طرف روشنی ڈالی۔ بال کشن کے نڈھال جسم کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا ہے۔ جھاڑی کے پتوں پر سانپ کے ماتھے سے نکلا ہوا تھوڑا سا خون لگا ہوا ہے۔
اس بیچ کب املی بابا اور ان کے شاگرد ہمارے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تھے، ہمیں اس بات کا علم ہی نہ ہو سکا۔ پہلے ڈھرجٹی بابو ہی پیچھے کی طرف مڑے۔ اس کے بعد میں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ بابا ہاتھ میں ایک لاٹھی تھامے ہم سے تقریباً دس قدم کی دوری پر، ایک بونے سے کھجور کے پیڑ کے پاس کھڑے ہیں اور ڈھرجٹی بابو کو ایک ٹک دیکھ رہے ہیں۔ بابا اتنے لمبے ہیں، اس کا اندازہ مجھے اس وقت نہیں ہو سکا تھا جب وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی نظروں کا بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اتنے غصے، نفرت اور حیرانی سے ملی جلی نگاہ میں نے کبھی کسی کی نہیں دیکھی تھی۔ بابا کا داہنا ہاتھ سامنے کی طرف اٹھ گیا۔ وہ ہاتھ ڈھرجٹی بابو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ درمیانی انگلی سامنے کی طرف آ گئی اور اس سے اشارہ اور بھی واضح ہو گیا۔ پہلی بار میں نے دیکھا کہ بابا کی ہر انگلی کا ناخن

Scanned with CamScanner

تقریباً دو انچ لمبا ہے۔ بابا کو دیکھ کر مجھے کس کی یاد آرہی ہے؟ بچپن میں دیکھی ہوئی، بیڈن اسٹریٹ میں واقع اپنے ماما کے گھر کی دیوار پر روی ورما کی بنائی ہوئی تصویر مجھے یاد آرہی ہے۔ مُنی درواسا شکنتلا کو بددعا دے رہے ہیں۔ بالکل اسی انداز میں ان کا ہاتھ اٹھا ہوا ہے۔ آنکھوں میں بھی ویسا ہی جلال ہے۔

مگر املی بابا نے بددعا نہیں دی۔ اپنی سنجیدہ اور ہلکی آواز میں انھوں نے ہندی میں جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ ہے: ''ایک بال کشن چلا گیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ کوئی دوسرا آجائے گا۔ بال کشن کی موت نہیں ہوسکتی۔ وہ امر ہے۔''

دُھر جٹی بابو خاک سے سنے اپنے ہاتھوں کو پونچھ کر میری طرف مڑے اور کہا، ''چلیے۔''

بابا کے چیلے نے وہاں آکر گڈھے کے منھ سے ناگ کی لاش کو باہر نکالا، شاید اس کو دفن کرنے کی غرض سے۔ سانپ کی لمبائی دیکھ کر میرے منھ سے ایک حیرت کا اظہار کرنے والا لفظ خود بخود ادا ہوگیا۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ ناگ اتنا لمبا ہوسکتا ہے۔ املی بابا آہستہ آہستہ کٹیا کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہم تینوں جیپ میں بیٹھ گئے۔

ریسٹ ہاؤس سے واپسی میں دُھر جٹی بابو کو گم سم دیکھ کر میں ان سے کچھ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''سانپ جبکہ ان کا پالتو تھا اور اس نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، تو آپ نے اسے مارا کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ سانپ اور سادھوؤں کے بارے میں کچھ تلخ باتیں کہہ کر اپنے سیاہ کارنامے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کریں گے، مگر انھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا، بلکہ الٹا مجھ سے ہی ایک سوال کردیا۔

''کھگم کون تھا صاحب؟''

کھگم؟ نام تو جانا پہچانا سا لگتا ہے، مگر یاد نہیں آرہا ہے کہ اس کے بارے میں میں نے کہاں پڑھا یا سنا ہے۔ دُھر جٹی بابو نے دو چار مرتبہ اور 'کھگم' لفظ ادا کیا اور آخر میں وہ چپ ہوگئے۔ جب ہم ریسٹ ہاؤس پہنچے تو چھ بج چکے تھے۔ املی بابا کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آرہا ہے۔ دُھر جٹی بابو کی طرف آنکھیں اٹھائے، ہاتھ اٹھائے درواسا کی طرح کھڑے ہیں۔ نہ جانے کیوں دُھر جٹی بابو

Scanned with CamScanner

مت کٹ جانے کے شکار ہو گئے ہیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہم اس حادثے کا انجام دیکھ آئے ہیں، اس لیے اب اس بارے میں سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بابا خود ہی کہہ چکے ہیں کہ بال کشن کی موت نہیں ہوئی ہے۔ بھرت پور کے جنگل میں کیا دوسرا ناگ نہیں ہوگا؟ کل ہی بابا کے چیلے ایک دوسرے ناگ کو پکڑ کر لے آئیں گے۔

ڈنر کے لیے پچھمن نے مرغے کا سالن بنایا تھا۔ اس کے ساتھ پوریاں اور ماش کی دال۔ دن بھر گھومتے پھرتے رہنے سے آدمی کی بھوک خوب کھل جاتی ہے۔ کلکتہ میں رات میں جتنا کھاتا ہوں یہاں اس کا دگنا کھالیتا ہوں۔ پست قامت ہونے سے کیا ہوا، دُھرجٹی بابو بھی خوش خوراک ہیں۔ لیکن آج ایسا محسوس ہوا کہ انھیں بالکل بھوک نہیں ہے۔ میں نے جب ان کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے کہا، ''آپ کو کیا بال کشن کے لیے دکھ ہو رہا ہے؟''

دُھرجٹی بابو نے جواب تو ضرور دیا، مگر اسے میرے سوال کا جواب نہیں کہا جا سکتا۔ پیٹرومیکس کی طرف گھورتے ہوئے اپنی آواز کو بے حد ہلکا اور ملائم بنا کر کہا، ''سانپ پھس پھس... پھس پھس کر رہا تھا... پھس پھس... کر رہا تھا۔''

میں نے ہنس کر کہا، ''پھس پھس یا پھونس پھونس؟''

آنکھوں کو روشنی کی طرف سے ہٹائے بغیر انھوں نے سر ہلا کر کہا، ''نہیں، پھس پھس... سانپ کی زبان، سانپ کی سسکاری... پھس پھس پھس...''

یہ کہہ کر انھوں نے اپنی زبان کی پھانک سے سانپ کی سسکاری جیسی آواز باہر نکالی۔ اس کے بعد نظم پڑھنے کے سے انداز میں سر ہلا ہلا کر کہا، ''سانپ کی زبان، سانپ کی سسکاری، پھس پھس پھس... بال کشن کا عجیب ساز ہر... پھس پھس پھس... یہ کیا چیز ہے؟ بکری کا دودھ؟''

آخر کے دو جملے یقیناً نظم کے تو نہ تھے — یہ انھوں نے ایک معمولی طشتری میں رکھی پڈنگ کے بارے میں کہا تھا۔

پچھمن نے 'بکری' نہیں، صرف 'دودھ' لفظ ہی سنا تھا، اس لیے کہا، ''ہاں بابو، دودھ اور انڈا ہے۔''

Scanned with CamScanner

دودھ اور انڈے سے پڈنگ بنتی ہے، یہ بات کون نہیں جانتا؟

دُھرجٹی بابو یوں بھی من موجی اور خبطی قسم کے انسان ہیں۔ مگر آج ان کا رویہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

اس بات کو محسوس کر کے انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کہا، ''کئی دنوں سے دھوپ میں بہت چکر کاٹنا پڑے ہیں... کل سے ذرا احتیاط برتنا ہوگی۔''

آج کڑاکے کی سردی ہے، اس لیے کھانا کھانے کے بعد باہر بیٹھنے کے بجائے میں اپنا سوٹ کیس ٹھیک کرنے لگا۔ کل شام بھرت پور سے رخصت ہونا ہے۔ آدھی رات کو مادھوپور میں گاڑی بدلنا ہے۔ صبح پانچ بجے میں جے پور پہنچ جاؤں گا۔

میرا یہی ارادہ تھا، مگر میرا ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ منجھلے بھیا کو تار بھیج کر خبر دے دی کہ کسی خاص وجہ سے میرے پہنچنے کی تاریخ ایک دن آگے بڑھ گئی ہے۔ ایسا کیوں ہوا، یہی بات اب آگے بتانے جا رہا ہوں۔ واقعات کو حتی الامکان واضح طور پر بتانے کی کوشش کروں گا۔ جانتا ہوں اس واقعے پر بھی یقین نہیں کریں گے۔ جس چیز کو میں بطور ثبوت پیش کر سکتا تھا، وہ اب بھی املی بابا کی کٹیا سے پچاس ہاتھ دور پڑی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں سوچتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس چیز کو ثبوت کے طور پر اپنے ہاتھ میں اٹھا کر نہیں لا سکا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ خیر، اب واقعہ بیان کرتا ہوں۔

سوٹ کیس سنبھال کر میں نے لالٹین کی روشنی کم کر دی اور اسے میز کی آڑ میں رکھ دیا۔ اس کے بعد رات کا لباس پہن کر جیسے ہی بستر پر لیٹنے جا رہا تھا کہ مشرق کے دروازے پر طرف دستک ہوئی۔ اس دروازے کے پیچھے کی طرف دُھرجٹی بابو کا کمرہ ہے۔

جیسے ہی دروازہ کھولا، انھوں نے آہستہ سے کہا، ''آپ کے پاس فلٹ وغیرہ ہے؟ یا مچھر بھگانے کی کوئی دوا؟''

میں نے کہا، ''مچھر کہاں سے آ گئے؟ آپ کے کمرے کے دروازے کھڑکیوں میں جالی نہیں لگی ہے؟''

''ہے۔''

''پھر؟''

''پھر بھی کوئی چیز کاٹتی ہے۔''

''اس کا آپ کو پتا چلتا ہے؟''

''ہاتھ اور منھ میں داغ ابھرتے جا رہے ہیں۔''

دروازے کے سامنے اندھیرا تھا، اس لیے ان کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

''اندر چلے آیئے،'' میں نے کہا۔ ''دیکھیں کس طرح کے داغ ہیں۔''

ڈھرجٹی بابو کمرے کے اندر چلے آئے۔ ان کے سامنے لالٹین رکھتے ہی داغ دکھائی دیے — چار کونوں والے کتھئی کتھئی دھبے۔

اس طرح کے داغ میں نے اس کے پہلے نہیں دیکھے تھے اور دیکھنے پر مجھے اچھا بھی نہیں لگا۔

میں نے کہا، ''عجیب ہی طرح کی بیماری ہو گئی ہے۔ الرجی سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ کل صبح نیند ٹوٹتے ہی ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔ آپ سونے کی کوشش کیجیے۔ اس کے لیے فکرمند نہ ہوں۔ یہ کیڑے کے کاٹنے سے نہیں ہوا ہے، بات کچھ اور ہی ہے۔ درد ہو رہا ہے؟''

''اوں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ جایئے، سو جایئے۔''

ڈھرجٹی بابو چلے گئے اور میں بستر پر آ کر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ رات میں بستر پر لیٹ کر کتاب پڑھنے میں میں ماہر ہوں، مگر یہاں لالٹین کی روشنی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ سچ کہوں تو اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ دن بھر تھک جانے کے بعد تکیے پر سر رکھتے ہی دس منٹ کے اندر آنکھوں میں نیند اتر آتی ہے۔

مگر آج ایسا نہیں ہوا۔ کسی گاڑی کی آواز سے غنودگی دور ہو گئی۔ صاحبوں کی آواز کے ساتھ ساتھ ایک اجنبی کتے کی آواز سن رہا ہوں۔ ریسٹ ہاؤس میں کچھ سیاح آئے ہیں۔ ڈانٹ سن کر کتے نے بھونکنا بند کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے صاحب لوگ بھی شاید کمرے کے اندر آ گئے ہیں۔ پھر سناٹا ہو گیا۔ باہر سے جھینگر کی آواز آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک اور آواز آ رہی ہے۔ میرے مشرق کی طرف

واقع کمرے کے پڑوسی ابھی تک جاگ رہے ہیں اور نہ صرف جاگ رہے ہیں بلکہ چہل قدمی کر رہے ہیں۔ ان کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ حالانکہ دروازے کے نیچے کے سوراخ سے کچھ دیر پہلے دیکھ چکا ہوں کہ لالٹین کو یا تو بجھا دیا گیا ہے یا بغل کے غسلخانے کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ وہ کمرے کے اندر چہل قدمی کیوں کر رہے ہیں؟

مجھے لگا وہ نیم پاگل ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر کچھ ہیں۔ ان سے میری جان پہچان محض دو دنوں کی ہے۔ انھوں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس سے زیادہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ دو گھنٹے پہلے میں نے ان میں پاگل پن کے کوئی آثار نہیں دیکھے تھے۔ دیگ اور بایان کے قلعے کو دیکھتے وقت انھوں نے جس قسم کی باتیں کی تھیں اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ کے بارے میں انھیں اچھی خاصی معلومات ہے۔ اتنا ہی نہیں، آرٹ کے بارے میں بھی انھیں کافی علم تھا۔ اور اس کی جھلک ان کی بات چیت سے مل رہی تھی۔ راجستھان کی تعمیرات میں ہندو اور مسلمان کاریگروں کے یوگ دان کی بات انھوں نے بہت ہی جوشیلے انداز میں بتائی تھی۔ لگتا ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔

میری گھڑی کا ریڈیم ڈائل اس وقت گیارہ بجنے کی خبر دے رہا تھا۔ مشرقی دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس بار بستر سے اٹھنے کے بجائے میں نے چلا کر پوچھا، ''کیا بات ہے دُھر جٹی بابو؟''

''س۔۔۔ س۔۔۔ س۔۔۔ س۔۔۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''س۔۔۔ س۔۔۔ س۔۔۔ س۔۔۔''

معلوم ہوا کہ بیچارے کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ بہت کشمکش میں پڑ گیا۔ میں نے دوبارہ پوچھا، ''کیا کہہ رہے ہیں؟ ٹھیک سے کہیے۔''

''س۔۔۔ س۔۔۔ س۔۔۔ سنیے ذرا۔''

آخر مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ دروازہ کھولتے ہی انھوں نے اس طرح کا سوال کیا کہ مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔

''اچھا، س۔۔۔ س۔۔۔ س۔۔۔ سانپ میں کیا 'س' ہوتی ہے؟''

''جی ہاں، سانپ کا مطلب جب اسنیک ہوتا ہے تو 'س' ہی ہوتی ہے۔''میں نے اپنی اکتاہٹ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔''آپ نے اسی بات کو جاننے کے لیے اتنی رات گئے دروازہ کھٹکھٹایا؟''

''س؟''

''جی ہاں۔سانپ کا مطلب جب سانپ ہوتا ہے تو 'س' ہی ہوتی ہے۔''

''اور 'ش'؟''

''وہ دوسری چیز ہے... شاپ، یعنی بددعا۔''

''بددعا؟''

''ہاں، ابھی شاپ... بددعا۔''

''شکریہ... س... س... سوئیے جاکر۔''

ان کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آرہا تھا۔میں نے کہا،''آپ کو نیند کی دوا دیتا ہوں۔دوا میرے پاس ہے۔کھائیں گے؟''

''نہیں... س... س... سردی میں نیند آجاتی ہے۔س... س... س... صرف شام میں غروب آفتاب کے وقت...''

میں نے انھیں ٹوکا:''آپ کی زبان میں کچھ ہوگیا ہے۔''

''کیا؟''

''بات کہیں پر اٹک سی جاتی ہے۔ذرا اپنی ٹارچ تو دیجیے۔''

ان کے ساتھ میں بھی ان کے کمرے کے اندر گیا۔ٹارچ سنگھار میز پر پڑی ہوئی تھی، اسے جلا کر میں نے ان کے منھ کے سامنے کیا اور انھوں نے منھ کھول کر زبان باہر نکال دی۔اس میں شک نہیں کہ زبان میں کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ایک پتلا سا سرخ داغ زبان کے سرے سے لے کر بیچ تک چلا گیا ہے۔

''اس میں کوئی درد نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

Scanned with CamScanner

انھیں کس بیماری نے جکڑ لیا ہے، یہ بات میری سمجھ کے باہر ہے۔

اب میری نظر ان کے پلنگ پر گئی۔ بستر کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر سمجھ میں آیا، اب تک وہ پلنگ پر لیٹے نہیں ہیں۔ میں نے بے رخی سے کہا، ''آپ جب لیٹ جایئے گا تبھی میں اپنے کمرے میں جاؤں گا۔ میں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں کہ اب دروازہ مت کھٹکھٹایئے گا۔ کل ریل میں سو نہیں پاؤں گا، اس لیے آج رات سو لینا چاہتا ہوں۔''

مگر ان میں پلنگ کی طرف جانے کی کوئی خواہش نظر نہ آئی۔ لالٹین غسلخانے میں رکھی ہوئی ہے، اس وجہ سے کمرے میں روشنی نہیں کے برابر ہے۔ باہر پونم کا چاند روشن ہے۔ شمالی کھڑکی سے چاندنی آ کر فرش پر لوٹ رہی ہے، اس کی روشنی میں ڈھر جٹی بابو دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ رات کے لباس میں ہیں اور بیچ بیچ میں ہونٹوں سے سسکاری کی طرح آواز نکال رہے ہیں۔ آتے وقت میں نے اپنے بدن پر کمبل لپیٹ لیا تھا، مگر ڈھر جٹی بابو کے بدن پر ایک بھی گرم کپڑا نہیں ہے۔ کہیں ڈھر جٹی بابو حقیقت میں کسی بیماری کے چکر میں پھنس جائیں تو انھیں چھوڑ کر میرا یہاں سے جانا مشکل ہے۔ پردیس میں اگر کوئی بنگالی مصیبت میں پھنس جائے تو بنگالی ہونے کے ناتے اسے چھوڑ کر جانا میرے لیے ناممکن ہوگا۔

میں نے جب ایک بار پھر ان سے سونے کو کہا اور میرے کہنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو سوچا، ہاتھ پکڑ کر زبردستی لٹا دینے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ اگر وہ چھوٹا بچہ بنتے ہیں تو مجھے بھی بزرگوں کی طرح سلوک کرنا ہوگا۔

مگر ان کا ہاتھ پکڑتے ہی مجھ میں اچانک ایسا ردعمل ہوا کہ گھبرا کر میں تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔

ڈھر جٹی بابو کا بدن برف کی مانند ٹھنڈا ہے۔ ایک زندہ آدمی کا بدن اتنا ٹھنڈا ہو سکتا ہے، یہ بات میری سمجھ کے باہر ہے۔

میری حالت دیکھ کر ڈھر جٹی بابو کے ہونٹوں کے گوشے میں ایک ہنسی کھیل گئی۔ اب وہ اپنی پیلی آنکھوں سے میری طرف گھورتے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا، ''آپ کو کیا ہوا ہے؟ بتایئے۔''

Scanned with CamScanner

ڈھرجٹی بابو میری طرف سے آنکھیں نہیں ہٹاتے ہیں۔ چند پل بغیر پلک جھپکے میری طرف تاکتے رہے ہیں۔ میں حیرت سے دیکھتا ہوں، ان کی پلکیں ایک بار بھی نہیں جھپکی ہیں۔ اس بیچ ان کی زبان کئی بار ہونٹوں کی پھانک سے باہر نکل چکی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے پھسپھسا کر کہا، ''بابا بلا رہے ہیں۔ بال کشن! بال کشن!... بابا بلا رہے ہیں...''

اس کے بعد ان کا گھٹنا مڑ گیا۔ پہلے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ اس کے بعد اپنے بدن کو آگے کی طرف پھیلا کر فرش پر منھ کے بل لیٹ گئے اور کہنی کے بل چلتے ہوئے پلنگ کے نیچے چلے گئے۔

یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ میرا پورا جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا ہے، میرے ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ کھڑا رہنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ ڈھرجٹی بابو کے بارے میں جو اندیشہ تھا وہ دور ہو گیا ہے، اور اب میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں وہ بے یقینی اور دہشت سے ملا جلا ایک خوفناک احساس ہے۔

میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

دروازہ بند کر کے میں نے چٹخنی لگا دی اور پھر سر سے پیر تک کمبل ڈھک لیا۔ اس حالت میں کچھ دیر لیٹے رہنے کے بعد میرے بدن کی کپکپی دور ہوئی اور میرے دماغ نے سوچنا شروع کیا۔ معاملہ کہاں جا چکا ہے اور اپنی آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہوتے ہوئے دیکھ چکا ہوں، اس سے کس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے، اس پر میں نے ایک بار سوچ کر دیکھا۔ آج تیسرے پہر ڈھرجٹی بابو نے املی بابا کے پالتو ناگ کو پتھر سے مار دیا۔ اس کے بعد ہی املی بابا نے ڈھرجٹی بابو کی طرف انگلی تان کر کہا تھا: ایک بال کشن چلا گیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اس کی جگہ دوسرا بال کشن چلا آئے گا۔ وہ دوسرا بال کشن کوئی سانپ ہوگا یا آدمی؟

یا آدمی سانپ بن جائے گا؟

ڈھرجٹی بابو کے سارے بدن پر چکتے اور داغ کس چیز کے ہیں؟ زبان پر داغ کیا چیز ہو سکتی ہے؟

یہ کیا دو حصوں میں بٹ جانے سے پہلے کی حالت ہے؟

ان کا بدن اتنا سرد کیوں تھا؟

Scanned with CamScanner

وہ پلنگ پر سونے کے بجائے پلنگ کے نیچے کیوں چلے گئے؟

اچانک بجلی کوندنے کی طرح اک بات یاد آ گئی۔ کھگم! ڈھرجٹی بابو نے کھگم کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ نام جانا پہچانا سالگا تھا، مگر سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب یاد آیا۔ بچپن میں مہابھارت کی ایک کہانی پڑھی تھی۔ کھگم نام کے ایک سادھو یارشی تھے ان کے شاپ سے ان کے دوست سہسر پادمنی ڈوھنورا سانپ ہو گئے تھے۔ کھگم... سانپ... شاپ... سب میں ایک رشتہ تو ہے۔ لیکن وہ ڈوھنورا سانپ ہو گئے تھے، اور دھرجٹی بابو کیا...؟

کوئی میرے دروازے پر پھر سے دستک دے رہا ہے۔ اوپر کی بجائے نیچے کی طرف کھٹکھٹا رہا ہے۔ چوکھٹ کے ٹھیک اوپر — ایک بار... دو بار... تین بار...

میں بستر سے اٹھنے کا نام نہیں لے رہا ہوں۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ ہاں، اب نہیں کھولوں گا۔

آواز تھم جاتی ہے۔ میں سانس روکے دم بخود لیٹا ہوں۔ اب کانوں میں سسکاری آتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ سسکاری دروازے سے دور سرک جاتی ہے۔ اب میرے دل کی دھڑکن کے سوا کوئی دوسری آواز نہیں آ رہی ہے۔

وہ کیا ہے؟ چیں چیں جیسی آواز... ایک کریہہ مگر مہین چیخ... چوہا ہے کیا؟ یہاں چوہا ہے۔ پہلی رات ہی اپنے کمرے میں دیکھ چکا ہوں۔ دوسرے روز جب چھمن سے کہا تو وہ باورچی خانے سے چوہے دان میں ایک زندہ چوہا لا کر دکھا گیا تھا۔ کہا تھا، چوہے کے ساتھ ساتھ چھچھوندر بھی ہے۔

چیخ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے اور پھر سے سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ گھڑی دیکھتا ہوں، پون بج رہا ہے۔ معلوم نہیں، نیند کہاں گم ہو گئی ہے۔ کھڑکی سے باہر کے پیڑ پودے نظر آ رہے ہیں۔ چاند شاید بیچ آسمان میں ہے۔

دروازہ کھولنے کی آواز ہوتی ہے۔ ڈھرجٹی بابو برآمدے میں جانے کے لیے بغل کے کمرے کا دروازہ کھول رہے ہیں۔ میرے کمرے میں جس طرف کھڑکی ہے، برآمدے میں جانے کا دروازہ اسی طرف ہے۔ ڈھرجٹی بابو کا کمرہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ برآمدے پر سے اتر کر بیس ہاتھ آگے جانے کے بعد ہی پیڑ پودے ملنے لگتے ہیں۔

ڈھرجٹی بابو برآمدے پر نکل آئے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں وہ؟ ان کا ارادہ کیا ہے؟ میں بغیر پلک جھپکے کھڑکی کی طرف تاکتا ہوں۔

سِسکاری کی آواز آتی ہے۔ آواز مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اب آواز میری کھڑکی کے باہر سے آ رہی ہے۔ خوش قسمتی سے کھڑکی بند ہے ورنہ...

کوئی چیز کھڑکی کے نیچے سے اوپر کی طرف آ رہی ہے۔ تھوڑی دور تک اوپر آتی ہے اور پھر ٹھٹک جاتی ہے۔ کسی کا سر ہے۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں دو چمکتی ہوئی پیلی آنکھیں نظر آ رہی ہیں وہ آنکھیں ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی ہیں۔

چند لمحوں تک اسی طرح رہنے کے بعد وہ سر ایک کتے کی آواز سنتے ہی نیچے اتر کر کہیں غائب ہو جاتا ہے۔

کتا بھونک رہا ہے۔ پھر اس کی سہمی ہوئی سی چیخ سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد کسی کی نیند سے بوجھل آواز کتے کو پھٹکارتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ ایک دردناک چیخ کے ساتھ کتے کی آواز تھم جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی آواز نہیں آتی۔ میں لگ بھگ دس منٹ تک اپنے حواس واعصاب کو قائم رکھے لیٹا رہتا ہوں۔ کانوں میں بار بار آج کی سنی ہوئی کویتا کی سطریں چلی آ رہی ہیں:

سانپ کی زبان سانپ کی سسکاری
پھس... پھس... پھس...
بال کشن کا وشم وِش
پھس... پھس... پھس...

آہستہ آہستہ وہ کویتا بھی خلا میں گم ہو جاتی ہے۔ جسم میں جیسے جان نہ ہونے کا احساس مجھے نیند کی طرف کھینچ کر لے جا رہا ہے۔ کسی صاحب کی چلاہٹ سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھنے پر پتا چلا، چھ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ جلدی جلدی بدن پر ایک گرم کپڑا ڈال کر جب باہر نکلا تو گورے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ دو امریکی لڑکے ہیں۔ نام بروس اور مائیکل۔ ان لوگوں کا پالتو کتا کل رات مر گیا۔ اپنے کمرے میں ہی کتے کو رکھ کر وہ سوئے ہوئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ سانپ یا بچھو نے اسے کاٹ لیا تھا۔

Scanned with CamScanner

مائیکل کا خیال ہے کہ بچھو ہوگا کیونکہ سردی کے موسم میں سانپ باہر نہیں نکلتے۔ کتے کے پیچھے وقت ضائع نہ کر کے میں برآمدے کے دوسری طرف دھرجٹی بابو کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ کھلا ہوا ہے مگر کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ لچھمن ہر روز صبح ساڑھے پانچ بجے جاگ کر چولھا جلاتا ہے اور چائے کے لیے پانی گرم کرتا ہے۔ اس سے پوچھنے پر پتا چلا کہ دھرجٹی بابو پر اس کی نظر نہیں پڑی ہے۔

دل میں طرح طرح کے خیال آرہے ہیں۔ چاہے جیسے بھی ہو انھیں تلاش تو کرنا ہی ہے۔ پیدل چل کر وہ کتنی دور جا سکتے ہیں؟ مگر تمام جنگل میں تلاش کرنے کے باوجود ان کا کہیں پتا نہ چلا۔

ساڑھے دس بجے جیپ آئی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا، ''پوسٹ آفس جا کر مجھے ٹیلیگرام کرنا ہے۔ جب تک دھرجٹی بابو سے متعلق راز کا پردہ فاش نہیں ہو جاتا، میں بھرت پور سے نہیں جاؤں گا۔''

منجھلے بھیا کو ٹیلیگرام کرنے کے بعد میں نے ریل کا ٹکٹ ایک روز آگے کے لیے بڑھوا لیا اور ریسٹ ہاؤس لوٹ آیا۔ وہاں آنے پر پتا چلا کہ دھرجٹی بابو کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ دونوں امریکی اس بیچ کتے کو دفنا کر، بوریا بستر سمیٹ کر وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔

دوپہر بھر میں ریسٹ ہاؤس کے آس پاس چکر کاٹتا رہا۔ میرے کہنے کے مطابق جیپ تیسرے پہر دوبارہ آگئی۔ میرے دماغ میں ایک خیال آیا تھا۔ دل کہہ رہا تھا، اس سے کچھ پتا چل سکتا ہے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا، ''املی بابا کے پاس چلو۔''

کل جس وقت پہنچا تھا آج بھی تقریباً اسی وقت بابا کی کٹیا میں پہنچا۔ بابا کل کی طرح دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ آج یہاں دو شاگرد اور ہیں۔ ایک ادھیڑ آدمی اور دوسرا لڑکا سا۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بابا نے گردن ترچھی کر کے نمسکار کیا۔ کل کی بھسم کر دینے والی نگاہ اور آج کی نگاہ میں کوئی مطابقت نہیں تھی۔

وقت ضائع نہ کر کے میں نے بابا سے سیدھا سوال کیا کہ میرے ساتھ جو صاحب آئے تھے، ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں یا نہیں۔ بابا کے چہرے پر خوشی ابھر آئی۔ بولے، ''بتا سکتا ہوں۔ تمھارے دوست نے میری خواہش پوری کر دی ہے، وہ میرے بال کشن کو واپس لے آیا ہے۔''

اتنی دیر کے بعد بابا کے داہنے ہاتھ کے پاس رکھی ہوئی پتھر کی ایک کٹوری پر میری نگاہ پڑی۔

Scanned with CamScanner

اس میں سفید رنگ کی جو پتلی چیز رکھی ہے، وہ دودھ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مگر میں سانپ اور دودھ کی کٹوری دیکھنے کے لیے اتنی دور نہیں آیا ہوں۔ میں دھرجٹی بابو کی تلاش میں آیا ہوں۔ وہ ہوا میں نہیں مل گئے ہوں گے۔ ان کے وجود کا اگر کوئی نشان بھی مل جاتا تو مجھے اطمینان ہو جاتا۔

یہ پہلے بھی دیکھ چکا ہوں کہ املی بابا آدمی کے دل کی بات سمجھ جاتے ہیں۔ گانجے کی چلم سے ایک لمبا کش لے کر انھوں نے چلم اپنے ادھیڑ عمر کے چیلے کو بڑھا دی اور بولے، ''اپنے دوست کو تم پہلے کے جیسا واپس نہیں پا سکو گے۔ ہاں، وہ اپنی نشانی رکھ گیا ہے۔ وہ نشانی تمھیں بال کشن کے ڈیرے سے پچاس قدم داہنی طرف ملے گی۔ ہوشیاری سے جانا، راستے میں بہت سے کانٹے دار پودے ہیں۔''

بابا کے کہنے کے مطابق میں بال کشن کے گڈھے کے پاس گیا۔ اس میں سانپ ہے یا نہیں، یہ جاننے کا مجھے اب ذرا بھی تجسس نہیں ہے۔ آسمان میں ڈوبتے ہوئے سورج کو نہارتا ہوا جنوب کی طرف بڑھتا گیا۔ پتھر کے ڈھوکے اور کانٹوں کے بیچ سے ہوتا ہوا جب میں پچاس قدم آگے بڑھا تو ارجن کے ایک درخت کے تنے کے قریب جس چیز پر نظر پڑی اس چیز کو کچھ منٹ پہلے املی بابا کی کٹیا میں رسی پر ٹنگے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔

وہ ایک کینچلی تھی... پوری کینچلی پر چتکبرے داغ۔

یہ کیا سانپ کی کینچلی ہے؟ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہے۔ سانپ اتنا چوڑا کہاں ہوتا ہے؟ سانپ کے دونوں طرف سے کیا دو ہاتھ اور نچلے حصے سے دو پیر باہر نکلتے ہیں؟

دراصل یہ آدمی کی کینچلی ہے۔ وہ آدمی اب آدمی کی شکل میں نہیں رہ گیا ہے۔ اب وہ اس گڈھے میں کنڈلی مار کر لیٹتا ہے۔ وہ اب ناگ کے روپ میں ہے اور اس کے دانتوں میں زہر ہے۔

لو، اب اس کی سِسکاری سنائی دے رہی ہے۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔ املی بابا پکار رہے ہیں: ''بال کشن... بال کشن... بال کشن...''

Scanned with CamScanner

رتن بابو اور وہ آدمی

ٹرین سے اترنے کے بعد جب رتن بابو نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی تو ان کا دل خوشیوں سے بھر گیا۔
جگہ تو اچھی لگتی ہے۔ اسٹیشن کے پیچھے کا سکھوئے کا درخت اپنا سر اونچا کیے کھڑا ہے اور اس کی ڈال میں ایک سرخ رنگ کی پتنگ اٹکی ہوئی ہے۔ لوگ بہت مصروف بھی نہیں نظر آتے۔

ہوا میں ایک قسم کی سوندھی خوشبو ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کا ماحول بہت دلکش ہے۔

ان کے ساتھ ایک چھوٹا بستر اور چمڑے کا ایک سوٹ کیس ہے۔ قلی کی ضرورت نہیں۔ رتن بابو نے ان چیزوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا اور گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

باہر رکشا ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ دھاری دار ہاف پینٹ پہنے ہوئے چھوکرے جیسے رکشا والے نے پوچھا، ''کہاں جایئے گا بابو؟''

رتن بابو نے دریافت کیا، ''نیو مہامایا ہوٹل کہاں ہے، جانتے ہو؟''

چھوکرے نے سر ہلا کر ہامی بھری اور کہا، ''بیٹھیے۔''

گھومنا پھرنا رتن بابو کا جھکی پن ہی کہا جائے گا۔ موقع ملتے ہی وہ کلکتہ کے باہر کہیں گھومنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انھیں ہمیشہ یہ سنہرا موقع مل جاتا ہے، کیونکہ وہ نوکری کرتے ہیں۔ وہ کلکتہ کے زولاجیکل سروے آفس میں کرانی کا کام کرتے ہیں۔ چوبیس سال سے وہ اسی نوکری پر ہیں، اس لیے انھیں باہر جانے کا موقع سال میں ایک بار ہی ملتا ہے۔ پوجا کی چھٹی کے ساتھ ہی سال بھر میں ملنے والی چھٹی لے کر وہ ہر سال کہیں نہ کہیں سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتے ہیں۔ سیر سپاٹے کے معاملے میں وہ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لیتے۔ ساتھ لینے کی خواہش بھی ان کے دل میں نہیں ہوتی۔ یہ بات نہیں کہ شروع میں انھیں ساتھی کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار برابر کی میز پر بیٹھنے والے کیشو بابو سے ان کی اس موضوع پر بات چیت بھی ہوئی تھی۔ مہالیہ کے کئی دن پہلے ہی رتن بابو

Scanned with CamScanner

چھٹی لینے کا منصوبہ بنار ہے تھے۔

انھوں نے کہا تھا، ''آپ بھی تو صاحب، اکیلے آدمی ہیں۔ چلیے نا، اس بار پوجا کی چھٹی میں کہیں گھوم پھر آئیں۔''

کیشو بابو نے اپنا قلم کان میں لگا کر اپنے ہاتھوں کو جوڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا اور سر ہلا کر مسکراتے ہوے کہا تھا، ''آپ کی پسند اور میری پسند کیا ایک ہو پائے گی؟ آپ ایسی ایسی عجیب جگہوں میں جائیں گے جن کا ہمیں نام بھی نہیں معلوم۔ وہاں نہ تو کوئی قابل دید جگہ ہوگی اور نہ ہی کھانے پینے کی کوئی آسانی۔ مجھے معاف کریں، میں ہری نابھی اپنے برادر نسبتی کے یہاں جارہا ہوں۔''

آہستہ آہستہ رتن بابو کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اپنی مرضی کے مطابق دوست ملنا بے حد مشکل ہے۔ ان کی پسند ناپسند دوسروں کی پسند ناپسند سے بالکل نہیں ملتی ہے، اس لیے دوست بنانے کی امید چھوڑ ہی دینا چاہیے۔

رتن بابو کے عادت اور مزاج واقعی مختلف تو تھے۔ مثال کے طور پر آب وہوا کی تبدیلی کی بات کو ہی لے لیجیے۔ کیشو بابو نے غلط نہیں کہا تھا۔ لوگ عام طور سے آب وہوا بدلنے کے خیال سے جن جگہوں پر جاتے ہیں، رتن بابو کی نگاہ اس طرف جاتی ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں، ''ارے صاحب، یہ بات تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ پوری کے پاس ہی سمندر ہے، جگن ناتھ جی کا مندر ہے، دار جیلنگ سے کنچن جنگھا دکھائی دیتا ہے، ہزاری باغ میں پہاڑ ہیں، جنگل ہیں، رانچی کے پاس ہنڈرو فالز ہیں — اور لوگوں کے منھ سے بار بار کسی چیز کا ذکر سننے کا مطلب یہ ہوا کہ اسے دیکھ لیا۔''

رتن بابو کو جس جگہ کی تلاش رہتی ہے، وہ ہے ریلوے اسٹیشن کا کوئی چھوٹا سا شہر — بس، اتنا ہی۔ ہر سال چھٹی کے پہلے ٹائم ٹیبل کھول کر وہ ایک ایسی جگہ کا نام تلاش کرتے ہیں جو زیادہ دور نہ ہو، اور پھر وہ دُرگا کا نام لے کر نکل پڑتے ہیں۔ کہاں گئے تھے، کیا کیا دیکھا، یہ سب ان سے کوئی پوچھتا نہیں، اور وہ بھی کسی کو نہیں بتاتے۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے کہ وہ ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جس کا انھوں نے کبھی نام تک نہ سنا ہوگا، اور وہ جہاں بھی گئے ہیں وہاں انھیں ایسی چیز ضرور مل گئی ہے جس کی وجہ سے ان کا دل خوشیوں سے بھر گیا ہے۔ دوسرے لوگوں کی نظروں میں یہ سب چیزیں، ہوسکتا ہے بالکل معمولی ہوں۔ جیسے رات بھات کھاوا کا ایک بوڑھا پیپل جو ایک بیر اور ناریل کے پیڑوں سے لپٹ کر

Scanned with CamScanner

کھڑا ہے، مہیش گنج کی ایک نیل کوٹھی کا کھنڈر، مینا کی ایک مٹھائی کی دکان کی دال کی برفی . . .

اس بار رتن بابو جہاں آئے ہیں، اس جگہ کا نام سنی ہے۔ یہ قصبہ ٹاٹا نگر سے پندرہ میل دوری پر ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس جگہ کو انھوں نے ٹائم ٹیبل سے تلاش کر کے نہیں نکالا ہے۔ آفس کے قریبی دوستوں نے اس جگہ کے بارے میں بتایا تھا۔ نیو مہامایا ہوٹل کا نام بھی انھیں سے سنا تھا۔

رتن بابو کو ہوٹل پسند آیا۔ کمرہ چھوٹا ہے، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے! مشرق اور جنوب دونوں طرف کھڑکیاں ہیں۔ ان کھڑکیوں سے بہت ہی خوبصورت منظر نظر آتے ہیں۔ پنچا نام کا جو نوکر ہے، وہ سیدھا سادہ ہے۔ چاہے سردی ہو یا گرمی، رتن بابو ہر موسم میں گرم پانی سے نہاتے ہیں۔ پنچا نے انھیں دلاسا دیا کہ اس کے لیے انھیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہوٹل کا کھانا بھی ٹھیک ہی ہے اور رتن بابو بھی یہی پسند کرتے ہیں، کیونکہ کھانے پینے کا انھیں زیادہ مراق نہیں ہے۔ ان کی طرف سے بس ایک ہی مانگ رہتی ہے — بھات اور روٹی۔ یہ دو چیزیں اگر ایک ساتھ نہ ہوں تو وہ کھانا نہیں کھا سکتے۔ مچھلی کے شوربے کے ساتھ بھات اور دال سبزی کے ساتھ روٹی، یہی ان کا کھانا کھانے کا طریقہ ہے۔ ہوٹل آتے ہی انھوں نے یہ بات پنچا کو بتادی ہے اور پنچا نے یہ خبر منیجر کو دے دی ہے۔

نئی جگہ آنے پر پہلے دن ہی جب تک وہ تیسرے پہر چہل قدمی نہیں کر آتے، انھیں سکون نہیں ملتا۔ سنی آنے پر بھی اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ چار بجے پنچا کی لائی ہوئی چائے پی کر رتن بابو گھومنے پھرنے نکل گئے۔ قصبے سے باہر نکلتے ہی کھلا ہوا ناہموار میدان ملتا ہے۔ اس کے بیچ سے پگڈنڈیاں نکلتی چلی گئی ہیں۔ رتن بابو ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے جب ایک ڈیڑھ میل نکل گئے تو انھوں نے ایک بہت خوبصورت چیز ڈھونڈ نکالی۔ ایک چھوٹا سا ڈیرا ہے۔ اس میں کچھ کُمد کے پھول کھلے ہیں، اور ان کے چاروں طرف بیشمار پرندوں کا ہجوم لگا ہے۔ بگلا، ڈانک، چاہا، کوڈلا — ان پرندوں کو رتن بابو پہچانتے ہیں۔ باقی پرندوں کو انھوں نے یہاں پہلی بار دیکھا ہے۔

ہر روز تیسرے پہر اسی ڈیرے کے کنارے بیٹھ کر رتن بابو چھٹی کے باقی دن گزار سکتے ہیں۔ مگر دوسرے روز کسی دوسری چیز کی تلاش میں انھوں نے ایک نئی پگڈنڈی پکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔ ایک آدھ میل جانے کے بعد راستے میں بکریوں کا ریوڑ ملا اور انھیں اپنی چہل قدمی کچھ دیر کے لیے روکنا پڑی۔ جب راستہ خالی ہو گیا تو وہ آگے بڑھے اور تقریباً پانچ منٹ کے بعد ان کی نگاہ لکڑی کے

Scanned with CamScanner

ایک پُل پر گئی۔ کچھ دور جانے پر انھیں پتا چلا کہ وہ ایک اوور برج ہے۔ اس کے نیچے سے ریلوے کی لائن چلی گئی ہے۔ مشرق کی طرف تھوڑے فاصلے پر اسٹیشن نظر آرہا ہے، اور مغرب کی طرف آنکھیں جتنی دور جاتی ہیں، ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اچانک ابھی کوئی ریل آکر پل کے نیچے سے نکل جائے تو کتنی عجیب بات ہوگی، یہ بات سوچتے ہی رتن بابو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

رتن بابو چونکہ ایک ٹک ریل گاڑی کی پٹریوں کی طرف دیکھ رہے تھے، اس لیے کب ایک دوسرا آدمی ان کی بغل میں آکر کھڑا ہو گیا، اس کا انھیں علم ہی نہیں ہوا۔ جب انھوں نے بغل کی طرف نگاہ گھمائی تو چونک گئے۔

وہ آدمی دھوتی اور قمیص پہنے تھا۔ کندھے پر خاکی رنگ کی ایک چادر تھی، پاؤں میں کینوس کے جوتے، آنکھوں پر بائی فوکل چشمہ۔ رتن بابو کے دل میں ایک کھٹکا پیدا ہوا۔ اس آدمی کو کیا وہ اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں؟ جانا پہچانا سا نہیں لگتا کیا؟ درمیانی قد کا ہے، بدن کا رنگ بھی گورے کالے کے بیچ کا ہے، آنکھیں اُداس اور جذباتی ہیں۔ کتنی عمر ہوگی؟ پچاس سے زیادہ نہیں ہے۔ بال بہت ہی کم پکے ہیں — کم سے کم شام کی روشنی میں تو ایسا ہی لگتا ہے۔

اجنبی نے ایک ٹھنڈی ہنسی ہنس کر رتن بابو کو نمسکار کیا۔ رتن بابو ہاتھ جوڑ کر جب اسے نمسکار کرنے لگے تو اچانک یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی کہ ان کے دل میں یہ وہم کیوں پیدا ہو رہا تھا۔ یہ آدمی جو جانا پہچانا سا لگتا ہے، اس کی کوئی دوسری وجہ نہیں ہے۔ اس ڈھانچے کے چہرے کو رتن بابو بہت بار دیکھ چکے ہیں، اور دیکھا ہے تو آئینے میں ہی۔ اس بھلے آدمی سے ان کا چہرہ ہو بہو ملتا جلتا ہے۔ چوکور چہرہ، بالوں کی مانگ، مونچھوں کی شکل، ٹھوڑی کے بیچ کا گڈھا، کان کے اوپر کا حصہ — یہ سب تقریباً ایک جیسے ہیں۔ ہاں، اجنبی کے بدن کا رنگ کچھ زیادہ کالا پن لیے ہوئے ہے، بھنویں زیادہ گھنی ہیں اور سر کے پچھلے حصے کے بال کچھ زیادہ لمبے ہیں۔

اس کے بعد اجنبی کے گلے کی آواز سن کر رتن بابو اور بھی زیادہ چونک گئے۔ ایک بار محلے کے سشانت نام کے ایک لڑکے نے ان کے گلے کی آواز ٹیپ ریکارڈ میں بھر کر انھیں سنائی تھی۔ اس آواز اور اس آدمی کے گلے کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اجنبی نے کہا، "میرا نام ہے منی لال مجمدار۔ آپ نیو مہامایا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے

ہیں نا؟''

رتن لال... منی لال... نام بھی ملتے جلتے ہیں۔ رتن بابو نے حیرانی کے جذبے پر قابو پا کر اپنا تعارف کرایا۔

اجنبی نے کہا، ''شاید آپ مجھے پہچان نہیں پا رہے ہیں، مگر میں اس کے پہلے بھی آپ کو دیکھ چکا ہوں۔''

''کہاں؟''

''آپ پچھلی پوجا کی چھٹی میں دھلیان نہیں گئے تھے؟''

رتن بابو نے حیران ہو کر کہا، ''آپ بھی وہاں گئے تھے؟''

''جی ہاں، میں ہر بار پوجا کی چھٹی میں کہیں نہ کہیں جاتا ہوں۔ اکیلا آدمی ہوں، دوست احباب بھی زیادہ نہیں ہیں۔ اکیلے ہی نئی نئی جگہوں کا سیر سپاٹا کرنا بہت اچھا بھی لگتا ہے۔ سنی کے بارے میں میرے آفس کے ایک ساتھی نے مجھے بتایا تھا۔ بہت ہی اچھی جگہ ہے۔ کیسے، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

رتن بابو نے تھوک نگل کر سر ہلاتے ہوئے ہامی بھری۔ اب کچھ دیسی پرندے بھی وہاں جمع ہو گئے ہیں۔

''کچھ ایسے پرندے بھی دیکھے جنھیں بنگال میں نہیں دیکھا تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

اتنی دیر میں رتن بابو کچھ سنبھل گئے تھے۔ بولے، ''میرا بھی یہی خیال ہے، میں بھی بہت سے پرندوں کو نہیں پہچان سکا تھا۔''

دور سے ایک دھمک سی سنائی دے رہی ہے۔ ریل آ رہی ہے۔ مشرق کی طرف دیکھنے پر ہیڈ لائٹ دکھائی دی۔ روشنی آہستہ آہستہ بڑی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ رتن بابو اور منی لال بابو پل کی ریلنگ کے کنارے جا کر کھڑے ہو گئے۔ تیز آواز کرتی، پل کو دہلاتی ہلاتی، ریل دوسرے کنارے کی طرف چلی گئی۔ دونوں آدمی پیدل چل کر پل کی دوسری طرف بڑھ گئے اور اس وقت تک ریل کو دیکھتے رہے جب تک کہ وہ آنکھوں کے سامنے سے غائب نہ ہو گئی۔ رتن بابو کے دل میں بچوں جیسا سنسنی خیز جذبہ جاگ گیا ہے۔ منی لال بابو نے کہا، ''حیرت ہے! اتنی عمر ہو گئی، پھر بھی

ریل گاڑی دیکھنے کا تجسس دل سے دور نہیں ہوا!''

لوٹتے وقت رتن بابو کو معلوم ہوا کہ منی بابو کو سنی آئے تین روز ہوئے ہیں اور وہ کالکا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کلکتہ میں ہی ان کا آبائی مکان ہے اور وہ وہیں کے ایک بزنس آفس میں کام کرتے ہیں۔ عام طور سے لوگ ایک دوسرے سے تنخواہ کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کرتے ہیں مگر رتن بابو نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ ہی بیٹھے۔ جواب سن کر ان کا ماتھا پسینے سے بھیگ گیا۔ کیا یہ ممکن ہے؟ منی لال اور رتن بابو کو بالکل ایک جتنی تنخواہ ملتی ہے — دونوں میں سے ہر ایک کو چار سو پینتیس روپے۔ پوجا میں دونوں کو بونس بھی ایک جتنا ملا ہے۔

یہ آدمی پہلے سے ہی رتن بابو کے بارے میں سب کچھ پتا لگا کر ان کے ساتھ چالبازی کر رہا ہے، رتن بابو کو ایسا محسوس نہیں ہوا۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کی روزمرہ کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے، اس پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا ہے۔ وہ اپنی رو میں زندگی جی رہے ہیں۔ آفس کے باہر نوکر کے علاوہ کسی دوسرے سے بات تک نہیں کرتے، کبھی کسی کے گھر جا کر اڈے بازی نہیں کرتے۔ اگر یہ مان بھی لیں کہ تنخواہ کے بارے میں باہری لوگوں کو معلوم ہے تو رات میں وہ کب سوتے ہیں، کیا کھانا پسند کرتے ہیں، کون سا اخبار پڑھتے ہیں، کون سا تھیٹر یا بنگالی سنیما ابھی حال میں انھوں نے دیکھا ہے — یہ سب باتیں ان کے علاوہ کسی دوسرے کو معلوم نہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں اس بھلے آدمی سے ہو بہو مل رہی ہیں۔ رتن بابو یہ بات منھ کھول کر منی لال بابو کو نہیں کہہ سکے۔ راستے بھر وہ صرف منی لال بابو کی باتیں سنتے رہے اور اپنے ساتھ اس کی مشابہت پا کر بار بار حیران ہوتے رہے۔ اپنے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں بتایا۔

رتن بابو کا ہوٹل پہلے آتا ہے۔ ہوٹل کے سامنے آ کر منی لال بابو نے پوچھا، ''آپ کے یہاں کھانا کیسا ملتا ہے؟''

رتن بابو نے کہا، ''مچھلی کا شوربہ اچھا ہوتا ہے۔ باقی سب بس چالو کہہ لیجیے۔''

''میرے ہوٹل میں اچھا کھانا نہیں ملتا ہے۔ سنا ہے، یہاں جگن ناتھ مشٹھان بھنڈار میں بہت عمدہ کچوریاں اور چنے کی دال ملتی ہے۔ آج رات وہیں کھانا کھایا جائے تو کیسا رہے؟''

رتن بابو نے کہا، ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آٹھ بجے چلا جائے؟''

Scanned with CamScanner

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔ اس کے بعد ایک ساتھ چلیں گے۔''

منی لال بابو کے چلے جانے کے بعد رتن بابو ہوٹل کے اندر جانے کے بجائے کچھ دیر تک راستے پر ہی چہل قدمی کرتے رہے۔ شام ڈھلنے لگی ہے۔ آسمان صاف ہے، اتنا صاف کہ تاروں کے بیچ سے گزرتی ہوئی کہکشاں بھی صاف صاف نظر آرہی ہے۔ حیرت ہے، اتنے دنوں تک رتن بابو کو یہی دُکھ تھا کہ انھیں کوئی ایسا دوست نہ ملا جس سے ان کا دل اور خیالات ملتے ہوں؛ لیکن سنی آنے پر اچانک ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوگئی جسے ان کا ڈپلیکیٹ ہی کہا جاسکتا ہے۔ چہرے میں تھوڑا بہت فرق ہے پھر بھی عادت، مزاج اور فطرت میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ایسی مماثلت جڑواں بھائیوں میں بھی ملنا مشکل ہوتی ہے۔

اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ اتنے دنوں کے بعد دوست کی کمی پوری ہوگئی؟

رتن بابو کو اس بات کا جواب فوراً نہیں ملا۔ منی لال بابو سے تھوڑا اور ملنے جلنے سے، ہوسکتا ہے یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے۔ ایک چیز وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے، اور وہ یہ کہ ان کے اکیلے پن کی کمی دور ہوگئی ہے۔ اس دنیا میں انھیں کے جیسا ایک آدمی اتنے عرصے سے موجود تھا اور اب اس سے اچانک ملاقات ہوگئی۔

جگن ناتھ مشٹھان بھنڈار میں میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے رتن بابو نے غور کیا کہ منی لال بابو بھی انھیں کی طرح چاٹ پونچھ کر کھانا پسند کرتے ہیں، انھیں کی طرح کھانا کھاتے کھاتے پانی پیتے ہیں، انھیں کی طرح کاغذی لیموں دال میں نچوڑ لیتے ہیں۔ سب کچھ کھانے کے بعد رتن بابو دہی کھاتے ہیں۔ منی لال بابو کے ساتھ بھی یہی بات ہے۔

کھانا کھاتے وقت رتن بابو کو اس لیے بے چینی محسوس ہورہی تھی کیونکہ دوسری میزوں کے لوگ مڑ مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ لوگ کیا ان دونوں کی مشابہت کو اتنے غور سے دیکھ رہے ہیں؟ یہ دونوں کیا اس حد تک ایک دوسرے سے ملتے ہیں کہ لوگوں کی توجہ ان کی طرف مائل ہوجاتی ہے؟

کھانا کھانے کے بعد رتن بابو اور منی لال بابو چاندنی رات میں کچھ دیر تک چہل قدمی کرتے رہے۔ ایک سوال رتن بابو کے دماغ میں بہت دیر سے گھوم رہا تھا، بات چیت کے دوران وہ باہر نکل

Scanned with CamScanner

آیا، ''آپ کیا پچاس پار کر چکے ہیں؟''

منی لال بابو نے ہنس کر کہا، ''جلد ہی پچاس سال پورے کرنے جا رہا ہوں۔ پوس کی گیارھویں تاریخ کو پچاس کمپلیٹ ہو جائے گا۔''

رتن بابو کا دماغ چکرانے لگا۔ دونوں کی پیدائش کی تاریخ بھی ایک ہی ہے — 1916 کے پوس مہینے کی گیارھویں۔ آدھے گھنٹے تک چہل قدمی کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہوتے وقت منی لال بابو نے ہنس کر کہا، ''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں کسی سے گھلتا ملتا نہیں ہوں، مگر آپ کے ساتھ کچھ اور ہی بات ہے۔ لگتا ہے چھٹی مزے میں گزرے گی۔''

رتن بابو دس بجے سے پہلے ہی سو جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ بنگلہ زبان کے دو چار ماہوار رسالے لے کر لیٹے لیٹے جب ان کی ورق گردانی کرتے ہیں تو نیند خود بخود آ جاتی ہے۔ لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بٹن دبا کر بتی بجھا دیتے ہیں اور چند پلوں میں ہی ان کے خراٹے گونجنے لگتے ہیں۔ مگر آج نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پڑھنے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ رسالے کو ہاتھ میں اٹھا کر پھر سے بغل کی میز پر رکھ دیا۔

منی لال مجومدار... رتن بابو نے کہاں پڑھا تھا کہ دنیا میں کروڑوں آدمی ہیں، پھر بھی کہیں ایسے دو آدمی نہیں مل سکتے جن کے چہرے ہو بہو ایک جیسے ہوں، حالانکہ سبھی کی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ پیر وغیرہ کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ چہرے کا ایک جیسا ہونا ہو سکتا ہے ناممکن ہو، لیکن دو لوگوں کے دل کا ایک جیسا ہونا کیا ممکن ہے؟ دل ہی نہیں، عمر، پیشہ، گلے کی آواز، چلنے اور بیٹھنے کا انداز، آنکھوں کی عینک کا پاور وغیرہ، اور بھی بہت سے چیزیں ہو بہو ایک جیسی ہیں۔ سوچنے پر محسوس ہوتا ہے ناممکن ہے، مگر ممکن ہو گیا ہے، اور اس کا ثبوت پچھلے چار گھنٹوں کے دوران رتن بابو کو کئی بار مل چکا ہے۔

رات بارہ بجے رتن بابو نے بستر سے اٹھ کر صراحی سے چلو میں تھوڑا سا پانی لے کر اسے اپنے سر پر ڈالا۔ ان۔ سر چکرانے لگا ہے۔ اس حالت میں نیند نہیں آئے گی۔ گیلے سر کو انگوچھے سے آہستہ سے پونچھا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئے۔ تکیہ بھیگ گیا۔ اچھی ہی بات ہے۔ جب تک تکیہ سوکھ نہیں جاتا ہے، ماتھا ٹھنڈا رہے گا۔

پورے محلے میں سناٹا چھایا ہوا ہے ایک الو ڈراونی آواز میں چلاتا ہوا ہوٹل کے قریب سے

Scanned with CamScanner

اڑتا ہوا چلا گیا۔ کھڑکی سے چاندنی آ کر بستر پر رینگ رہی ہے۔ نہ جانے کب رتن بابو کے دل سے فکر اپنے آپ دور ہوگئی اور ان کی پلکیں جھپک گئیں۔

رات کو دیر سے سونے کے باعث رتن بابو کی نیند صبح آٹھ بجے ٹوٹی۔ نو بجے منی لال بابو آنے والے ہیں۔ آج منگل کا دن ہے۔ یہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر آج ایک جگہ پر ہاٹ لگے گا۔ کل کھانا کھاتے ہوئے دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ہی ہاٹ جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ خریدنا کوئی خاص چیز نہیں ہے، بس یوں ہی گھوم پھر آئیں گے۔

چائے پیتے پیتے نو بج گئے۔ سامنے رکھی طشتری سے تھوڑی سی سونف اٹھا کر رتن بابو نے منھ میں ڈالی اور ہوٹل سے باہر آتے ہی دیکھا، منی لال بابو مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔

قریب آتے ہی منی لال بابو نے پہلی جو بات کہی وہ یہ کہ رتن بابو اور ان میں کتنی مشابہت ہے! یہی بات سوچتے سوچتے کل رات وہ بہت دیر سے سوئے تھے۔ جب سو کر اٹھے تو آٹھ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ یوں وہ ٹھیک چھ بجے بستر سے اٹھ جاتے ہیں۔

رتن بابو نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں ہاٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ محلے کے کچھ چھوکروں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ رتن بابو اور منی بابو ان کے سامنے سے جانے لگے تو ان میں سے ایک نے طنز کے لہجے میں کہا، ''مانِک ملتا کی جوڑی ہے۔'' رتن بابو اس کی بات کو ٹالتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تقریباً بیس منٹ میں وہ ہاٹ پہنچ گئے۔

کافی اچھا ہاٹ لگا ہے۔ پھل پھول سے لے کر ساگ سبزی، برتن، مٹی کی ہانڈی، مرغوں اور بکروں وغیرہ کی دکانیں سجی ہوئی ہیں۔ لوگوں کی بھیڑ بھی کافی ہے۔ اسی بھیڑ کے بیچ سے دکانوں پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے رتن بابو اور منی لال بابو آگے بڑھتے گئے۔

وہ کون ہے؟ پنچا؟ نہ جانے کیوں رتن بابو نے اس بھیڑ کے سامنے اپنے ہوٹل کے نوکر کو دیکھ کر اپنی آنکھیں جھکا لیں اور اپنے چہرے کو بھیڑ کی اوٹ میں چھپا لیا۔ اس چھوکرے کی ''مانک ملتا کی جوڑی'' کی بات سننے کے بعد سے ہی ان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر لوگ دل ہی دل میں ہنستے ہیں۔

بھیڑ کے بیچ سے گزرتے ہوئے رتن بابو کے دل میں اچانک ایک خیال آیا۔ انھیں لگا کہ وہ

Scanned with CamScanner

جب تنہا تھے تو زیادہ بہتر تھے۔ انھیں دوست کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر دوست ہو بھی تو وہ منی لال بابو کی طرح نہ ہو۔ وہ منی لال بابو سے جتنی بار گفتگو کرتے ہیں، اتنی بار انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ سوال کرنے سے اس کا جواب کیا ملے گا، یہ بات جیسے انھیں پہلے سے ہی معلوم ہو۔ بحث کرنے کا کوئی موقع نہیں آتا، سوچ بچار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، جھگڑے جھنجھٹ کا کوئی امکان نہیں ہے— کیا یہ دوستی کی نشانی ہے؟ ان کے دفتر کے کارتک رائے اور مکند چکرورتی میں گہری دوستی ہے۔ مگر ایسا ہونے پر بھی کیا دونوں میں بحث مباحثہ نہیں ہوتا ہے؟ ہوتا ضرور ہے، مگر پھر بھی وہ دوست ہیں— ایک دوسرے کے سچے دوست۔

ساری باتوں پر غور کرنے کے بعد انھیں بار بار یہی محسوس ہونے لگا کہ منی لال مجومدار اگر ان کی زندگی میں نہ آتے تو اچھا رہتا۔ ایک جیسے دو آدمی اگر اس دنیا میں ہوں تو ان کا ایک دوسرے کے قریب آنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سِنی سے کلکتہ لوٹ جانے پر بھی منی لال بابو سے ملاقات ہو سکتی ہے، یہ بات سوچتے ہی رتن بابو کانپ اٹھتے۔

ایک دکان میں بانس کی لاٹھی بک رہی تھی۔ رتن بابو کی بہت دنوں سے لاٹھی خریدنے کی خواہش تھی، مگر منی لال بابو کو سودے بازی کرتے دیکھ کر زبردستی اپنی خواہش کو دل میں ہی دبا لیا۔ آخر میں دیکھنے میں یہ آیا کہ منی لال بابو نے ایک کے بجائے دو لاٹھیاں خریدیں اور ان میں سے ایک رتن بابو کو بطور تحفہ پیش کی۔ تحفہ دیتے وقت کہا، ''امید ہے کہ یہ معمولی لاٹھی دوستی کی نشانی کے طور پر لینے سے آپ انکار نہیں کریں گے۔''

ہاٹ سے لوٹتے وقت منی لال بابو نے بہت سی باتیں بتائیں۔ اپنے بچپن کی بات، اپنے ماں باپ کی بات، اپنے اسکول کالج کی بات— سنتے وقت رتن بابو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی باتیں کوئی دھڑلے سے انھیں ہی سنا رہا ہے۔

تیسرے پہر چائے پی کر جب وہ دونوں میدان کے بیچ پگڈنڈی سے ہو کر پل کی طرف جا رہے تھے تو رتن بابو کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ انھیں زیادہ بولنا نہیں پڑ رہا تھا، اس لیے ان کا دماغ اچھی طرح کام کر رہا تھا۔ دوپہر سے ہی انھیں لگ رہا تھا کہ اس آدمی کو اگر دور ہٹا سکوں تو اچھا رہے، مگر دماغ میں کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی۔ اسی لمحے آسمان کے کالے بادلوں پر نگاہ پڑتے ہی رتن بابو کی

Scanned with CamScanner

آنکھوں کے سامنے یہ ترکیب آگئی۔

حیرت ہے! ایک آدمی کو قتل کرنے کی بات سوچ کر بھی رتن بابو خود کو قصوروار نہیں مان سکے۔ منی لال بابو میں اگر کوئی خصوصیت ہوتی، یہاں تک کہ ان کی عادت واطوار رتن بابو سے اگر ذرا بھی مختلف ہوتے، تو رتن بابو ان کو قتل کرنے کی بات نہیں سوچ سکتے تھے۔ رتن بابو کو یقین ہوگیا ہے کہ ایک ہی طرح کے دو آدمیوں کا ایک ساتھ زندہ رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ وہ ہیں اور وہی رہیں گے، یہی کافی ہے۔ منی لال بابو اگر زندہ رہ کر بھی ان سے دور رہتے، جیسے کہ کچھ دن پہلے تک تھے، تو انھیں کوئی اعتراض نہ تھا، مگر اب اس جان پہچان کے بعد ایسا ہونا ناممکن ہے، اس لیے انھیں دور ہٹا دینا نہایت ضروری ہے۔

دونوں آدمی اوور برج پر پہنچ چکے تھے۔

''بڑی ہی اُمس ہے،'' منی لال بابو نے کہا، ''رات میں بارش ہوسکتی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ کہ کل کڑاکے کی سردی پڑے گی۔''

اس بیچ رتن بابو نے ایک بار اپنی گھڑی کی طرف نگاہ ڈالی — چھ بجنے میں بارہ منٹ باقی ہیں۔ ریل ٹھیک وقت پر آتی جاتی ہے، اب دیر نہیں ہے۔ رتن بابو نے اپنی بے چینی کو چھپانے کے لیے جماہی لی اور کہا، ''ابھی چار پانچ گھنٹے تک بارش ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔''

''سپاری کھائیں گے؟''

منی لال بابو نے جیب سے ٹین کی ایک گول ڈبیا نکالی اور اس کے ڈھکن کو کھول کر رتن بابو کی طرف بڑھائی۔ رتن بابو کی جیب میں بھی ایک ڈبیا میں سپاری تھی؛ اس ڈبیا کو جیب سے نکالے بغیر، اور اس کی بابت کچھ کہے بغیر، انھوں نے منی لال بابو کی ڈبیا سے سپاری کا ایک ٹکڑا نکال کر منھ میں ڈال لیا۔

اور عین اسی وقت ریل کی آواز سنائی دی۔

منی لال بابو نے ریلنگ کے پاس جا کر گھڑی کی طرف دیکھا اور کہا، ''سیون منٹ بی فور ٹائم۔''

مغرب کی طرف گھٹا چھائی ہونے کی وجہ سے آج اور دنوں کی بہ نسبت اندھیرا ہے، اس لیے

ہیڈ لائٹ کی روشنی زیادہ اجلی لگ رہی ہے۔ ریل اب بھی کافی دور ہے، اور ہاں، روشنی کا حجم جلدی جلدی بڑھتا جا رہا ہے۔ لگاتار دیکھا جائے تو آنکھوں میں پانی بھر آئے۔

ایک آدمی سائیکل پر سوار ہو کر سڑک سے پل کی طرف آ رہا ہے۔ بڑی مصیبت ہے یہ آدمی — یہاں رکنے والا ہے کیا؟

رتن بابو کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ وہ آدمی ان لوگوں کے پاس سے ہوتا ہوا، آندھی کی طرح سائیکل چلاتا ہوا، مخالف سمت کے راستے پر شام کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ ریل گاڑی تیز رفتار سے چلی آ رہی ہے۔ آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی ہیڈ لائٹ میں فاصلے کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اب کچھ ہی پلوں کے بعد اوور برج کانپنے لگے گا۔ ریل کی آواز سے کان کا پردہ پھٹا جا رہا ہے۔

منی لال بابو ریلنگ پکڑ کر ریل کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ایک بار بجلی چمکی اور اس کے ساتھ ہی رتن بابو نے اپنی پوری طاقت لگا کر دونوں ہاتھوں سے منی لال بابو کی پشت پر ایک دھکا دیا۔ منی لال بابو کا جسم دو ہاتھ اونچی لکڑی کی ریلنگ کے اوپر سے ہوتا ہوا سیدھا ریل کی پٹریوں کی طرف چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت رتن بابو کو محسوس ہوا کہ اوور برج تھرتھرانے لگا ہے۔

آج رتن بابو نے ریل گزرنے کے منظر کو دیکھنے کا انتظار نہیں کیا۔ لکڑی کے برج کی طرح ہی ان کے اندر ایک تھرتھراہٹ شروع ہو گئی ہے۔ مغرب کی طرف گھٹا بہت آگے تک چلی آئی ہے اور بیچ بیچ میں بجلی چمک رہی ہے۔

رتن بابو نے شال کو اچھی طرح لپیٹ لیا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

بارش کے پہلے جھونکے کو نظر انداز کرنے کی ناکام کوشش میں رتن بابو نے باقی راستے کو دوڑتے دوڑتے طے کیا اور ہانپتے ہوئے ہوٹل پہنچے۔

اندر جاتے ہی انھیں شک ہوا۔

وہ کہاں آ گئے! مہامایا ہوٹل کے سامنے ایسا مکان نہیں تھا۔ اس طرح کی میز، اس طرح کی کرسیوں کی سجاوٹ، دیوار پر اس طرح کی تصویر۔ ۔ ۔!

اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اچانک ان کی نگاہ لکڑی کے ایک بورڈ پر گئی۔ باپ رے، ان سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی ہے! وہ تو کالکا ہوٹل کے اندر آ گئے ہیں۔ یہیں منی لال بابو ٹھہرے ہوئے تھے نا؟

Scanned with CamScanner

بارش نے انھیں بھگو دیا کیا؟

کسی آدمی نے ان سے کچھ پوچھا۔ رتن بابو نے مڑ کر دیکھا، ایک آدمی ہے جس کے گھنگھرالے بال ہیں، بدن پر ہرے رنگ کی شال ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اسی ہوٹل کا رہنے والا ہے۔ وہ ان کی طرف منھ کیے چائے کی پیالی لیے بیٹھا ہوا ہے۔ رتن بابو کے چہرے پر نگاہ پڑنے کے بعد اس نے ذرا گھبراہٹ کے ساتھ کہا، ''سوری! غلطی ہوگئی۔ آپ پر اچانک نگاہ پڑی تو لگا، منی لال بابو ہیں۔''

اس سوال سے ان کے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ انھوں نے جو قتل کیا ہے، وہ ہر پہلو سے سوچ سمجھ کر اور پوری ہوشیاری برتتے ہوئے کیا ہے یا نہیں۔ وہ دونوں ایک ساتھ نکلے تھے، بہت سے لوگوں نے ہوسکتا ہے دیکھا ہو، مگر دیکھنا ہی کیا، غور سے دیکھنا اہم ہے۔ جنھوں نے دیکھا ہوگا، انھیں کیا یہ بات یاد ہوگی؟ اور اگر یاد ہو بھی تو کیا ان پر شک کریں گے؟ ہاٹ سے نکلنے کے بعد جب وہ کھلے راستے پر آئے تھے انھیں کسی نے نہیں دیکھا تھا، یہ بات رتن بابو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور اس اوور برج پر پہنچنے کے بعد... اوہ، ہاں... اس سائیکل والے نے انھیں ضرور ہی دیکھا ہوگا۔ مگر تب گہرا اندھیرا اتر آیا تھا، اس طرح تیزی سے سائیکل چلاتے ہوئے اس آدمی نے کیا ان کا چہرہ پہچان لیا ہوگا؟ اور پہچان کر یاد رکھا ہوگا؟ ناممکن بات ہے۔

رتن بابو نے اس موضوع پر جتنا زیادہ سوچا وہ اتنا زیادہ مطمئن ہو گئے۔ منی لال بابو کی لاش ضرور ہی برآمد ہوگی۔ مگر اس کی وجہ سے رتن بابو پر شک ہوگا، معاملے پر غور کیا جائے گا، انھیں خونی مان کر پھانسی کی سزا دی جائے گی ــ ان باتوں پر رتن بابو کو قطعی یقین نہیں ہوا۔

باہر بارش ہوتے دیکھ کر رتن بابو نے کالکا ہوٹل میں بیٹھ کر ایک پیالی چائے پی۔ ساڑھے سات بجتے بجتے بارش تھم گئی۔ رتن بابو سیدھے مہامایا چلے آئے۔ کس طرح غلطی سے وہ دوسرے ہوٹل میں چلے گئے تھے، اس پر سوچتے ہی انھیں ہنسی آنے لگی۔

رات میں پیٹ بھر کھانا کھا کر رتن بابو بستر پر لیٹ گئے اور دیش رسالہ کھول کر آسٹریلیا کی جنگلی ذاتوں کے بارے میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کے بعد بتی بجھا کر اطمینان کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں۔ اب پھر وہ اکیلے ہیں اور ان کی طرح کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ان کا کوئی ساتھی نہیں ہے اور نہ

Scanned with CamScanner

اس کی کوئی ضرورت ہی ہے۔ وہ اتنے عرصے سے جس طرح زندگی گزار رہے تھے، اسی طرح زندگی گزاریں گے۔ اس سے بڑھ کر آرام اور کیا ہو سکتا ہے؟

باہر پھر سے بارش ہونے لگی ہے۔ اس کے ساتھ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ رتن بابو کے خراٹے گونجنے لگے ہیں۔

دوسرے روز جب وہ چائے پی رہے تھے تو پنچانے پوچھا: ''یہ لاٹھی کل ہاٹ میں خریدی ہے کیا بابو؟''

رتن بابو نے کہا: ''ہاں۔''

''قیمت کتنی ہے؟''

رتن بابو نے اس کے دام بتائے۔ اس کے بعد اپنے لہجے کو عام اور فطری سا بنا کر کہا: ''تم ہاٹ گئے تھے؟''

پنچانے ہنستے ہوئے جواب دیا: ''ہاں بابو، آپ کو بھی دیکھا تھا۔ آپ کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی؟''

''نہیں۔''

اس کے بعد پنچا سے ان کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

چائے پی کر وہ ہوٹل سے باہر نکلے اور پیدل چلتے ہوئے کالکا ہوٹل کے پاس آئے۔ کل کا وہی گھنگھرالے بالوں والا آدمی کچھ بنگالیوں کے ساتھ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا ہو کر بات چیت کر رہا تھا۔ منی لال بابو کا نام اور 'خودکشی' لفظ رتن بابو کو سنائی دیا۔ اچھی طرح سننے کی غرض سے وہ تھوڑا اور آگے بڑھ گئے۔ اتنا ہی نہیں، ایک سوال بھی پوچھ لیا۔

''کس نے خودکشی کر لی صاحب؟''

کل والے آدمی نے کہا: ''کل آپ کو دیکھ کر جن آدمی کا مجھے گمان ہوا تھا، انھوں نے ہی۔''

''خودکشی؟''

''لگتا تو یہی ہے۔ ریل گاڑی کے پاس لاش ملی ہے۔ ایک اوور برج ہے، ٹھیک اسی کے نیچے۔ لگتا ہے اوپر سے چھلانگ مار کر کود پڑے ہیں۔ وہ یوں بھی عجیب قسم کے تھے۔ کسی سے زیادہ

بات چیت نہیں کرتے تھے۔ ہم اُن پر اکثر جملے بازی کیا کرتے تھے۔''

''لاش کہاں ہے؟''

''پولیس کے ذمے۔ آب وہوا بدلنے کے خیال سے آئے تھے۔ یہاں ان کا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ کلکتہ سے آئے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہے۔''

رتن بابو نے ہمدردانہ انداز میں دوبار سر ہلا کر ''چچ چچ'' کی آواز نکالی اور اس کے بعد پھر سے چہل قدمی شروع کر دی۔

خودکشی... یعنی قتل کی بات کسی کے دماغ میں نہیں آئی ہے۔ ان کی تقدیر کتنی اچھی ہے! پھر قتل کرنا تو بہت ہی آسان کام ہے! لوگ اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟

رتن بابو بہت ہلکا پن محسوس کرنے لگے۔ دو دنوں کے بعد وہ آج پھر اکیلے گھومنے کے لیے باہر جاسکیں گے، یہ بات سوچ کر انھیں بہت خوشی ہوئی۔

کل منی لال بابو کو دھکا دیتے وقت رتن بابو کا ایک بٹن ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ درزی کی دکان پر جا کر انھوں نے اسے ٹکوا لیا۔ اس کے بعد منیہاری کی دکان پر جا کر نیم کا ٹوتھ پیسٹ خریدا۔ نہیں خریدتے تو کل صبح دانت صاف نہ کر پاتے۔ ابھی جو ٹوتھ پیسٹ ان کے پاس ہے، دبتے دبتے وہ چپٹا ہو کر آخری حالت میں پہنچ چکا ہے۔

دکان سے نکل کر کچھ دور جاتے ہی انھیں ایک مکان سے کیرتن کی آواز سنائی دی۔ رتن بابو تھوڑی دیر تک رک کر کیرتن سنتے رہے۔ اس کے بعد شہر کے باہر کی ایک نئی سڑک کو پکڑ کر ایک آدھ میل کا چکر کاٹتے رہے۔ اس کے بعد گیارہ بجے ہوٹل لوٹ کر نہائے دھوئے اور کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

اور دنوں کی طرح تین بجے ان کی آنکھ کھلی اور آنکھ کھلتے ہی رتن بابو کو لگا کہ ان کا دل چاہ رہا ہے کہ آج شام ایک بار پھر اوور برج کی طرف گھومنے جائیں۔ کل تو وہ، ظاہر ہے کہ بہر حال ریل کے نظارے کا لطف نہ اٹھا سکے تھے۔ آسمان سے بادل چھٹے نہیں تھے مگر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آج بارش کی کوئی امید نہیں ہے۔ آج وہ ریل کو آنے سے لے کر جانے کے وقت تک دیکھتے رہیں گے۔

پانچ بجے رتن بابو چائے پی کر نیچے آئے۔ سامنے ہی منیجر شمبھو بابو بیٹھے ہوئے ملے۔ رتن بابو پر

Scanned with CamScanner

نظر پڑتے ہی بولے، ’’کل جس آدمی کی موت ہوئی اس سے آپ واقف تھے؟‘‘

شروع میں بغیر کچھ بولے رتن بابو نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے شمبھو بابو کی طرف دیکھا، اس کے بعد پوچھا، ’’کیوں، بات کیا ہے؟‘‘

’’نہیں، وہ... یعنی، پنچانے بتایا کہ ہاٹ میں اس نے آپ دونوں کو ایک ہی ساتھ دیکھا تھا۔‘‘

رتن بابو نے ذرا مسکرا کر پرسکون لہجے میں جواب دیا، ’’یہاں میری کسی سے واقفیت نہیں ہے۔ ہاٹ میں البتہ دو چار آدمیوں سے گفتگو ضرور ہوئی تھی، مگر کس آدمی کی موت ہوئی ہے، اس بات کا مجھے علم نہیں۔‘‘

’’اوہ!‘‘ شمبھو بابو ہنس پڑے۔ ’’بڑا ہی دلچسپ آدمی تھا۔ آپ کی طرح ہی آب وہوا بدلنے کے خیال سے یہاں آیا تھا۔ کالکا ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔‘‘

’’اوہ، یہ بات ہے!‘‘

اس کے بعد رتن بابو بغیر کچھ کہے باہر نکل آئے۔ تقریباً دو میل راستہ طے کرنا ہے، اب دیر کرنے سے ریل نہیں دیکھ پائیں گے۔

راستے میں کسی نے ان پر مشکوک نگاہ نہیں ڈالی۔ کل جن چھوکروں کا جمگھٹ لگا تھا، آج ان میں سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ ’’مانک ملتا کی جوڑی‘‘ والی بات رتن بابو کو اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ لڑکے کہاں چلے گئے؟ رتن بابو کو ڈھول کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ لڑکے ضرور ہی وہیں گئے ہوں گے۔

رتن بابو اطمینان کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔

کھلے میدان کے بیچ کے راستے پر آج وہ اکیلے ہی ہیں۔ منی لال بابو سے جان پہچان ہونے کے پہلے بھی وہ اطمینان سے رہتے تھے، لیکن آج وہ جتنا ہلکا پن محسوس کر رہے ہیں، اس کے پہلے کبھی اتنا ہلکا پن محسوس نہیں کیا تھا۔

وہ ببول کا پیڑ نظر آرہا ہے۔ اس کو پار کرنے کے بعد کچھ منٹوں تک چلنا پڑے گا اور تب اوور برج ملے گا۔ آسمان میں چاروں طرف گھٹا چھائی ہے۔ ہاں گھٹا کا رنگ گہرا کالا نہیں، بلکہ سلیٹی ہے۔ ہوا نہیں ہے، اس لیے تمام بادل ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اوور برج پر نگاہ پڑتے ہی رتن بابو کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھانے لگے، کہا نہیں جا سکتا، ریل کہیں وقت سے پہلے نہ آ جائے! سر کے اوپر سے بگلوں کا ایک غول اڑ کر چلا گیا۔ پتا نہیں بدیسی بگلے ہیں یا اسی دیس کے۔

پل پر کھڑے ہونے کے بعد رتن بابو کو شام کے سناٹے کا بھرپور احساس ہوا۔ خوب ہوشیاری سے، غور سے سننے پر ہی ڈھول کی ہلکی کی سی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری آواز نہیں ہے۔

رتن بابو ریلنگ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ دور سگنل دکھائی دے رہا ہے اور اس سے بھی دور اسٹیشن ریلنگ کے نچلے حصے میں لکڑی کی دراڑ میں کوئی چیز چمک رہی ہے۔ رتن بابو نے جھک کر اس چیز کو اٹھایا۔ وہ ایک گول ٹین کی ڈبیا ہے۔ اس کے اندر الائچی اور سپاری ہے۔ رتن بابو نے تھوڑا مسکرا کر اسے پل کے نیچے ریلوے لائن پر پھینک دیا۔ ٹھن سے آواز ہوئی — پتا نہیں سپاری کی یہ ڈبیا وہاں کتنے دنوں تک پڑی رہے گی۔

یہ کس چیز کی روشنی ہے؟

ریل آ رہی ہے۔ ابھی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے، مگر روشنی آگے بڑھتی ہوئی آ رہی ہے۔

رتن بابو حیران ہو کر روشنی دیکھنے لگے۔ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا ہے اور ان کے شانے پر سے شال نیچے گر جاتی ہے۔ رتن بابو اسے پھر بدن سے لپیٹ لیتے ہیں۔

اب ریل کی آواز سنائی دے رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بادلوں کی گڑگڑاہٹ۔ اب ریل کی طرف سے آنکھیں ہٹانا مشکل ہے، پھر بھی انھوں نے اپنے آس پاس نظر ڈالی۔ کہیں کوئی نہیں ہے۔ کل کے مقابلے میں آج اندھیرا کم ہے، اس لیے دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی ہے۔ تیز رفتار سے آتی ہوئی اس لمبی چوڑی ریل اور رتن بابو کے علاوہ ایک آدھ میل کے دائرے میں شاید اور کوئی نہیں ہے۔

ابھی ریل ایک سو گز کے بیچ ہی ہوگی۔ رتن بابو ریلنگ کی طرف تھوڑا اور بڑھ گئے۔ پہلے کے زمانے کا بھاپ کا انجن ہوتا تو اتنا آگے بڑھنا مشکل ہوتا، آنکھ اور منھ میں کوئلے کا دھواں بھر جاتا۔ یہ

Scanned with CamScanner

ڈیزل ٹرین ہے، اس لیے اس سے دھواں نہیں نکلتا۔ بس، چھاتی کو دہلا دینے والی گمبھیر سی آواز ہے اور آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی ہیڈ لائٹ۔

اب ریل برج کے نیچے آچکی ہے۔

رتن بابو کہنیوں کے بل سامنے کی طرف جھک گئے۔ اور ٹھیک اسی لمحے پیچھے سے دو ہاتھوں نے ان کی پشت کو زور سے ڈھکیل دیا۔

رتن بابو اس دھکے کو برداشت نہیں کر سکے، کیونکہ ریلنگ صرف دو ہاتھ ہی اونچی تھی۔

میل ٹرین آواز کرتی، پل کو ہلاتی اور دہلاتی، مغرب کی جانب، جہاں کے آسمان کا رنگ اب سُرخی مائل ہو چکا تھا، چلی گئی۔

رتن بابو اب پل پر نہیں ہیں، مگر ان کی نشانی بطور ایک چیز اب بھی ریلنگ کی لکڑی کی دراڑ میں اٹکی ہوئی ہے — اور وہ ہے سپاری اور الائچی سے بھری ہوئی المونیم کی ایک ڈبیا۔

پروفیسر ہج نج نج

میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اس پر شاید ہی کوئی یقین کرے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھے بنا بہتیرے آدمی بہت سی باتوں پر یقین نہیں کرتے — جیسے بھوتوں پر۔ اتنا ضرور ہے کہ میں بھوت پریت کی کہانی لکھنے نہیں بیٹھا ہوں۔ سچ کہنے میں حرج ہی کیا — اسے کس طرح کا واقعہ کہوں یہ میں خود ہی نہیں جانتا۔ مگر واقعہ ہوا ہے، اور ہوا ہے میری زندگی میں ہی۔ اسی لیے اس میں سچائی ہے اور اس کے بارے میں لکھنا بھی فطری ہے۔

پہلے ہی بتادوں کہ جس کی وجہ سے یہ واقعہ ہوا تھا اس کا اصلی نام مجھے نہیں معلوم۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا کوئی نام ہے ہی نہیں۔ اتنا ہی نہیں، نام کے بارے میں اس نے چھوٹا موٹا ایک لیکچر بھی دے ڈالا تھا۔

''نام سے کیا ہوتا ہے، صاحب؟ کسی زمانے میں میرا کوئی نام تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے اس کو میں نے ترک کر دیا ہے۔ آپ چونکہ آئے، بات چیت کی، اپنا نام بتایا، اس لیے نام کا سوال اٹھتا ہے۔ یوں یہاں کوئی نہیں آتا، اور نہ آنے کا مطلب ہے کہ مجھے کوئی نام لے کر نہیں پکارتا۔ جان پہچان کا کوئی آدمی ہے ہی نہیں، کسی سے خط و کتابت نہیں، اخباروں میں تخلیق نہیں چھپواتا ہوں، بینک کے چیک پر دستخط نہیں کرنا پڑتا — لہٰذا نام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک نوکر ہے، مگر وہ بھی گونگا۔ گونگا نہ ہوتا تو بھی وہ میرا نام لے کر مجھے نہ پکارتا، بلکہ مجھے 'بابو' کہتا۔ بس بات ختم۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ مجھے کیا کہہ کر پکاریں گے آپ یہی سوچ رہے ہیں نا؟''

آخر طے ہوا کہ میں انھیں پروفیسر ہج نج نج کہہ کر پکاروں۔ ایسا کیوں ہوا، یہ بات میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے ضروری ہے کہ شروع کی کچھ باتیں بتادوں۔

واقعہ گوپال پور میں ہوا تھا۔ اڑیسہ کے گنجم ضلع کے بہرام پور اسٹیشن سے دس میل دور، سمندر

Scanned with CamScanner

کے کنارے گوپال پور نام کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ پچھلے تین سال سے دفتر سے چھٹی نہیں مل رہی تھی، کیونکہ کام کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ اس بار تین ہفتے کی چھٹی لے کر طے کیا کہ اس ان دیکھی، مگر نام سے شنا سا جگہ میں جاؤں گا۔ دفتر کے کاموں کے علاوہ میں ایک اور کام کرتا ہوں اور وہ ہے ترجمے کا کام۔ آج تک میرے انگریزی سے بنگالی میں ترجمہ کیے ہوئے سات جاسوسی ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ناشر کا کہنا ہے کہ ان ناولوں کی کھپت کافی تعداد میں ہو رہی ہے۔ بہت کچھ اسی کے دباؤ کی وجہ سے مجھے چھٹی لینا پڑی۔ ان تین ہفتوں کے بیچ ایک پوری کتاب کا ترجمہ کرنے کا بوجھ میرے سر پر ہے۔

اس کے پہلے میں کبھی گوپال پور نہیں آیا تھا۔ جگہ کا انتخاب اچھا ہوا ہے، اس کا پتا مجھے پہلے دن ہی چل گیا۔ اتنی پر سکون اور خوبصورت جگہ اس کے پہلے میں نے بہت ہی کم دیکھی ہے۔ پر سکون ہونے کی ایک دوسری وجہ بھی ہے کہ یہ اپریل کا مہینہ ہے اور اپریل سیاحوں کے آنے کا موسم نہیں ہوتا۔ آب وہوا بدلنے کے لیے آنے والے لوگوں کا جھنڈ ابھی یہاں نہیں پہنچا ہے۔ میں جس ہوٹل میں آکر ٹھہرا ہوں وہاں میرے علاوہ ایک اور آدمی ہے — ایک آرمینین بڑے میاں۔ نام مسٹر ایرامُن۔ وہ ہوٹل کے مغربی سرے کے ایک کمرے میں رہتے ہیں اور میں مشرقی سرے کے ایک دوسرے کمرے میں۔ ہوٹل کے لمبے برآمدے کے ٹھیک نیچے سے ہی ریتیلا میدان شروع ہو جاتا ہے۔ ایک سو گز کی دوری میں پھیلی ریت پر سمندر کی لہریں آ آکر پچھاڑیں کھاتی رہتی ہیں۔ لال کیکڑے بیچ بیچ میں برآمدے پر چڑھ کر چہل قدمی کرتے رہتے ہیں۔ میں ڈیک چیئر پر بیٹھا بیٹھا منظر نگاری کرتا رہتا ہوں۔ شام کے وقت دو گھنٹے کے لیے کام کرنا بند کر دیتا ہوں اور ریت پر چہل قدمی کرنے کے لیے نکل جاتا ہوں۔

شروع میں دو دن سمندر کے کنارے سے ہوتا ہوا میں مغرب کی طرف گیا، تیسرے دن سوچا مشرق کی طرف بھی جانا ضروری ہے۔ ریت پر پرانے زمانے کے ٹوٹے پھوٹے گھر عجیب سے ہیں۔ مسٹر ایرامُن نے بتایا تھا کہ یہ گھر تین چار سو سال پرانے ہیں۔ کسی زمانے میں گوپال پور ولندیزیوں کی چوکی تھا۔ ان مکانوں میں سے زیادہ تر اسی زمانے کے ہیں۔ دیواروں کی اینٹیں چپٹی اور چھوٹی ہیں، دروازے اور کھڑکیوں کی جگہ پر صرف دراریں رہ گئی ہیں اور چھت کے نام پر چھاؤنی کے بجائے کھلی جگہ ہی زیادہ ہے۔ میں نے ایک گھر کے اندر داخل ہو کر دیکھا اور وہاں سناٹے کا عالم پایا۔

Scanned with CamScanner

پورب کی طرف کچھ دور جانے پر دیکھا، ایک جگہ ریتیلا حصہ کافی چوڑا ہے۔ اس کی وجہ سے شہر سمندر سے بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ قریب قریب پوری جگہ تقریباً سو تر چھی پڑی ناؤوں سے بھری ہوئی ہے۔ سمجھ گیا کہ مچھیرے انھیں ناؤوں کو لے کر سمندر میں مچھلی پکڑنے نکلتے ہیں۔ دیکھا، مچھیرے جہاں تہاں جمع ہو کر اڈے بازی کر رہے ہیں، ان کے بچے پانی کے پاس جا کر کیکڑے پکڑ رہے ہیں، چار پانچ سؤر ادھر اُدھر چکر لگا رہے ہیں۔

اسی بیچ ایک الٹی پڑی ناؤ پر دو بنگالی حضرات بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ایک صاحب کی آنکھوں پر چشمہ ہے۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے اخبار کو ہوا کے جھونکے کے بیچ موڑنے میں پریشانی محسوس کر رہے ہیں۔ دوسرے صاحب اپنے ہاتھوں کو سینے کے پاس رکھ کر بغیر پلک جھپکے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے بیڑی کا کش لے رہے ہیں۔ میں جیسے ہی ان کے قریب پہنچا، اخبار والے صاحب نے تعارف حاصل کرنے کے انداز میں پوچھا، ''آپ یہاں نئے نئے آئے ہیں؟''

''ہاں... دو دن...''

''صاجی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں؟''

میں نے مسکرا کر کہا، ''آپ لوگ یہیں رہتے ہیں؟''

اب وہ اخبار کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے۔ بولے، ''میں یہیں رہتا ہوں۔ چھبیس برسوں سے گوپال پور میں ہی۔ نیو بنگال میرا ہی ہوٹل ہے۔ مگر ہاں، گھنشیام بابو آپ ہی کی طرح آب و ہوا بدلنے آئے ہیں۔''

میں نے کہا، ''اچھا،'' اور بات چیت کا سلسلہ ختم ہونے کی طرف بڑھنے لگا، تبھی بھلا آدمی ایک دوسرا ہی سوال پوچھ بیٹھا، ''اُدھر کہاں جا رہے ہیں؟''

''یوں ہی، ذرا گھوموں گا، اور کیا۔''

''کیوں؟''

بھاری مصیبت میں پھنسا! کیوں گھومنے جا رہا ہوں، یہ بھی ان کو بتانا ہوگا!

تب تک وہ کھڑے ہو چکے تھے۔ روشنی آہستہ آہستہ پھیکی پڑتی جا رہی ہے۔ آسمان کے شمالی اور مغربی حصے میں بادل کا ایک سیاہ چکتا آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا ہے۔ آندھی آئے گی کیا؟

Scanned with CamScanner

بھلے آدمی نے کہا، ''ایک آدھ سال پہلے کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت ایسی حالت تھی کہ جہاں مرضی ہو آدمی گھوم پھر سکتا تھا۔ پچھلے ستمبر سے مشرق کی طرف، مچھیروں کی بستی سے ایک آدھ میل دور، ایک آدمی ڈیرا ڈنڈی ڈالے بیٹھ گیا ہے۔ ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو دیکھ رہے ہیں نا؟ ٹھیک ویسا ہی ایک مکان ہے۔ میں نے اس مکان کو نہیں دیکھا ہے۔ یہاں کے پوسٹ ماسٹر مہاپاترا نے بتایا کہ اس نے دیکھا ہے۔''

میں نے کہا، ''سادھو سنیاسی قسم کا آدمی ہے کیا؟''

''بالکل نہیں!''

''پھر؟''

''وہ کیا ہے، معلوم نہیں۔ مہاپاترا نے بتایا ہے کہ مکان کے ٹوٹے پھوٹے حصے کو ترپال سے ڈھک رکھا ہے۔ اندر کیا کرتا ہے، کسی کو بھی اس کا پتا نہیں۔ مگر ہاں، چھت کے ایک چھید سے بینگنی رنگ کا دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مکان میں نے نہیں دیکھا ہے مگر اس آدمی کو دو بار دیکھ چکا ہوں۔ میں اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا اور وہ میرے سامنے سے پیدل جا رہا تھا۔ ہرے رنگ کا کوٹ پتلون پہنے تھا۔ داڑھی مونچھ نہیں ہے، لیکن سر پر گھنے بال ہیں۔ چہل قدمی کرتا ہوا منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار زور سے ہنستے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے باتیں کیں مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ یا تو بدمزاج ہے یا پھر پاگل — شاید بدمزاج اور پاگل دونوں۔ اس کے پاس ایک نوکر بھی ہے۔ وہ سویرے کے وقت بازار میں دکھائی دیتا ہے۔ اتنا ہٹا کٹا کوئی دوسرا آدمی میں نے نہیں دیکھا ہے، صاحب۔ اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے ہیں، لمبا چوڑا چہرہ، بہت کچھ سؤر جیسا۔ یا تو وہ گونگا ہے یا پھر منھ بند کیے رہتا ہے۔ سامان خریدتے وقت بھی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا۔ دکاندار کو ہاتھ کے اشارے سے بتا دیتا ہے۔ مالک چاہے جیسا ہو، لیکن ویسا نوکر جس گھر میں ہے، وہاں نہ جانا کیا عقل مندی کا کام نہیں ہے؟''

گھنشیام بابو بھی تب تک اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ بیڑی کو ریت پر پھینک کر بولے، ''چلیے صاحب۔'' دونوں آدمی جب ہوٹل کی طرف روانہ ہونے لگے تو منیجر بابو نے بتایا کہ ان کا نام رادھا ونود چٹرجی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے ہوٹل میں آنے کا اصرار بھی کیا۔

Scanned with CamScanner

جاسوسی ناولوں کا ترجمہ کرتے کرتے پراسرار باتوں کے تئیں میرے دل میں جو ایک فطری رجحان پیدا ہو گیا ہے، یہ بات نیو بنگالی ہوٹل کے منیجر صاحب کو معلوم نہیں تھی۔ میں نے گھر لوٹنے کی بات سوچی ہی نہیں، بلکہ مشرق کی طرف ہی بڑھتا گیا۔ ابھی بھاٹے کا وقت ہے۔ سمندر کا پانی پیچھے کی طرف چلا گیا ہے۔ جوار بہت ہی کم آرہے ہیں۔ کنارے کی جس جگہ پر لہریں جھاگ اُگل رہی ہیں، وہاں کچھ کوّے پھدک رہے ہیں۔ جھاگوں کا انبار سرسراتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ فوراً ہی جھاگ کے بلبلوں کو چونچ مار کر کوّے جیسے کچھ کھانے لگتے ہیں۔ مچھیروں کے گاؤں کو پار کرنے کے بعد تقریباً دس منٹ تک میں آگے کی طرف چلتا گیا۔ بھیگی ریت پر ایک چلتی ہوئی لال چادر دیکھ کر شروع میں چونک اٹھا۔ قریب جانے پر پتا چلا کہ یہ کیکڑوں کی ایک فوج ہے جو پانی ہٹ جانے کی وجہ سے جھنڈ بنا کر اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پانچ منٹ تک چلنے کے بعد اس مکان پر نگاہ پڑی۔ ترپال کے گھیرے کی بات پہلے ہی سن چکا تھا، اس لیے پہچاننے میں پریشانی نہیں ہوئی۔ لیکن قریب جانے پر دیکھا، وہاں صرف ترپال ہی نہیں ہے؛ بانس، لکڑی کے تختے، زنگ آلود ٹین، یہاں تک کہ پیسٹ بورڈ کے ٹکڑے بھی مکان کی مرمت کے کام میں لائے گئے ہیں۔ دیکھ کر لگا، اگر چھت میں سوراخ کرتے ہوئے برسات کا پانی اندر گرتا ہے تو کسی آدمی کے لیے اس مکان میں رہنا ممکن نہیں ہے۔ مگر وہ آدمی ہے کہاں؟

کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہنے کے بعد مجھے لگا، وہ آدمی اگر نیم پاگل ہے اور اس کے پاس سچ مچ ہی ایک لمبا تڑنگا نوکر ہے، تو میں جس تجسس کے ساتھ اس مکان کی طرف دیکھ رہا ہوں، میرا یہ دیکھنا عقلمندی کا کام نہیں ہے۔ اس سے تو اچھا یہی ہوگا کہ یہاں سے تھوڑی دور ہٹ کر اکتائے ہوئے انداز کے ساتھ چہل قدمی کرتا رہوں۔ اتنی دور جب آ ہی چکا ہوں تو پھر اسے بغیر دیکھے کیسے چلا جاؤں؟

میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایسا لگا جیسے گھر کے سامنے کے دروازے کی درار کے پیچھے تاریکی میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ اس کے بعد ایک ناٹا آدمی باہر آیا۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی آدمی اس مکان کا مالک ہے اور یہی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر کچھ دیر سے میری نگرانی کر رہا تھا۔

''آپ کے ہاتھ میں چھ انگلیاں دیکھ رہا ہوں! ہی ہی!'' اچانک مہین سی آواز سنائی دی۔

بات صحیح ہے — میرے ہاتھ میں انگوٹھے کے پاس ایک زیادہ انگلی میری پیدائش سے ہی

ہے، جس سے میں کوئی کام نہیں لیتا ہوں — لیکن اس آدمی نے اتنی دور سے اسے کیسے دیکھ لیا؟

جب وہ بالکل پاس چلا آیا تو دیکھا، اس کے ہاتھ میں پرانے زمانے کی ایک آنکھ سے دیکھی جانے والی دوربین ہے اور اسی لیے وہ بے خوف میرا جائزہ لے رہا ہے۔

''دوسری انگلی یقیناً انگوٹھا ہی ہے۔ ہے نا؟ ہی ہی!'' اس آدمی کے گلے کی آواز بہت مہین ہے۔ اتنی عمر کے کسی آدمی کی آواز اس طرح کی میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔

''آیئے باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

اس کی بات سن کر مجھے تعجب ہوا۔ رادھا ونود بابو کی باتوں سے اس آدمی کے بارے میں نے کچھ اور ہی اندازہ کیا تھا۔ لیکن اب دیکھنے میں آیا کہ بہت ہی خوش مزاج ہے اور شائستہ بھی۔

ابھی وہ مجھ سے تقریباً دس ہاتھ کی دوری پر ہے۔ شام کے دھندلکے میں اسے صاف صاف نہیں دیکھ پا رہا تھا، حالانکہ دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ لہٰذا اس کے اصرار کو ٹال نہ سکا۔

''ذرا ہوشیاری سے! آپ لمبے آدمی ہیں اور میرا دروازہ چھوٹا...''

جھک کر اپنے سر کو بچاتے ہوئے میں اس کے گھر میں داخل ہوا۔ ایک پرانی سوندھی خوشبو کے ساتھ سمندر کی نمی سے بھری ایک خوشبو اور ایک اجنبی خوشبو مل جل کر اس پیچ میل پیوند دار مکان سے ہم آہنگ ہوتی محسوس ہوئی۔

''بائیں طرف آیئے۔ داہنی طرف میرا... ہی ہی... کام دھندے کا کمرہ ہے۔''

داہنی طرف سے دروازے کی درار کی طرف دیکھا، وہ لکڑی کے ایک بڑے تختے سے مضبوطی سے بند تھا۔ ہم بائیں طرف کی کوٹھری کے اندر چلے آئے۔ اسے بیٹھک کہا جا سکتا ہے۔ ایک کونے میں لکڑی کی ایک میز پر کچھ موٹی کاپیاں، تین قلم، دوات، گوند کی شیشی اور ایک قینچی پڑی ہوئی ہے۔ میز کے سامنے ایک زنگ آلود ٹین کی کرسی، ایک کنارے اُلٹ کر رکھا ہوا ایک پیکنگ کیس اور کوٹھری کے بیچوں بیچ ایک بڑی کرسی۔ اس آخری شے کو کسی راج محل کی بیٹھک میں رہنا چاہیے تھا۔ قیمتی لکڑی پر بہت ہی خوبصورت نقاشی ہے، بیٹھنے کی جگہ پر گہرے لال رنگ کی مخمل ہے جس پر بیل بوٹوں کی کشیدہ کاری ہے۔

''آپ اس بکسے پر بیٹھ جایئے، میں کرسی پر بیٹھتا ہوں۔''

Scanned with CamScanner

بس یہیں سے دل میں کھٹکا پیدا ہوا۔ یہ آدمی اگر قطعی پاگل نہیں ہے تو کم سے کم بے ہودہ اور بے کار تو ضرور ہی ہے۔ ایسا نہ ہوتو کہیں ایک باہری آدمی کو اپنے گھر کے اندر بلا کر پیکنگ کے بکسے پر بٹھائے اور خود تخت پر براجمان ہو جائے؟ لیکن کھڑکی کے ترپال کے سوراخ سے آتی ہوئی شام کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں پاگل پن کی کوئی جھلک نہیں دکھ رہی ہے۔ بلکہ بچے کی سی خوشی کا ایک جذبہ تیر رہا ہے اور اس سے اس آدمی کے بے ہودگی سے بھرے اصرار کے باوجود اس کے چہرے پر مکروہ پن کی چھاپ نہیں پڑی ہے۔ میں پیکنگ کیس پر بیٹھ گیا۔

''کہیے،'' اس نے کہا۔

کیا کہوں؟ دراصل میں کچھ کہنے نہیں آیا ہوں، صرف دیکھنے ہی آیا ہوں، اس لیے جب اس نے جھٹ سے کہا تو میں کشمکش میں پڑ گیا۔ آخر کار جب کوئی دوسرا خیال دل میں نہیں آیا تو میں نے اپنا تعارف ہی کرا دیا۔

''میں چھٹیوں میں کلکتہ سے آیا ہوں۔ میں، یعنی... کہنے کا مطلب ہے کہ رائٹر ہوں۔ میرا نام ہے ہمانشو چودھری۔ اس طرف گھومنے آیا تھا کہ آپ کے مکان پر نظر پڑ گئی...''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ مگر ہاں، میرا کوئی نام نہیں ہے۔''

پھر پراسرار بات! ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی نام ہوتا ہی ہے، پھر اسے مستثنیٰ کیوں مان لیا جائے؟ یہ پوچھتے ہی بھلے آدمی نے نام کے بارے میں تقریر کر ڈالی۔ اس کا دور جب ختم ہوا تو مجھے خاموش پا کر وہ مسکراتا ہوا بولا:

''میری باتیں شاید آپ کو پسند نہیں آئیں۔ پھر آپ سے ایک بات کہوں، میں نے دل ہی دل میں اپنا ایک نام رکھ چھوڑا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ نام کسی کو بتایا نہیں ہے، مگر آپ کی چونکہ چھ انگلیاں ہیں، اس لیے آپ کو بتانے میں کوئی ہرج نہیں۔''

میں اس بھلے آدمی کی طرف دیکھتا رہا۔ کمرے کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ نوکر کیوں نہیں دکھائی دے رہا ہے؟ کم سے کم موم بتی یا مٹی کے تیل کی ڈبیا ہی اس وقت رکھنا ہی چاہیے تھی۔

بھلے آدمی نے اپنا سر گھما کر کہا، ''آپ نے میرے کانوں کو غور سے دیکھا ہے؟''

Scanned with CamScanner

اب تک میں نے غور نہیں کیا تھا، اب آنکھیں اس طرف گئیں تو چونک پڑا۔
کسی انسان کے اس طرح کے کان میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اوپری حصہ گول کے بجائے نکیلا ہے۔ ٹھیک ویسے جیسے سیار یا کتے کے ہوا کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

کان دکھانے کے بعد وہ میری طرف گھوما اور ایک عجیب حرکت کر بیٹھا۔ اپنے سر کے بالوں کو ایک بار زور سے جھٹکا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بال کھل کر ہاتھ میں آگئے۔ میں نے حیرت سے دیکھا، کھوپڑی اور کنپٹی کے علاوہ کہیں بالوں کا نام ونشان نہیں ہے۔ اس نئے چہرے اور جھلکتی ہوئی آنکھوں میں شرارت بھری ہنسی دیکھ کر میرے منھ سے اچانک ایک نام نکل گیا:

''بج بج بج!''

''درست!'' بھلے آدمی نے تالیاں بجائیں اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''آپ چاہیں تو تصویر سے ملا کر دیکھ سکتے ہیں۔''

''ضرورت نہیں ہے،'' میں نے کہا، ''بج بج بج کا چہرہ بچپن سے ہی دل میں بسا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے! آپ چاہیں تو خوشی سے اس نام کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر نام سے پہلے 'پروفیسر' لفظ جوڑ دیں تو اور اچھا ہے۔ مگر ہاں، یہ بات کس سے بتایئے گا نہیں۔ اگر بتا دیا تو... ہی ہی... ہی ہی... !''

اب پہلی بار مجھے ذرا ڈر کا احساس ہوا۔ یہ آدمی یقیناً پاگل ہے یا پھر بے ہودہ قسم کا سنکی۔ ایسے لوگوں کو برداشت کرنا مشکل ہے۔ ہر وقت یہی سوچ کر خاموش رہنا پڑتا ہے کہ کیا کروں، کیا نہ کروں، کیا بولوں، کیا نہ بولوں۔

ہم دونوں ایک ساتھ رہ کر بھی خاموش رہیں یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے میں نے کہا، ''آپ کے کان کے نکیلے حصے کا رنگ کچھ دوسری ہی طرح کا دکھائی دیتا ہے۔''

''یہ تو ہوگا ہی،'' اس آدمی نے کہا، ''وہ میرا اپنا نہیں ہے۔ پیدائش کے وقت میرے کان اس طرح کے نہیں تھے۔''

''پھر کیا آپ کے کان بھی آپ کے بالوں کی طرح نقلی ہیں؟ کھینچتے ہی کھل جائیں گے؟''
بھلے آدمی نے اسی طرح کھلکھلا کر کہا، ''بالکل نہیں۔ نہیں، نہیں، نہیں!''

ہاں، یہ آدمی ضرور ہی پاگل ہے۔ ''پھر وہ کیا چیز ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ٹھہریے، پہلے اپنے نوکر سے آپ کا تعارف کرادوں۔ اسے بھی شاید آپ پہچان لیں گے۔''

اب تک میں نے غور نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کب ایک دوسرا آدمی پیچھے کے دروازے سے وہاں آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کے تیل کی ایک ڈبیا تھی۔ یہ وہی نوکر ہے جس کے بارے میں رادھا نود بابو نے بتایا تھا۔

بھلے آدمی نے جب تالی بجائی تو وہ کمرے کے اندر چلا آیا اور مٹی کے تیل کی ڈبیا میز پر رکھ دی۔ حقیقت میں کبھی اس طرح کا کیم شحیم آدمی میں نے دیکھا ہو، ایسا یاد نہیں آتا۔ اس آدمی کے بدن پر ایک دھاری دار قمیص ہے اور وہ چھوٹے گھیرے کی دھوتی پہنے ہے۔ پاؤں اور ہاتھ کی ہڈیاں، کلائی کا گھیرا، سینے اور گردن کی چوڑائی دیکھ کر حیران رہ جانا پڑتا ہے۔ حالانکہ اس آدمی کی لمبائی پانچ فٹ اور دو یا تین انچ سے زیادہ نہ ہوگی۔

''میرے نوکر کو دیکھ کر آپ کو کسی کی بات یاد آرہی ہے کیا؟'' بج بج بج نے پوچھا۔
وہ ڈبیا رکھ کر اپنے مالک کے حکم کا انتظار کررہا ہے۔ ایک آدھ پل اس کی طرف دیکھنے کے بعد یاد آگیا کہ یہ چہرہ کس سے ملتا تھا۔ میں نے بے چین ہوکر کہا۔ ''ارے یہ تو ششٹھ چرن ہے''۔
''آپ نے بالکل صحیح بات کہی!'' بھلا آدمی خوشی کے مارے بیٹھے بیٹھے ہی ناچنے لگا۔ ''اتنا ضرور ہے کہ اس کا وزن انسٹھ من نہیں، بلکہ ساڑھے تین من سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ کم سے کم 1967 میں تو اتنا ہی تھا۔ ہاتھی اٹھانے کی بات تو معلوم نہیں، مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ روز سویرے دو بڑے بڑے سؤروں کو پکڑ کر اٹھاتا رہتا ہے۔ یہ واقعہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ میری یہ جو کرسی ہے، اسے بھی وہ ایک ہی ہاتھ سے اٹھا کر لے آیا ہے۔''
''کہاں سے؟''
''ہی ہی ہی... یہ بات مت پوچھیے۔ جاؤ ششٹھ، ہم لوگوں کے لیے دو ڈاب لے آؤ۔''
ششٹھ تعمیل حکم کے لیے چلا گیا۔

باہر بادل گرج رہے ہیں۔ ہوا کے ایک جھونکے سے ترپال کھڑکھڑانے لگے۔ اب اگر یہاں

Scanned with CamScanner

سے اٹھ کر نہیں جاتا ہوں تو مصیبت میں پھنستا ہوگا۔

''آپ میرے کانوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا؟'' بھلے آدمی نے کہا، ''اصل میں وہ اود بلاؤ کے کانوں اور اصلی کانوں کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔''

اس کی بات پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے پوچھا، ''انھیں ملایا کیسے؟''

بھلے آدمی نے کہا، ''کیوں، اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟ ایک آدمی کا دل جب دوسرے آدمی میں لگا دیا جاتا ہے، تو جانور کے آدھے کان کو آدمی کے کان کے اوپر نہیں لگایا جا سکتا؟''

''آپ شروع میں کیا ڈاکٹری کرتے تھے؟... پلاسٹک سرجری ٹائپ کا کچھ؟''

''بات تو صحیح ہے... کرتا تھا نہیں، بلکہ اب بھی کرتا ہوں... ہی ہی... ہی ہی... مگر ہاں، وہ کوئی معمولی سرجری نہیں ہے۔ مثلاً آپ اپنے انگوٹھے کو ہی لیں۔ اگر وہ نہ ہوتا تو ضرورت پڑنے پر اسے لگا دینا میرے لیے بالکل آسان کام تھا۔''

میں نے بہت کوشش کی کہ اس آدمی کا تصور ایک بڑے ڈاکٹر کے روپ میں کروں، مگر کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ حالانکہ کانوں کو غور سے دیکھنے پر وہ بہت عجیب لگ رہے تھے، لیکن کس صفائی سے جوڑا گیا ہے کہ کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

بھلے آدمی نے کہا، ''ڈاکٹری اور سائنس کی کتابوں کے علاوہ میں نے صرف دو ہی چیزیں پڑھی ہیں: اوٹ پٹانگ، اور ح-ش-د-ل۔[1] اور دونوں میں ہی جو چیزیں مجھے سب سے اچھی لگیں وہ ہیں اس طرح کی مخلوقات جنھیں لوگ عجیب اور بے ڈھب کہا کرتے ہیں۔ عام باتوں سے ماورا اگر کچھ ہو یا کچھ کیا اور کہا جائے تو لوگ اسے پاگل پن اور عجیب کہہ کر کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جانتے ہیں، میں بچپن میں موم بتی چوس کر کھاتا تھا۔ کھانے میں بہت ہی اچھی لگتی ہے۔ اس کے علاوہ اتنی مکھیوں کو پکڑ پکڑ کر میں کھا چکا ہوں کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں۔''

ششٹھی چرن ڈاب لے آیا، اس لیے بھلے آدمی کو کچھ پلوں تک خاموش رہنا پڑا۔ دو غلاف چڑھے گلاسوں کو میز پر رکھ کر اس نے سلسلہ وار دونوں ڈابوں کو اپنی ہتھیلیوں سے دبایا۔ وہ فوراً ٹوٹ

[1] یہ دونوں بنگلہ زبان کے بچوں کے دو رسالوں کے نام ہیں۔ 'پروفیسر ہج بج بج'، 'ششٹھی چرن' وغیرہ انھیں رسالوں کے مقبول افسانوی کردار ہیں۔

Scanned with CamScanner

گئے اوران کا پانی گلاسوں کے اندر گر پڑا۔ ششٹھی چرن نے گلاس ہماری طرف بڑھا دیے۔

پانی کا گھونٹ لے کر بھلے آدمی نے کہا،''ڈاکٹری پڑھ کر میں نے پلاسٹک سرجری میں مہارت حاصل کرلی۔ جانتے ہیں کیوں؟''

''کیوں؟'' میرا تجسس بڑھتا جارہا تھا، اور وہ اس لیے کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس بھلے آدمی کی تخیل کی پرواز کہاں تک ہے۔

جج بج بج نے کہا،'' کیونکہ صرف تصویروں سے ہی میرے دل کو تسلی نہیں ملتی تھی۔ میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اس طرح کے جانور اگر حقیقت میں ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ یہ سب مخلوقات کہیں نہ کہیں ہیں، اس بات پر میرے دل میں کوئی شک نہیں تھا۔ مگر میں چاہتا تھا وہ میرے گھر پر رہیں، میرے ہاتھ کے بالکل قریب، آنکھوں کے سامنے، سمجھے؟''

میں نے کہا،''نہیں صاحب، بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کون سی مخلوقات کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟''

''یہی جیسے بگلا، گرگٹ یا ہنس۔''

میں نے کہا،''سمجھ گیا، اس کے بعد؟''

''اس کے بعد اور کیا؟ میں نے گرگٹ سے شروعات کی۔ دونوں چیزیں میرے ہاتھ کے قریب ہی تھیں۔ طوطے کا ماتھا اور گرگٹ کی دُم، ٹھیک اسی طرح جس طرح کتاب میں ہے۔ پہلی کوشش میں ہی کامیابی حاصل ہوگئی۔ ایسا جوڑ دیا کہ باہر سے کچھ معلوم ہی نہ ہوسکے۔ مگر جانتے ہیں۔ . .''

بھلا آدمی سنجیدہ ہوکر ایک پل خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے بعد بولا،''زیادہ دن تک زندہ نہیں رہا۔ کچھ کھاتا ہی نہ تھا۔ بغیر کھائے زندہ کیسے رہے گا؟ اصل میں جو لکھا ہوا ہے، وہی ٹھیک ہے۔ بدن سے بدن ملنے پر بھی دل آپس میں نہیں مل پاتے۔ اس لیے اب دھڑ اور سر کو جوڑنا چھوڑ کر ایک دوسرا تجربہ کر رہا ہوں۔''

وہ اچانک بے دل سا ہوگیا۔ میری تقدیر اچھی ہے کہ ڈاب کا پانی ہی پینے کے لیے دیا ہے۔ اگر چائے بسکٹ ہوتا تو منھ کے اندر رکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔

Scanned with CamScanner

ششٹھی چرن کہاں چلا گیا، معلوم نہیں۔ کھٹ کھٹ کھٹ آواز ہو رہی ہے۔ یہ آواز جس طرف سے آ رہی ہے، اس سے یہی لگ رہا ہے کہ بھلے آدمی نے جسے اپنے کام دھندے کا کمرہ بتایا تھا، اسی کے دروازے کھولے جا رہے ہیں۔

باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ اب بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔ بھلے آدمی کا شکریہ ادا کر کے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''چل دیے؟ آپ سے ایک بات پوچھنا تھی...''

''کہیے...''

''جانتے ہیں بات کیا ہے؟ سارا انتظام کر چکا ہوں — سیہی کا کانٹا، بکرے کا سینگ، شیر کے پیچھے کے دو پیر، بھالو کے بال لے آیا ہوں، لیکن آدمی کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے، اور وہ بھی ایسا ہونا چاہیے جو تصویر سے ملتا جلتا ہو۔ ایسے آدمی پر اگر آپ کی کبھی نگاہ پڑی ہو تو بتانے کی زحمت کریں۔''

یہ کہہ کر بھلے آدمی نے اپنی میز پر رکھی کاپیوں کے نیچے سے پرانے زمانے کا اوٹ پٹانگ کا شمارہ نکال کر ایک ورق پلٹا اور اسے میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ تصویر میری دیکھی ہوئی ہے۔ ہاتھ میں مُد گر لیے ایک عجیب مخلوق ایک بھاگتے ہوئے آدمی کی طرف غصے بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

''ڈرو نہیں تم ڈرو نہیں بھئی، ماروں گا میں تمھیں نہیں

''کشتی میں تم کو پچھاڑ دوں طاقت اتنی مجھ میں نہیں...''

''بتائیے اگر ایسا بنا سکوں تو کتنا اچھا رہے۔ کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ توڑنا، جوڑنا جو کچھ تھا سب ہو چکا ہے، نیچے کی طرف تھوڑا سا حصہ جوڑ بھی چکا ہوں، اب صرف اسی طرح کے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔''

میں نے کہا، ''اتنی گول گول آنکھیں آدمی کی کہاں ہوتی ہیں؟''

''ہاں ہوتی ہیں!'' بھلا آدمی تقریباً اچھل پڑا۔ ''آنکھیں تو گول ہی ہوتی ہیں۔ پپوٹوں سے چونکہ گولائی کا زیادہ حصہ ڈھکا رہتا ہے اس لیے اتنی گول معلوم نہیں ہوتی ہیں۔''

میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پاگل تو ہے ہی، اس کے علاوہ جلدی چھٹکارا دینے والا انسان بھی نہیں ہے۔ الفاظ کا بھی اس کے پاس ذخیرہ ہے۔

Scanned with CamScanner

''ٹھیک ہے، پروفیسر ججّ بج بج، کسی پر نگاہ پڑی تو بتاؤں گا۔''

''ضرور بتایئے گا۔ بڑا آسان ہوگا۔ میں بھی تلاش کر رہا ہوں۔''

''آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

آخری سوال کو نہ سننے کا بہانہ بنا کر میں تاریکی میں چلا آیا۔ باہر آتے ہی میں دوڑنے لگا۔ بھیگنے میں مجھے پریشانی نہیں ہے، مگر آندھی میں ریت اڑ رہی ہے، اور وہ ناک اور آنکھوں میں داخل ہو کر بہت ہی پریشان کر رہی ہے۔

ہاتھوں سے منھ کو چھپائے کسی طرح آنکھوں کو بچاتے ہوئے جب ہوٹل پہنچا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر جب بٹن دبایا تو بتی نہیں جلی۔ برآمدے میں جا کر بیرے کو پکارنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بیرا موم بتی لیے میرے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے، تو اس نے بتایا زیادہ آندھی پانی میں گوپال پور میں بجلی کا جانا ایک عام بات ہے۔

آٹھ بجے کھانا کھا کر جب میں پلنگ پر بیٹھ کر ٹمٹماتی روشنی میں لکھنے بیٹھا تو دل نہیں لگا۔ دل بار بار دوڑ کر پروفیسر ججّ بج بج کی طرف جانے لگا۔ تین سو سال پرانے مکان کو جیسے تیسے مرمت کرنے کے بعد (یہاں بھی اوٹ پٹانگ کی 'تھل تھل' کی یاد آتی ہے) یہ آدمی وہاں کیسے رہتا ہے؟ قطعی پاگل کے سوا ایسا کوئی کر سکتا ہے؟ اور ششٹھی چرن؟ سانڈ جیسے اس نوکر کا اس نے کہاں سے انتظام کیا؟ واقعی کیا مشرق کی طرف کے اس بند کمرے میں وہ کچھ حیرت انگیز کام کرتا ہے؟ اس کی باتوں میں کہاں تک سچائی ہے؟ اس کی پوری بات کو اس کا پاگل پن کہہ کر اُڑایا جا سکتا تھا، مگر ان کانوں کو دیکھنے کے بعد گڑ بڑ پیدا ہو رہی ہے۔ ان کانوں کو نہ صرف صفائی کے ساتھ جوڑا گیا ہے، بلکہ آتے وقت ڈبیا کی روشنی میں دیکھا تھا کہ ایک کان کے نکیلے حصے میں پھپھولا بھی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ وہ کان جسم کا ہی حصہ ہے اور جسم کے باقی حصوں کی طرح وہاں بھی رگیں اور اعصابی نظام ہیں۔ وہاں بھی خون کا بہاؤ ہوتا ہے۔

واقعی، جتنا سوچتا ہوں، اتنا ہی دل چاہتا ہے کہ وہ کان نہ ہوتے تو میں راحت کی سانس لیتا۔

Scanned with CamScanner

دوسرے دن صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھ کر دیکھا، رات میں ہی بدلی چھٹ گئی ہے۔ چائے پینے بیٹھا تو ہج بج بج کی باتیں یاد آئیں اور جی چاہا کہ ہنس پڑوں۔ معمولی سی بات ہے — ہلکے اندھیرے میں، ڈبیا کی روشنی میں جو کچھ دیکھا اس کا آدھا ہی حصہ دکھائی دیا تھا اور آدھے کا میں نے تصور کرلیا۔ ہوٹل میں لوٹنے پر بھی اسی طرح کا اندھیرا ملا تھا، اس لیے دل کے وہم کو دور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آج ریت پر صبح کی دھوپ اور خاموش سمندر کی شکل دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ آدمی پاگل کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

پاؤں کے نیچے، ایڑی کے پاس تھوڑا درد محسوس ہو رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ ایک جگہ کانٹے کا نشان ہے۔ سمجھ گیا کہ کل اندھیرے میں جب میں ریت میں دوڑتا ہوا واپس آرہا تھا تو سیپ جیسی کوئی چیز چبھ گئی ہوگی۔ اپنے ساتھ میں ڈیٹول یا آیوڈین نہیں لایا تھا، اس لیے نو بجنے پر بازار کی طرف روانہ ہوگیا۔

نیو بنگالی ہوٹل کے سامنے سے سڑک بازار کی طرف گئی ہے۔ ہوٹل کے سامنے، برآمدے پر گھنشیام بابو کو ایک پھیری والے سے مونگا لے کر الٹتے پلٹتے دیکھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر انھوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا کلیجا کانپ گیا۔

یہ چہرہ تو ویسا ہی ہے جیسا کہ اوٹ پٹانگ میں تھا۔ پاگل ہج بج بج اسی چہرے کی تلاش میں ہے — اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح چپٹی ناک کے دونوں طرف پھیلی ہوئی لمبی پکی مونچھیں ہیں، لمبے گلے کے دونوں طرف تصویر کی طرح ہی باہر نکلی ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ ٹھوڑی کے نیچے کی بکری جیسی پتلی داڑھی بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ اصل میں کل اس آدمی کی حرکات وسکنات مجھے پسند نہیں آئی تھیں اور اسی وجہ سے میں نے اس کے چہرے کو بغور نہیں دیکھا تھا۔ آج ہم لوگوں کی آنکھیں ملیں اور میں نے نمسکار بھی کیا، مگر اس نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ بڑا ہی عجیب لگا۔

پھر بھی مجھے اس آدمی کی فکر ہوئی۔ اُس پاگل کے سپرد اسے نہیں کیا جاسکتا۔ ہج بج بج یا اس کا نوکر اگر اسے دیکھ لے تو ضرور ہی بغل میں دبا کر اس ٹوٹے مکان کے اندر لے جائے گا اور اس کے بعد اس کی کیا حالت ہوگی، یہ بھگوان ہی بہتر جانتا ہے۔

سوچا بازار سے لوٹتے وقت ایک بار رادھا ونود بابو سے ملوں گا اور ساری باتیں کھل کر کہوں گا۔

Scanned with CamScanner

انھیں ہوشیار کردوں گا کہ اپنے ہوٹل کے اس واحد مہمان پر نظر رکھے رہیں۔

مگر ڈیٹول خریدتے وقت یہ خیال میرے دل سے خود بخود دور ہو گیا۔ رادھا ونود بابو سے مجھے عجیب عجیب باتیں کہنا ہوں گی، اور کیا وہ ان باتوں پر یقین کریں گے؟ ایسا لگتا نہیں۔ یہاں تک کہ ان باتوں کو سن کر مجھے پاگل قرار دیں گے۔ اس کے علاوہ ان کی بات نہ مان کر میں جو جج بج کے پاس گیا تھا، یہ بات انھیں پسند نہیں آئے گی۔

لوٹتے وقت گھنشیام بابو پر جب دوبارہ نظر پڑی تو مجھے لگا، میری نظر میں جس آدمی کا چہرہ تصویر سے ملتا جلتا ہے، ہج بج بج کے خیال میں ویسا نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ڈر کی جتنی وجہ محسوس ہو رہی ہے، ہو سکتا ہے اصل میں اتنی نہ ہو۔ اس لیے عقلمندی اسی میں ہے کہ ان لوگوں سے کچھ نہ کہوں اور پروفیسر کو بھی کچھ نہ بتاؤں۔ اب میں صرف مغرب کی طرف ہی گھومنے پھرنے جاؤں گا اور باقی وقت ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر لکھنے کا کام کرتا رہوں گا۔

ہوٹل آتے ہی بیرے نے مجھے بتایا کہ ایک آدمی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ مجھ سے ملاقات نہ ہونے پر وہ ایک خط لکھ کر رکھ گیا ہے۔

بہت ہی چھوٹے چھوٹے چیونٹی جیسے الفاظ میں یہی بات لکھی ہوئی ہے۔

پیارے شٹ انکل جی!

آج شام ضرور میرے گھر تشریف لائیے گا۔ شیر کے پچھلے حصے کے ساتھ سیہی کے کانٹے اور بھالو کے روئیں کو اچھی طرح جوڑ چکا ہوں۔ ایک بہت عمدہ مُدگر بھی تیار کر لیا ہے۔ اب تینوں سینگوں کے لیے ایک ماتھے کی ضرورت ہے۔ ماتھے اور ہاتھوں کا انتظام ہو جائے تو کام بن جائے۔ ششٹھی چرن کو ایک آدمی کا پتا چلا ہے، جس کا چہرہ اصل تصویر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ امید ہے، آج ہی میرا تجربہ کامیاب ہو جائے گا۔ اس لیے آج شام کو ایک بار 'فرض ناشناس' میں آنے کی زحمت کریں تو بے حد خوشی ہوگی۔

خاکسار، ایچ بی بی۔

یاد آیا، ہج بج بج نے بتایا ہی تھا کہ ح۔ ش۔ د۔ ل کے مطابق ہی گھر کا نام 'فرض ناشناس' رکھا گیا ہے۔ خط پڑھنے کے بعد دل میں دوبارہ اندیشہ جاگا کیونکہ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ششٹھی چرن نے

شاید گھنشیام بابو کو ہی دیکھا ہے۔

دوپہر بھر کچھ لکھنے کا کام کیا۔ تیسرے پہر تیز ہوا چلنے لگی۔ برآمدے میں ڈیک چیئر پر بیٹھے بیٹھے میں سمندر کی طرف دیکھتا رہا، جس سے بہت کچھ ہلکے پن کا احساس ہوا۔ شمال و مغرب سے آتی ہوئی ہوا لہروں سے ٹکرا رہی ہے، جس کی وجہ سے لہروں کے اوپر پھیلا جھاگ چور چور ہو کر ہوا کے جھونکوں سے بکھر رہا ہے۔ دیکھنے میں بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔

چھ بجے رادھا ونود بابو کو ریت سے ہو کر اپنے برآمدے کی طرف آتے دیکھا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''میرے اس مہمان کو اس طرف چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا ہے؟''

''کس کو؟ گھنشیام بابو کو؟''

''ہاں صاحب، کل ہم آپ سے جس جگہ ملے تھے وہیں ٹھہرنے کی بات کی تھی۔ ابھی میں گیا تو نہیں۔ آس پاس کوئی آدمی نہیں تھا جس سے پوچھ کچھ کر سکوں۔ ادھر میرے ہوٹل میں شور و غل مچا ہوا ہے۔ میری سونے کی گھڑی چوری ہو گئی ہے۔ نوکر سے سوال جواب کرنے میں دیر ہو گئی۔ وہ کیا اس طرف سے ہو کر نہیں گئے ہیں؟''

میں کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں، اس طرف سے نہیں گئے ہیں،'' میں نے کہا،'' مگر ہاں، میرے دل میں کچھ شک ہو رہا ہے۔ ایک جگہ جاؤں تو ہو سکتا ہے پتا چل جائے۔ آپ کے ہاتھ میں جو لاٹھی ہے، وہ کافی مضبوط ہے نا؟''

رادھا ونود بابو نے چونک کر کہا،'' لاٹھی؟ ہاں، لاٹھی تو میرے دادا جی کے زمانے کی ہے... اس لیے...''

میرے ساتھ اور کوئی چیز نہیں۔ جب یہاں پہلی بار آیا تھا تو آرا مچھلی کا ایک دانت خریدا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لے لیا۔ دوسرے ہاتھ میں اپنی ٹارچ تھام لی۔

مجھے مشرق کی طرف جاتے دیکھ کر رادھا ونود بابو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،'' مچھیروں کی بستی کے پار جائیں گے کیا؟''

Scanned with CamScanner

''ہاں، لیکن زیادہ دور نہیں، ایک آدھ میل۔''

راستے بھر رادھا ونود بابو ایک ہی بات کو تین بار دہراتے رہے، ''کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے، صاحب!''

ایک ادھیڑ آدمی کے ساتھ ڈیڑھ میل کا راستہ طے کرنے میں تقریباً ایک گھنٹے کا وقت لگ گیا۔ شام اتر چکی ہے۔ جب تک گھر کے پاس نہیں پہنچ جاتا ہوں تب تک یہ سمجھنا مشکل ہے کہ وہاں کوئی ہے یا نہیں۔ جتنا زیادہ ہم اس مکان کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، رادھا ونود بابو کا جوش اتنا ہی ڈھیلا پڑتا جا رہا ہے۔ آخر کار جب وہ مکان دس ہاتھ دور رہ گیا تو وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور بولے، ''آپ کا مطلب کیا ہے؟''

میں نے کہا، ''جب اتنی دور آ ہی چکے تو اور دس ہاتھ چلنے میں پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟''

آخر کار وہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ گھر کے پاس آنے پر ٹارچ روشن کرنا پڑی، کیونکہ اندر گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کل مٹی کے تیل کی جو ڈبیا جل رہی تھی، اسے اب تک جل جانا چاہیے تھا، مگر یہاں اندھیرا ہے۔

سامنے کے دروازے سے اندر جا کر جب ٹارچ جلائی تو دیکھا، ایک آدمی چت پڑا ہے۔ وہ آدمی ابھی تک مرا نہیں ہے، کیونکہ اس کا چوڑا سینہ ابھی تک پھول پچک رہا ہے۔

''یہ تو وہی نوکر ہے،'' رادھا ونود بابو نے بھرائی آواز میں کہا۔

''جی ہاں! یہ شتشٹھی چرن ہے۔''

''آپ کو اس کا نام بھی معلوم ہے؟''

اس بات کا جواب نہ دے کر میں بیٹھک کے اندر چلا گیا۔ کمرہ خالی ہے، پروفیسر کا وہاں کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ وہاں سے نکل کر میں اس کی تجربہ گاہ کے اندر گیا۔

یہ کمرہ بھی بیٹھک کی طرح لمبا چوڑا ہے۔ میز پر ایک طرف سارے سامان کا ڈھیر لگا ہے — شیشی، بوتل، کانٹا، چھری، دوا دارو وغیرہ۔ ایک تیز بو سے کمرہ بھرا ہوا ہے۔ بچپن میں چڑیا گھر میں جانوروں کے پنجرے کے سامنے کھڑا ہونے پر اسی طرح کی بو کا احساس ہوا تھا۔

''ارے، اس آدمی کا کرتا تو یہیں پڑا ہے!'' رادھا ونود بابو چیخ پڑے۔

Scanned with CamScanner

آج صبح اس کرتے پر میری نظر بھی پڑ چکی تھی۔ تین چوتھائی آستین والا بھورے رنگ کا کرتا ہے، سینے کے پاس سفید بٹن... اس میں شک نہیں کہ یہ گھنشیام بابو کا ہی کرتا ہے۔

اور اس کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہی ایسے خوفناک حالات میں بھی رادھا ونود بابو چونک پڑے — انھیں اپنی سونے کی گھڑی مل گئی تھی۔

''یہاں کیا کیا جاتا ہے؟ یہ سامان یہاں کیوں ہے؟ کرتا ہے، جیب میں گھڑی موجود ہے، مگر وہ پٹھا کہاں چلا گیا؟ اس بوڑھے کا بھی پتا نہیں چل رہا ہے!''

میں نے کہا، ''یہ تو دیکھ ہی رہے ہیں کہ وہ اندر نہیں ہیں۔ باہر چلیے۔''

ششٹھی چرن اب بھی بے ہوش پڑا ہے۔ اسے پھلانگتے ہوئے ہم گھر کے باہر ریت پر آئے۔ سمندر کی طرف تاکنے پر ہلکے اندھیرے میں ایک آدمی دکھائی دیا۔ وہ اسی طرف آرہا ہے۔ جب وہ تھوڑا اور قریب آگیا تو میں نے اس پر ٹارچ ڈالی — پروفیسر ج ج ج آرہے ہیں۔

''مشٹ انگل جی ہیں؟''

''جی ہاں، میں ہمانشو چودھری ہوں۔''

''تھوڑی دیر پہلے کیوں نہیں آئے؟'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

'وہ تو چلا گیا۔ تصویر کے جیسا آدمی مل گیا تھا۔ ایک ہی گھنٹے میں میں نے جوڑ دیا۔ مزے سے گھومنے پھرنے لگا، بات چیت بھی کی۔ ششٹھی چرن ڈرنے لگا تو اس کے سر پر مُد گردے پٹکا اور اس کے بعد سیدھا سمندر کی طرف چلا گیا۔ سوچا پکاروں مگر نام تو کچھ تھا ہی نہیں کہ پکارتا... آدمی کا سر، شیر کے پیر، سیپی کی پیٹھ، بکری کے سینگ... لیکن پانی کے اندر کیوں چلا گیا، سمجھ میں نہیں آیا...''

بات کرتے کرتے وہ اپنے تاریک گھر کے اندر چلا گیا۔ اب تک میری ٹارچ کی روشنی اس پر پڑ رہی تھی، اب نیچے کی طرف روشنی پڑی تو ریت پر پیروں کے نشان دکھائی دیے، پیروں کے تازہ نشان — پیر نہیں بلکہ پنجے کہنا چاہیے۔

نشانوں کے سہارے ہم آگے بڑھتے گئے۔ آہستہ آہستہ ہم بھیگی ریت کے پاس پہنچے۔ بھیگی ریت پر نشان اور بھی صاف تھے۔ کیکڑوں کے گڈھے کی بغل سے ہوتی ہوئی، ناقابل شمار سیپیوں پر

Scanned with CamScanner

سے ہوتے ہوئے پنجوں کے وہ نشان پانی کی طرف جاکر سمندر میں گم ہو گئے تھے۔

اتنی دیر کے بعد رادھاونود بابو کے منھ سے آواز نکلی: "سب کچھ تو سمجھ گیا۔ وہ آدمی ذرا پاگل ہے، آپ شاید نیم پاگل ہیں، مگر میرے ہوٹل کا وہ چور باشندہ کہاں چلا گیا؟"

اپنے ہاتھ کے آرا مچھلی کے دانت کو پانی میں پھینک کر ہوٹل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے کہا: "اس کی تحقیقات پولیس سے کرنے کو کہیے۔ کرتا جب یہاں ملا ہے تو یہیں تلاش کرنے کو کہیے۔ اور ہاں، مجھے اندیشہ اس بات کا ہے کہ راز کا پتا لگاتے لگاتے پولیس بھی کہیں میری ہی طرح نہ ہو جائے — یعنی فرض ناشناس۔"

Scanned with CamScanner

فرِنس

جینت کی طرف کچھ دیر تکتے رہنے کے بعد سوال کیے بغیر نہ رہ سکا، ''آج تو بہت مرا مرا سا لگ رہا ہے؟ طبیعت خراب ہے کیا؟''

جینت بچے کی طرح ہنس دیا اور کہا، ''نہ! طبیعت خراب نہیں ہے بلکہ تازگی ہی محسوس کر رہا ہوں۔ واقعی جگہ بہت اچھی ہے۔''

''تیری تو جانی پہچانی جگہ ہے۔ پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ جگہ اتنی خوبصورت ہے؟''

''بھول ہی چکا تھا'' جینت نے ایک لمبی سانس لی۔ ''اتنے دنوں کے بعد آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ بنگلہ پہلے جیسا ہی ہے۔ کمروں میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ فرنیچر بھی پرانے زمانے کا ہی ہے، جیسے بینت کی یہ میز اور کرسیاں۔''

بیرا ٹرے میں چائے اور بسکٹ لے آیا۔ ابھی صرف چار ہی بجے ہیں مگر دھوپ ڈھلنے لگی ہے۔ چائے دانی سے چائے انڈیلتے ہوئے میں نے پوچھا؟ ''کتنے دنوں بعد یہاں آنا ہوا؟''

جینت نے کہا، ''اکتیس سال کے بعد۔ اس وقت میں چھ سال کا تھا۔''

ہم لوگ جس جگہ بیٹھے ہیں، وہ بوندی شہر کے سرکٹ ہاؤس کا باغیچہ ہے۔ آج صبح ہم لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ جینت میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم ایک ہی اسکول اور کالج میں ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ آج کل وہ ایک اخبار میں نوکری کرتا ہے اور میں اسکول میں پڑھانے کا کام۔ ہماری نوکری پیشہ زندگی الگ ہونے کے باوجود ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہم لوگوں نے بہت پہلے ہی راجستھان گھومنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ چھٹی ملنے میں دقت ہو رہی تھی، آج اتنے دنوں کے بعد یہ ممکن ہوا ہے۔ عموماً لوگ جب راجستھان آتے ہیں تو شروع میں جے پور، چتوڑ اور اُدے پور ہی دیکھتے ہیں، مگر جینت شروع سے ہی بوندی جانے پر زور دے رہا تھا۔ میں نے بھی

Scanned with CamScanner

اعتراض نہیں کیا کیونکہ بچپن میں میں نے رابندر ناتھ کی ''بوندی کا قلعہ'' نظم پڑھی تھی اور اس قلعے کو اتنے عرصے کے بعد دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ زیادہ تر لوگ بوندی نہیں آتے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ یہاں دیکھنے کے لائق کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اُدے پور، جودھپور اور چتوڑ کی اہمیت زیادہ ہے مگر خوبصورتی کے لحاظ سے بوندی کسی سے کم نہیں ہے۔

جینت نے جب بوندی کے بارے میں اتنا زور دیا تھا تو مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ جب ٹرین سے آنے لگا تو اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ بچپن میں ایک بار وہ بوندی آچکا ہے، اس لیے اُن پرانی یادوں کے ساتھ نئے سرے سے ملنے کی خواہش اس کے دل میں شدت اختیار کر رہی تھی۔ جینت کے والد امیداس گپتا آثار قدیمہ میں ملازم تھے، اس لیے انھیں بیچ بیچ میں تاریخی مقامات کا معائنہ کرنا پڑتا تھا۔ اسی سلسلے میں جینت بھی بوندی ہو آیا تھا۔

سرکٹ ہاؤس واقعی بہت ہی خوبصورت ہے۔ انگریزوں کے زمانے کا ہے، سو سال سے کم پرانا نہ ہوگا۔ ایک منزلہ عمارت، ٹائلوں کی چھاوٗنی کی ہوئی ڈھال اور چھت، کمرے اونچے اونچے۔ اوپر کی طرف اسکائی لائٹ ہے جسے رسی کھینچ کر حسبِ منشا کھولا یا بند کیا جا سکتا ہے۔ مشرق کی طرف برآمدہ ہے۔ اس کے سامنے وسیع احاطے کی کیاریوں میں گلاب کھلے ہوئے ہیں۔ باغیچے کے پچھلے حصے میں کئی قسم کے بڑے بڑے پیڑ ہیں، جن پر ان گنت چڑیاں بیٹھی رہتی ہیں۔ طوطے بھی ہیں۔ مور کی آواز بھی بیچ بیچ میں سنائی دیتی ہے، مگر اتنی بات ضرور ہے کہ وہ آواز احاطے کے باہر سے آتی ہے۔

ہم صبح پہنچنے کے ساتھ ہی ایک بار شہر کا چکر لگا چکے ہیں۔ پہاڑ پر بوندی کا مشہور قلعہ ہے۔ آج دور سے دیکھ رہے ہیں، کل ہم اندر جا کر دیکھیں گے۔ معلوم ہوتا ہے شہر میں بجلی کے کھمبے نہیں ہیں۔ ہم پرانے راجپوت زمانے میں چلے آئے ہیں۔ سڑکیں پتھر کی بنی ہیں، مکانوں کے سامنے دو منزلے سے ٹنگے ہوئے نقاشی کیے برآمدے ہیں۔ لکڑی کے دروازوں پر بھی ماہر ہاتھوں سے نقاشی کی گئی ہے۔ دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ ہم مشینی تہذیب کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔

یہاں آنے پر میں نے غور کیا کہ جینت عام طور سے جتنی باتیں کرتا ہے نسبتاً یہاں کم باتیں کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے، بہت سی پرانی یادیں اس کے دل میں واپس آ رہی ہوں۔ بچپن کی کسی پرانی جگہ بہت دنوں کے بعد آنے سے دل اداس ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور جینت عام لوگوں سے

Scanned with CamScanner

کچھ زیادہ ہی جذباتی ہے، یہ بات سبھی کو معلوم ہے۔

چائے کی پیالی ہاتھ سے نیچے رکھ کر جینت نے کہا، ''معلوم ہے، شنکر، بہت ہی عجیب بات ہے۔ شروع میں جب یہاں آیا تھا تو ان کرسیوں پر میں پاؤں موڑ کر بابو صاحب کی طرح بیٹھا کرتا تھا۔ لگتا جیسے میں کسی تخت پر بیٹھا ہوا ہوں۔ اب دیکھ رہا ہوں، کرسیاں لمبائی چوڑائی میں بڑی نہیں ہیں اور دیکھنے میں بھی بہت معمولی ہیں۔ سامنے جو ڈرائنگ روم ہے، اس سے دگنا معلوم ہوتا تھا۔ اگر آج میں یہاں نہ آتا تو بچپن کے بہت سے مفروضے ویسے کے ویسے ہی بنے رہتے۔''

میں نے کہا، ''فطری بات ہے، بچپن میں ہم چھوٹے رہتے ہیں، اس کے مطابق آس پاس کی چیزیں بڑی لگتی ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہم بڑھتے جاتے ہیں، مگر چیزیں تو بڑھتی نہیں۔''

چائے ختم کر کے باغیچے میں چہل قدمی کرتے کرتے اچانک جینت چونک کر کھڑا ہو گیا اور بولا، ''دیودارو...''

اس کی بات سن کر حیران ہو کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ پھر کہنے لگا، ''دیودارو کا ایک پیڑ ادھر ہونا چاہیے تھا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے پیڑ پودوں کے بیچ سے ہوتا ہوا احاطے کے کونے کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک جینت کو دیودارو کے ایک پیڑ کی یاد کیوں آ گئی؟

چند لمحوں کے بعد جینت کی خوشی سے بھری ہوئی آواز سنائی دی، ''ہے، اِٹس ہیئر! جہاں تھا ٹھیک وہیں...''

میں نے آگے بڑھ کر کہا، ''اگر پیڑ رہا ہوگا تو وہ جس جگہ تھا وہیں ہوگا۔ پیڑ چہل قدمی نہیں کرتے۔''

جینت نے ناراضگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''وہیں ہے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ پیڑ نے اپنی جگہ نہیں بدلی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے پیڑ کے جہاں ہونے کا اندازہ لگایا تھا، وہیں ہے۔''

''لیکن پیڑ کی بات تمھیں اچانک کیوں یاد آ گئی؟''

جینت کچھ دیر تک بھنویں سکوڑ ایک ٹک پیڑ کی طرف دیکھتا رہا، اس کے بعد آہستگی سے سر ہلا کر کہا، ''وہ بات اب یاد نہیں آ رہی ہے۔ کسی وجہ سے میں اس پیڑ کے پاس گیا تھا اور وہاں جا کر کچھ کیا

تھا۔ ایک انگریز۔۔۔''

''انگریز؟''

''نہ، کچھ بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔ یادداشت کا معاملہ واقعی بہت عجیب ہے۔''

یہاں کا باورچی کھانا اچھا پکاتا ہے۔ رات میں ڈائننگ روم میں بیضوی میز پر بیٹھ کر جینت نے کھانا کھاتے ہوئے کہا، ''ان دنوں جو باورچی تھا، اس کا نام دلاور تھا۔ اس کے بائیں گال پر ایک نشان تھا، چھری کا نشان۔ اور اس کی آنکھیں ہمیشہ اڑھل کے پھول کی طرح لال رہتی تھیں۔ مگر کھانا بہت عمدہ پکاتا تھا۔''

کھانا کھانے کے بعد جینت جب صوفے پر بیٹھا تو آہستہ آہستہ اور بھی پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس کے والد کس صوفے پر بیٹھ کر تمبا کونوشی کرتے تھے، ماں کہاں بیٹھ کر سویٹر بنتی تھیں، میز پر کون کون سے رسالے رکھے رہتے تھے — ساری باتیں اسے یاد آ گئیں، اور اسی طرح اسے پتلے کی بات بھی یاد آ گئی۔ پتلے کا مطلب لڑکیوں کی گڑیا یا پتلی نہیں۔ جینت کے ماما نے سوئٹزرلینڈ سے دس بارہ انچ لمبی سوئس لباس پہنے ایک بوڑھے کی مورتی اسے لا کر دی تھی۔ دیکھنے میں وہ ایک چھوٹے سے زندہ آدمی کی طرح لگتی تھی۔ اندر کوئی کل قبضہ نہیں تھا، مگر ہاتھ، پاؤں، انگلیاں اور کمر اس قسم کی بنی تھیں کہ حسب منشا اسے گھمایا پھرایا جا سکتا تھا۔ چہرے پر ہمیشہ ایک مسکراہٹ تیرتی رہتی تھی۔ سر پر ایک چھوٹی سی سوئس پہاڑی ٹوپی تھی جس پر پر لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ لباس میں بھی کوئی خامی نہیں تھی۔ بیلٹ، بٹن، پاکٹ، کالر، موزہ، یہاں تک کہ جوتے کے بکسوئے میں بھی کوئی خامی نہیں تھی۔

پہلی بار جینت جب بوندی آیا تھا تو اس کے کچھ پہلے ہی اس کے ماما ولایت سے لوٹ آئے تھے اور انھوں نے جینت کو وہ پتلا دیا تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے کسی گاؤں میں ایک بوڑھے سے انھوں نے وہ پتلا خریدا تھا۔ بوڑھے نے کہا تھا کہ اس کا نام فرنس ہے اور اسی نام سے اسے پکارنا۔ دوسرے نام سے پکاریں گے تو جواب نہیں ملے گا۔

جینت نے کہا، ''بچپن میں مجھے کتنے ہی کھلونے ملے تھے۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے انھوں نے کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی۔ مگر ماما نے جب مجھے فرنس دیا تو میں اپنے تمام کھلونوں کو بھول گیا۔ رات دن اسی کو لے کر پڑا رہتا، یہاں تک کہ ایسا وقت آیا جب میں فرنس سے

Scanned with CamScanner

گھنٹوں بات چیت کرنے لگا۔ بات بے شک یک طرفہ رہتی تھی، مگر فرنس کے چہرے پر ایک ایسی ہنسی اور آنکھوں کی نظر میں ایک ایسا جذبہ رہتا تھا کہ مجھے محسوس ہوتا وہ میری بات سمجھ لیتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا بھی محسوس ہوتا کہ اگر میں بنگلہ کے بجائے جرمن زبان میں بات چیت کرسکتا تو بات چیت کا سلسلہ یک طرفہ نہ ہوکر دوطرفہ ہوتا۔ اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے وہ بچپنا اور پاگل پن تھا، مگر ان دنوں یہ بات میرے لیے بالکل حقیقت جیسی تھی۔ ماں اور بابو بھی منع کرتے تھے، مگر میں کسی بھی بات پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ تب میں نے اسکول جانا شروع نہیں کیا تھا، اس لیے فرنس کو وقت نہ دے پانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''

اتنا کہہ کر جینت خاموش ہوگیا۔ گھڑی کی طرف دیکھنے پر پتا چلا کہ رات کے ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ ہم سرکٹ ہاؤس کی بیٹھک میں لیمپ جلا کر بیٹھے تھے۔

میں نے پوچھا، ''پتلا کہاں چلا گیا؟'' جینت اب بھی جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ جواب، اتنی دیر کے بعد آیا کہ مجھے لگا اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

''پتلے کو بوندی لے آیا تھا، یہاں آکر ٹوٹ گیا۔''

''ٹوٹ گیا؟ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

جینت نے ایک لمبی سانس لی اور کہا، ''ایک دن ہم باہر برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ پتلے کو بغل میں گھاس پر رکھ دیا۔ پاس ہی بہت سے کتے جمع ہوگئے تھے۔ تب میں جس عمر کا تھا مجھے چائے نہیں پینا چاہیے تھی مگر میں نے ضد کرکے چائے لے لی اور پینے لگا۔ چائے کی پیالی اچانک ترچھی ہوگئی اور تھوڑی سی گرم چائے میری پتلون پر گر گئی۔ بنگلے کے اندر جا کر میں نے پتلون بدلی اور اس کے بعد جب باہر آیا تو پتلے کو وہاں نہیں پایا۔ تلاش کرنے پر دیکھا تو معلوم ہوا سڑک پر دو کتے میرے فرنس کو لے کر کھیل رہے ہیں۔ چونکہ وہ بہت مضبوط چیز تھی اس لیے پھٹ کر دو ٹکڑوں میں نہیں بٹی۔ لیکن اس کا چہرہ مسخ ہوگیا اور کپڑا پھٹ گیا۔ یعنی میرے لیے فرنس کا کوئی وجود ہی نہ رہا۔ ہی واز ڈیڈ۔''

''اس کے بعد؟'' جینت کی کہانی مجھے بے حد دلچسپ لگ رہی تھی۔

''اس کے بعد کیا؟ رسوم کے مطابق فرنس کی تدفین کردی گئی۔''

''اس کا مطلب؟''

Scanned with CamScanner

''اس دیودارو کے نیچے اسے دفنا دیا گیا۔ آرزو تھی، تابوت کا انتظام کروں کیونکہ ولایتی آدمی تھا نا! کوئی بکسا ہوتا تو بھی کام چل جاتا۔ بہت ڈھونڈنے اور تلاش کرنے پر بھی کچھ نہ ملا۔ اس لیے آخر کار اسی طرح دفنا دیا۔''

اتنی دیر کے بعد دیودارو کے پیڑ کا راز میرے سامنے کھل سکا۔

دس بجے ہم سونے چلے گئے۔

ایک خاصے بڑے بیڈروم میں الگ الگ پلنگوں پر ہمارے بستر بچھے تھے۔ کلکتہ میں پیدل چلنے کی عادت نہیں تھی۔ ایک تو یوں بھی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور اس پر ڈنلپ پلو سر کے نیچے رکھتے ہی دس منٹ کے اندر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

رات کافی ہو چکی تھی، معلوم نہیں کس چیز کی آواز سے نیند ٹوٹ گئی۔ بغل کی طرف مڑنے پر جینت کو بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کی بغل میں ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں جینت کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا، ''کیا ہوا؟ طبیعت خراب ہے کیا؟''

اس بات کا جواب نہ دے کر جینت ایک دوسرا ہی سوال پوچھ بیٹھا، ''سرکٹ ہاؤس میں بلی یا چوہے کے قبیل کی کوئی چیز ہے؟''

میں نے کہا، ''اگر ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ مگر تم ایسا کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''سینے پر چڑھ کر کوئی چیز چلی گئی اور اسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔''

میں نے کہا، ''چوہا عام طور سے نالی سے آتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ چوہا پلنگ پر چڑھتا ہے یا نہیں۔''

جینت نے کہا، ''اس کے پہلے بھی ایک بار میری نیند ٹوٹ چکی ہے۔ تب کھڑکی سے کچھ کچھ کی سی آواز آ رہی تھی۔''

''اگر کھڑکی سے آواز آئی ہے تو زیادہ امکان بلی کے ہی ہو سکتے ہیں۔''

''مگر...''

جینت کے دل سے وہم دور نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، ''روشنی کرنے پر کسی چیز پر نظر نہیں پڑی؟''

Scanned with CamScanner

''نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ آنکھ کھلتے ہی بتی نہیں جلائی تھی۔ شروع میں چونک اٹھا، سچ کہوں تو تھوڑا تھوڑا ڈر بھی لگ رہا تھا۔ روشنی جلانے کے بعد کسی چیز پر نگاہ نہیں پڑی۔''

''اس کا مطلب یہ کہ اگر کوئی چیز کمرے کے اندر آئی ہوگی تو وہ کمرے کے اندر ہی ہوگی، دروازہ جب کہ بند ہے۔۔۔''

میں فوراً بستر سے نیچے اتر آیا اور گھر کے ہر کونے میں، پلنگ کے نیچے، سوٹ کیس کے پیچھے، ہر طرف تلاش کیا۔ کہیں کچھ نہ تھا۔ باتھ روم کے کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ میں اس کے اندر بھی تلاش کرنے گیا۔ تبھی جینت نے آہستگی سے مجھے پکارا:

''شنکر!''

میں کمرے کے اندر لوٹ آیا۔ دیکھا، جینت اپنی رضائی کے سفید غلاف کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں جب اس کے پاس گیا تو اس نے رضائی کے ایک حصے کو، روشنی کی طرف بڑھا کر کہا: ''دیکھو تو، یہ کیا ہے؟''

میں نے جب جھک کر کپڑے کی طرف دیکھا تو اس پر ہلکے کتھئی رنگ کے گول گول نشانات دکھائی دیے۔ میں نے کہا: ''بلی کے پنجے کے نشان ہو سکتے ہیں۔''

جینت کچھ نہیں بولا۔ پتا نہیں کیوں وہ بے حد فکر مند ہو گیا تھا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اتنی کم نیند سے میری تھکاوٹ دور نہیں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کل دن بھر چکر لگانا ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر کہ میں برابر میں ہی ہوں، ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، اور یہ نشان پہلے کے بھی ہو سکتے ہیں، میں نے اسے دلاسا دیا اور بتی بجھا کر دوبارہ لیٹ گیا۔ مجھے اس بات کا بالکل شبہ نہیں تھا کہ جینت نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت ہے؛ شاید اس نے ایک خواب دیکھا ہے۔ بونڈی آنے پر اسے پرانی باتیں یاد آ گئی ہیں اور وہ ذہنی تناؤ میں ہے۔ اسی وجہ سے بلی کے چلنے کا خواب دیکھا ہوگا۔

رات میں اگر کوئی اور واقعہ پیش آیا ہو تو اس بارے میں مجھے کوئی علم نہیں۔ جینت نے بھی صبح اٹھنے کے بعد کسی نئے تجربے کے بارے میں نہیں بتایا۔ مگر ہاں، دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات ٹھیک سے سویا نہیں ہے۔ میں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ میرے پاس جو نیند کی ٹکیہ ہے، آج رات سونے سے پہلے وہ جینت کو کھلا دوں گا۔

Scanned with CamScanner

اپنے پلان کے مطابق ہم ناشتہ کر کے نو بجے بوندی کا قلعہ دیکھنے چلے گئے۔ گاڑی کا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا۔ قلعہ پہنچتے پہنچتے ساڑھے دس بج گئے۔

یہاں آنے پر بھی جینت کو بچپن کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ خوش قسمتی سے پتلے سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ سچ کہوں، جینت کی حرکات دیکھ کر لگ رہا تھا وہ پتلے کی بات بھول چکا ہے۔ وہ ایک ایک چیز کو دیکھتا ہے اور چلا اٹھتا ہے، ''گیٹ کے اوپر وہی ہاتھی ہے! یہ وہی چاندی کا پلنگ اور تخت ہے! دیوار پر یہ تصویر بھی بالکل وہی ہے!''

مگر ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد جوش کم ہونے لگا۔ میں اتنا محو تھا کہ شروع میں اسے سمجھ نہ سکا۔ میں ایک لمبی کوٹھری میں چہل قدمی کر رہا تھا اور چھت کے جھاڑ فانوسوں کو دیکھ رہا تھا کہ تبھی مجھے خیال آیا، جینت میرے آس پاس نہیں ہے۔ وہ کہاں گیا؟

ہمارے ساتھ ایک گائیڈ تھا۔ اس نے کہا، ''بابو باہر چھت کی طرف گئے ہیں۔''

دربان گھر دیکھ کر جب میں باہر آیا تو جینت کو تھوڑی دور پر، چھت کی دوسری طرف، دیوار کے پاس بے چین سا کھڑا پایا۔ وہ اتنا زیادہ فکر مند تھا کہ جب میں اس کی بغل میں جا کر کھڑا ہوا تو اسے احساس تک نہ ہوا۔ آخر جب میں نے نام لے کر اسے پکارا تو وہ چونک گیا۔ میں نے پوچھا، ''تجھے کیا ہوا ہے؟ سچ سچ بتا۔ اتنی خوبصورت جگہ آ کر بھی تو چپ چاپ منھ سی کر پڑا رہے گا تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔''

جینت نے اتنا ہی کہا، ''مجھے جو دیکھنا تھا دیکھ چکا ہوں، پھر اب...''

میں تنہا ہوتا تو ضرور ہی کچھ دیر تک رکتا، مگر جینت کا موڈ دیکھ کر سرکٹ ہاؤس لوٹنا ہی طے کیا۔

پہاڑ پر جو راستہ بنا ہوا ہے وہ شہر کی طرف چلا گیا ہے۔ ہم دونوں چپ چاپ گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ جینت کو میں نے سگریٹ پیش کی مگر اس نے نہیں پی۔ اس کے اندر ایک عجیب بے چینی تھی جو اس کے ہاتھوں کی حرکت سے ظاہر ہو رہی تھی۔ کبھی وہ کھڑکی پر ہاتھ رکھتا ہے، کبھی گود میں، پھر انگلیوں کو چٹخاتا ہے یا ناخن کو دانت سے کاٹتا ہے۔ جینت ایک سنجیدہ انسان ہے۔ اسے چھٹپٹاتے ہوئے دیکھ کر میں بھی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

دس منٹ تک جب یہ سلسلہ جاری رہا تو میں چپ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا: ''اپنی پریشانی کی وجہ مجھے بتادے تو ہوسکتا ہے تیرا کچھ بھلا ہو جائے۔''

جینت نے سر ہلا کر کہا، ''کہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ کہوں گا تو تو یقین نہیں کرے گا۔''

''یقین نہ بھی ہو، مگر اس موضوع پر تجھ سے رائے مشورہ تو کر ہی سکتا ہوں۔''

''کل رات فرنس ہمارے کمرے میں آیا تھا۔ رضائی پر فرنس کے پیروں کے نشان تھے۔''

اس بات پر جینت کے کندھوں کو جھنجھوڑنے کے سوا مجھے کچھ دوسرا کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جس کے دماغ میں ایک عجیب وہم گھر کر گیا ہے، کیا اسے کچھ کہہ کر سمجھایا جا سکتا ہے؟ پھر بھی میں نے کہا، ''تو نے اپنی آنکھوں سے تو کچھ نہیں دیکھا تھا؟''

''نہیں، مگر اتنی بات ضرور ہے کہ میرے سینے پر جو چیز چل رہی تھی وہ چار پیروں کی نہ ہو کر دو پیروں والی تھی، یہ بات میں صاف صاف سمجھ رہا تھا۔''

سرکٹ ہاؤس کے پاس آ کر گاڑی سے اترتے وقت میں نے طے کیا کہ جینت کو اعصابی طاقت والے ٹانک قسم کی کوئی چیز دوں گا۔ صرف نیند کی ٹکیہ سے کام نہیں چلے گا۔ بچپن کی ایک دھندلی سی یاد سینتیس سالہ جوان کو اتنا پریشان کر دے گی، یہ کسی بھی حالت میں نہیں ہونے دینا چاہیے۔

کمرے کے اندر آنے پر میں نے جینت سے کہا: ''بارہ بج چکے ہیں۔ اب نہا لینا چاہیے۔''

جینت نے کہا، ''پہلے تو نہا لے،'' اور وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔

نہاتے ہوئے میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ جینت کو اصلی حالت میں لانے کا یہی طریقہ ہے۔

مجھے جو خیال آیا وہ یہ کہ اگر پتلے کو کسی خاص جگہ دفنایا گیا ہے اور اگر اسے وہ خاص جگہ معلوم ہے تو اس جگہ کی مٹی کھودنے پر پتلا چاہے پہلے جیسی حالت میں نہ ملے مگر اس کا تھوڑا بہت حصہ تو مل ہی جائے گا۔ کپڑے لتے زمین کے نیچے تیس سال کے بعد نہیں رہ سکتے ہیں، مگر دھاتے کی چیزیں جیسے فرنس کے بیلٹ کا بکسوا، کوٹ کے پیتل کے بٹن اگر برقرار ہوں تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔ جینت کو اگر دکھایا جائے کہ اس کے لاڈلے پتلے کی صرف یہی چیزیں بچی ہوئی ہیں اور

Scanned with CamScanner

باقی سب مٹی میں سما گئی ہیں تو ممکن ہے کہ یہ واہیات خیال اس کے دل سے دور ہو جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ پھر رات ایک عجیب خواب دیکھے گا اور صبح جاگنے پر کہے گا کہ فرنس میری چھاتی پر چل رہا تھا۔ اس طرح کہیں اس کا دماغ نہ خراب ہو جائے۔

یہ بات جب میں نے جینت کو بتائی تو اسے میرا خیال اچھا لگا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا، ''کھودے گا کون؟ کدال کہاں ملے گی؟''

میں نے ہنس کر کہا، ''جب اتنا بڑا باغیچہ ہے تو مالی بھی ضرور ہوگا ہی اور مالی رہنے کا مطلب ہے کدال بھی ہے۔ اسے ہم کچھ بخشش دیں تو وہ میدان کی تھوڑی سی مٹی کھودنے میں آنا کانی نہیں کرے گا۔''

جینت فوراً راضی ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے بھی کچھ نہ کہا۔ ایک دو بار جب ڈانٹ پلائی تو وہ نہا دھو آیا۔ کھانے کا شوقین آدمی ہونے پر بھی دوپہر میں دو عدد روٹی اور گوشت کے شوربے کے سوا اس نے کچھ نہیں کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں باغیچے کی طرف کے برآمدے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے سوا سرکٹ ہاؤس میں کوئی نہیں ہے۔ دوپہر میں بھی سناٹا چھایا ہوا ہے۔ داہنی طرف روڑے بچھے راستے کے کنارے ایک گل مہر کے درخت پر کئی بندر بیٹھے ہیں۔

بیچ بیچ میں ان کی ہپ ہپ آواز سنائی دیتی ہے۔

تین بجنے پر ایک پگڑی والا آدمی ہاتھ میں جھاڑی لیے باغیچے میں آیا۔ عمر دراز آدمی ہے۔ بال، مونچھیں اور بھنویں سفید ہو چکی ہیں۔

''تم کہو گے یا میں کہوں؟''

جینت کے سوال پر میں نے دلاسے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور کرسی چھوڑ کر سیدھا مالی کے پاس چلا گیا۔

مٹی کھودنے کی فرمائش پر مالی نے شروع میں میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا۔ اس کے سوال ''کاہے بابو؟'' پر میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر شیریں آواز میں کہا کہ وہ اگر نہ جان سکے تو حرج ہی کیا ہے؟ ''پانچ روپے بخشش دوں گا، جو کہہ رہا ہوں، وہ کر دو۔''

یہ بات سن کر مالی نہ صرف راضی ہو گیا، بلکہ دانت نکال کر سلامی بھی دی اور ایسے اظہار کیا جیسے

وہ ہمارا زر خرید غلام ہو۔

برآمدے میں بیٹھے جینت کو میں نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ وہ کرسی چھوڑ کر میرے پاس چلا آیا۔ قریب آنے پر دیکھا غیر فطری طور پر بجھا ہوا سا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کھودنے کے بعد پتلے کا تھوڑا بہت حصہ ضرور ملے گا۔

اس درمیان مالی کدال لے آیا اور ہم تینوں دیودارو کے درخت کی طرف جانے لگے۔

پیڑ کے تنے کے تقریباً ڈیڑھ ہاتھ دور ایک مقام کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوے جینت نے کہا، ''یہیں۔''

''ٹھیک سے یاد ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔ جینت نے کہا کچھ نہیں، صرف سر کو ایک بار ہلا کر ہامی بھری۔ ''کتنا نیچے دفنایا تھا؟ ایک فٹ تو ہوگا ہی۔''

مالی بے جھجک اس جگہ کو کھودنے لگا۔ آدمی شوقین معلوم ہوتا ہے۔ کھودتے کھودتے پوچھنے لگا کہ زمین کے نیچے دھن اور دولت ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو اسے حصہ ملے گا یا نہیں؟ یہ بات سن کر میں تو ہنس دیا مگر جینت کے چہرے پر ہنسی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ اکتوبر میں بوندی میں گرمی نہیں پڑتی ہے مگر جینت کے کالر کا نچلا حصہ بھیگ گیا ہے۔ وہ ایک ٹک زمین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ مالی کدال چلائے جا رہا ہے۔ پتلے کا کوئی نشان ابھی تک کیوں نہیں نظر آیا ہے؟

ایک مور کی تیز آواز سن کر میں نے اپنا سر گھمایا۔ تبھی اسی وقت جینت کے گلے سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور اسی پل میری آنکھ اس طرف چلی گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے باہر نکل آئیں۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے کانپتے ہاتھ کو آہستہ سے بڑھا کر اپنی شہادت کی انگلی سے گڈھے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی انگلی بھی کانپ رہی ہے۔

اس کے بعد ایک عجیب، خشک اور خوفزدہ آواز میں اس نے کہا، ''وہ کیا چیز ہے؟''

مالی کے ہاتھ سے کدال زمین پر گر پڑی۔ زمین کی طرف غور کرنے پر جو منظر میں نے دیکھا اس کی وجہ سے ڈر، حیرت اور بے یقینی کے عالم میں میرے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

دیکھا گڈھے کے اندر خاک سے بھرا ہوا دس بارہ انچ کا ایک مکمل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہاتھ پیر پھیلائے چت پڑا ہوا ہے۔

Scanned with CamScanner

سنکی بابو

سنکی بابو کا اصلی نام پوچھ ہی نہ سکا۔ خاندانی نام ہے مکرجی۔ چہرہ ایک بار دیکھ لیا جائے تو بھلانا مشکل ہے۔ قد تقریباً چھ فٹ۔ بدن پر چربی کا نام نہیں ہے۔ پشت دھنش کی طرح ٹیڑھی۔ ہاتھ پاؤں، گلے اور گالوں سے بے شمار نسیں جلد کو ہٹا کر باہر نکل آنا چاہتی ہیں۔ ٹینس کالر والی سفید شرٹ، کالے فلالین کی پینٹ، سفید موزے، سفید کڈس۔ دار جیلنگ میں یہی پینٹ لباس تھا۔ اس کے علاوہ ان کے ہاتھ میں ایک مضبوط لاٹھی رہتی تھی۔ جنگل کی اوبڑ کھابڑ زمین پر گھومتے پھرنے کا عادی نہ ہونے کی وجہ سے، ہوسکتا ہے، لاٹھی کی ضرورت پڑتی ہو۔

دس سال قبل سنکی بابو سے میری جان پہچان ہوئی تھی۔ میں کلکتہ کے بینک میں نوکری کرتا ہوں۔ دس دنوں کی چھٹی باقی تھی۔ بیساکھ کے مہینے میں اپنے پیارے شہر دار جیلنگ پہنچ گیا۔ پہلے دن ہی سنکی بابو کے دیدار ہو گئے۔ یہ دیدار کس طرح ہوئے، یہی بتانے جا رہا ہوں۔

تیسرے پہر ساڑھے چار بجے ہوٹل سے چائے پی کر نکلا۔ بارش کا ایک ریلا دوپہر میں آچکا تھا، اب پھر کب آجائے، کہا نہیں جا سکتا۔ اس لیے بدن پر برساتی ڈال کر نکلا ہوں۔ دار جیلنگ کے سب سے دلکش، سب سے سنسان راستے جل پہاڑ روڈ سے ہوتا ہوا میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اچانک تقریباً پچاس ہاتھ کی دوری پر ایک موڑ پر ایک آدمی کو سڑک کے کنارے لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ جھک کر کسی چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ویسے وہ منظر کچھ زیادہ عجیب نہیں لگا۔ جنگلی پھول یا کیڑے مکوڑوں کے بارے میں دلچسپی ہونے پر آدمی اس طرح گھاس کی طرف نہار سکتا ہے۔ میں نے اس شخص پر ایک تجسس بھری نگاہ ڈالی اور پھر آگے بڑھنا شروع کیا۔

مگر اس کے نزدیک پہنچنے پر پتا چلا کہ میں اس بات کو جتنی عام سمجھ رہا تھا، اتنی نہیں ہے۔ اس آدمی کی محویت پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں پانچ ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا ہو کر اس کی حرکات و سکنات کا

Scanned with CamScanner

جائزہ لے رہا تھا مگر وہ مجھے پوری طرح نظر انداز کر کے پہلے کی طرح ہی جھک کر گھاس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بنگالی جان کر میں اس سے کچھ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''کوئی چیز گم ہوگئی ہے کیا؟''

کوئی جواب نہ ملا۔ یہ آدمی بہرا ہے کیا؟ میرا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔ اس واقعے کا انجام دیکھے بغیر نہیں جاؤں گا۔ میں نے ایک سگریٹ سلگائی۔ تقریباً تین منٹ کے بعد اس ساکت بدن میں جیسے جان آئی۔ وہ تھوڑا اور جھک گیا اور اپنے داہنے ہاتھ کو گھاس کی طرف بڑھایا۔

گھنی گھاس کے اندر اس کی انگلیاں داخل ہوئیں اور کچھ دیر بعد ہاتھ اوپر کو اٹھ آیا۔ انگوٹھے اور انگلی کے بیچ ایک چھوٹی سی گول چیز تھی۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ وہ ایک بٹن ہے، تقریباً اٹھنی جتنا بڑا۔ شاید کوٹ کا بٹن ہے۔

بٹن کو آنکھوں کے سامنے لا کر چند لمحوں تک اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے بعد زبان سے چار مرتبہ ''چچ چچ'' جیسی افسوس کا اظہار کرنے والی آواز نکالی اور اسے قمیص کی جیب میں رکھ کر، مجھے نظر انداز کر کے، وہاں سے چلا گیا۔

شام کو لوٹتے وقت مال کے سامنے، فوارے کے پاس دار جیلنگ کے پرانے باشندے ڈاکٹر بھومِک سے ملاقات ہوگئی۔ وہ کالج کے دنوں میں بابوجی کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔

انھیں آج تیسرے پہر کا قصہ سنائے بغیر نہ رہ سکا۔ قصہ سننے کے بعد بھومک صاحب نے کہا،

''حلیے سے تو سنکی بابو معلوم ہوتے ہیں۔''

''سنکی بابو؟''

''سیڈ کیس۔ نام یاد نہیں ہے، خاندانی نام ہے مکرجی۔ تقریباً پانچ سال سے دار جیلنگ میں رہ رہے ہیں۔ گرینڈ لیز بینک کے پاس ہی کرائے کے ایک مکان میں رہتے ہیں۔ کٹک کے ریونشا کالج میں فزکس کے پروفیسر تھے۔ جرمن یونیورسٹی کی ڈگری ان کے پاس ہے۔ سنا ہے، طالب علم کی حیثیت سے بڑے ذہین تھے۔ نوکری چھوڑ کر یہیں چلے آئے ہیں۔ شاید تھوڑی بہت باپ دادا کی جائیداد ہے۔''

Scanned with CamScanner

''آپ سے جان پہچان ہے؟''

''شروع میں ایک بار میرے پاس آئے تھے۔ راستے میں پھسل کر گر جانے کی وجہ سے سپلک ہو گیا تھا۔ میں نے ٹھیک کر دیا تھا۔''

''مگر سنکی بابو نام...؟''

بھومک صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''ان کے ایک بے ڈھب شوق کے چلتے یہ نام پڑ گیا ہے۔ لیکن یہ نام کس نے رکھا ہے، کہنا مشکل ہے۔''

''شوق کیا ہے؟''

''تم تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ راستے میں پڑے ایک بٹن کو اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ یہی ہے ان کا شوق یا ہابی۔ اِدھر اُدھر سے چیزیں اٹھا کر بہت سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔''

''کوئی بھی چیز؟'' پتا نہیں کیوں اس آدمی کے تئیں میرے دل میں تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر بھومک نے کہا، ''ہم اسے معمولی چیز کہیں گے، مگر وہ دعویٰ کریں گے کہ بہت ہی قیمتی چیز ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ جڑا ہوا ہے۔''

''مگر انھیں اس کی معلومات کس طرح حاصل ہوتی ہیں؟''

ڈاکٹر بھومک نے اپنی دستی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''یہ بات تم انھیں سے پوچھ لو۔ کوئی ملنے والا ہاتھ آ جائے تو انھیں خوشی ہوتی ہے، کیونکہ ان کے پاس گپوں کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ انھوں نے جن جن چیزوں کو جمع کیا ہے، ہر ایک کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی ہے۔ سب کی سب وائلڈ اور نانسینس۔ اور ہاں، وہ انھیں سنا کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمھیں سن کر خوشی ہوگی یا نہیں...

دوسرے دن ناشتہ کرنے کے بعد میں باہر نکلا۔ گرنڈلیز بینک کے پاس سنکی بابو کا مکان ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہ ہوئی، کیونکہ محلے کا ہر شخص انھیں پہچانتا ہے۔ سترہ نمبر کے مکان کے دروازے پر دستک دیتے ہی وہ باہر نکل آئے۔ حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

''کل آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا تھا، مگر اس وقت میں جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

ایسے وقت میں توجہ بٹ جائے تو بھاری مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اندر آیئے۔''

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی جس چیز پر سب سے پہلے میری نظر پڑی، وہ ایک الماری تھی۔ بائیں طرف کی دیوار کے آدھے حصے تک پھیلی ہوئی، شیشے سے آراستہ اس الماری کے ہر خانے میں ایک کے بغل میں دوسری چیز رکھی ہے۔ وہ حالانکہ بالکل معمولی چیزیں ہیں، مگر ایک سے دوسری کا کوئی میل نہیں ہے۔ سرسری نگاہ دوڑانے پر میری نظریں ایک شیلف پر گئیں۔ وہاں پیڑ کی ایک جڑ، ایک زنگ آلود تالا، ایک پرانے زمانے کا گولڈ فلیک کا ٹین، ایک اون بننے کی سلائی، جوتے صاف کرنے کا ایک برش، اور ٹارچ لائٹ کی ایک بیٹری تھی۔ میں حیران ہو کر ان چیزوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ تبھی انھوں نے کہا، ''ان چیزوں کو دیکھنے سے آپ کو کوئی خاص خوشی حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ ان چیزوں کی قیمت صرف میں ہی جانتا ہوں۔''

میں نے کہا، ''سنا ہے ان چیزوں کے پیچھے چند خاص واقعات کا ہاتھ ہے۔''

''ہے۔''

''مگر ایسی بات تو ہر چیز کے ساتھ رہتی ہے۔ جیسے آپ جس گھڑی کو ہاتھ میں پہنے ہیں...''

شریف شخص نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روکا اور کہا، ''واقعہ تو ضرور موجود رہتا ہے، مگر سبھی چیزوں پر اس واقعے کی چھاپ نہیں رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن پر چھاپ رہتی ہے۔ جیسے کل کا یہ بٹن...''

کمرے کے داہنی طرف ایک رائٹنگ ڈیسک پر بٹن رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے بٹن کو میری طرف بڑھایا۔ کتھئی رنگ کا کوٹ کا بٹن ہے۔ اس میں مجھے کوئی خصوصیت نظر نہیں آئی۔

''سمجھ میں کچھ آرہا ہے؟''

مجھے ''نہیں'' کہنا پڑا۔

سنگی بابو نے کہا، ''یہ بٹن ایک صاحب کے کوٹ کا ہے۔ وہ صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر جل پہاڑ روڈ سے گزر رہے تھے۔ عمر ساٹھ کے آس پاس۔ رائیڈنگ کے لباس میں تھے۔ تندرست، طاقتور ملٹری بدن۔ جہاں یہ بٹن ملا ہے، وہیں آنے پر دل کا دورہ پڑا۔ گھوڑے سے گر پڑے۔ ان پر دو راہگیروں کی نظر پڑی اور وہ دوڑ کر آئے، مگر تب تک ان کی موت ہو چکی تھی۔ گھوڑے سے گرتے وقت

ہی بٹن ٹوٹ کر سڑک کے کنارے گر پڑا۔''

''یہ سب کیا آپ دیکھ لیتے ہیں؟''

''وو ڈی، جتنا زیادہ دل لگاتا ہوں، اتنا ہی صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کی خاص قسم کی خوبی سے بھرپور چیزوں کے پاس آتے ہی میں اپنے سر میں درد محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اس کے بعد میری نظر دھندلی ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے نیچے گر پڑوں گا۔ مگر اس کے بعد منظر صاف نظر آنے لگتے ہیں اور میرے پیر سیدھے ہو جاتے ہیں۔ اس تجربے کی وجہ سے میرے جسم کی حرارت بڑھ جاتی ہے۔ ایسا ہر بار ہوتا ہے۔ کل رات تقریباً آٹھ بجے تک بخار تھا۔ اتنا ضرور ہے کہ بخار زیادہ دیر تک نہیں رہتا ہے۔ اب میں بالکل تندرست ہوں۔''

بات عجیب ہونے پر بھی مجھے دلچسپ لگ رہی تھی۔ میں نے کہا، ''آپ دو چار مثالیں اور دے سکتے ہیں؟''

سنکی بابو نے جواب دیا، ''الماری مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ جو کاپی دیکھ رہے ہیں، اس میں ہر واقعے کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ آپ کس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟''

میں کچھ بولوں اس سے پہلے ہی انھوں نے الماری کا شیشہ ہٹایا اور خانے میں سے دو چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں — ایک بہت ہی پرانا چمڑے کا دستانہ اور ایک چشمے کا شیشہ۔

''اس دستانے کو دیکھ رہے ہیں نا؟'' سنکی بابو نے کہا، ''اسے میں نے سب سے پہلے حاصل کیا تھا۔ یعنی یہ میرے ذخیرے کی پہلی چیز ہے۔ اسے میں نے سوئٹزرلینڈ کے لسرن شہر کے باہر ایک جنگل سے حاصل کیا تھا۔ تب مار برگ میں میری تعلیم کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اپنے وطن لوٹنے سے قبل میں گھوم پھر کر کانٹینینٹ دیکھ رہا تھا۔ صبح سیر کے لیے لسرن میں نکلا تھا۔ راستہ سنسان جنگل سے ہو کر گزرتا ہے۔ ستانے کے خیال سے ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا، تبھی پاس ہی ایک درخت کے تنے کے نیچے دستانے کے انگوٹھے پر میری نظر پڑی اور ساتھ ہی ساتھ میرا سر درد کرنے لگا۔ اس کے بعد آنکھوں کے سامنے دھندلا پن چھا گیا۔ اس کے بعد آنکھوں کے سامنے تصویر آئی۔ ایک شخص دیکھنے میں اچھا عالی نسب، منھ میں لمبا ٹیڑھا پائپ، دستانے پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے، سڑک پر پیدل چلا جا رہا ہے۔ اچانک جھاڑی کے پیچھے سے دو آدمی نکل کر آتے ہیں اور اس پر حملہ کر دیتے ہیں۔ بے بس ہو کر ہاتھ

پیر پٹکتا ہے۔ اٹھا پٹک میں اس کے داہنے ہاتھ کا دستانہ گر جاتا ہے۔ حملہ آور اس پر سوار ہو گئے اور بیدردی کے ساتھ اس کو قتل کر کے، کوٹ کی جیب سے روپیہ پیسہ اور ہاتھ سے سونے کی گھڑی نکال کر رفو چکر ہو گئے۔''

''کیا سچ مچ اس طرح کا واقعہ پیش آیا تھا؟''

میں تین روز تک اسپتال میں رہا۔ بخار کی وجہ سے ہذیان کی حالت میں۔ اس کے ساتھ اور بھی تکلیفیں تھیں۔ ڈاکٹر اسٹائنٹس مرض کا پتا نہیں لگا سکے۔ اس کے بعد بیماری خود بخود دور ہو گئی۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد میں نے تلاش شروع کر دی۔ دو سال قبل اسی جنگل میں ٹھیک اسی مقام پر کاؤنٹ فرڈینینڈ مسیپ نام کے ایک امیر شخص کا اسی طرح قتل ہوا تھا۔ اس کے لڑکے نے دستانے کو پہچان لیا۔''

وہ اس طرح اس واقعے کو بیان کر گئے کہ ان کی بات پر یقین نہ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا، ''تبھی سے آپ نے چیزوں کو جمع کرنا شروع کر دیا؟''

سنکی بابو نے کہا، ''اس دستانے کو حاصل کرنے کے بعد لگ بھگ دس سال تک اس طرح کا کوئی اور تجربہ نہ ہوا۔ اس درمیان میں اپنے وطن واپس لوٹ کر کٹک کے کالج میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔ چھٹی میں اکثر گھومنے کے لیے یہاں وہاں نکل جایا کرتا تھا۔ ایک بار والٹیئر جانے پر دوسرا تجربہ حاصل ہوا۔ سمندر کے کنارے ایک پتھر کی تلاش میں جانے پر عینک کا یہ شیشہ ملا۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ یہ پلس پاور کا کانچ ہے۔ ایک مدراسی حضرت نے چشمہ اتار کر رکھ دیا اور نہانے چلے گئے۔ وہ پھر پانی سے باہر نہیں نکلے۔ ان کے پاؤں کو کلیمپ نے پکڑ لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پانی میں ڈوب گئے۔ پانی سے ہاتھ اٹھا کر مدد کے لیے چلاتے رہے۔ بڑی ہی دردناک چیخ تھی ان کی۔ انھیں کی عینک کا یہ شیشہ مجھے چار برس بعد ملا۔ یہ بھی سچا قصہ ہے، تحقیقات کرنے پر مجھے پتا چلا تھا، ویل نون ڈراؤننگ کیس۔ نام تھا شورَمن۔ کوئمبتور میں رہتے تھے۔''

سنکی بابو نے دستانے اور شیشے کو اپنے مقام پر رکھ دیا اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ''جانتے ہیں میری الماری میں کتنی چیزیں ہیں؟ ایک سو بہتر۔ پچھلے تیس برسوں میں انھیں جمع کیا ہے۔ اس قسم کے ذخیرے کی بات آپ نے سنی ہے؟''

Scanned with CamScanner

میں نے سر ہلا کر انکار کیا اور اس کے بعد کہا، ''آپ کا یہ شوق بالکل انوکھا ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر آپ کی ہر چیز کے ساتھ کیا موت کا واقعہ منسلک ہے؟''

انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا، ''ہاں، بات یہی ہے۔ موت نہیں بلکہ اچانک اور غیر فطری موت — قتل، خودکشی، سفاک موت، دل کا دورہ پڑ جانے سے ہوئی موت۔ اس قسم کے واقعات سے منسلک ہونے پر ہی کوئی چیز میرے اندر ردِعمل پیدا کرتی ہے۔''

''یہ تمام چیزیں کیا آپ کو راستہ چلتے ملی ہیں؟''

''زیادہ تر اسی طرح ملی ہیں۔ باقی چیزیں کالے بازار، نیلام اور کیوریو کی دکانوں میں ملی ہیں۔ یہ جو کٹ گلاس کا شراب کا پیالہ دیکھ رہے ہیں، وہ مجھے کلکتہ کی رسل اسٹریٹ کی ایک نیلام کی دکان میں ملا ہے۔ اس شراب کے پیالے میں برانڈی کے ساتھ زہر ملا دینے کی وجہ سے انیسویں صدی کے ایک لحیم شحیم انگریز کی کلکتہ میں موت ہوگئی تھی۔''

میں کچھ دیر سے الماری کی چیزوں کو چھوڑ کر سنکی بابو کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ بہت غور کرنے پر بھی ان میں بہروپیے کی کوئی نشانی نظر نہ آئی۔ اور نہ ہی پاگل پن کی کوئی علامت؟ لگتا تو نہیں ہے۔ پاگلوں کی آنکھوں میں ایک قسم کی اداسی نظر آتی ہے۔ شاعر، جذباتی لوگوں اور درویشوں یا عارفوں میں بھی یہ اداسی کبھی کبھی نظر آتی ہے۔

اس کے بعد میں وہاں نہیں رکا۔ وداع کہہ کر جب وہاں سے روانہ ہوا تو انھوں نے کہا، ''پھر آیئے گا۔ آپ جیسے لوگوں کے لیے میرا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

''ایلیس ولا ہوٹل میں۔''

''اوہ! تب تو دس منٹ کا راستہ ہے۔ آپ کے ساتھ وقت اچھا گزرا۔ کوئی کوئی آدمی ایسا ہوتا ہے جسے میں قطعی برداشت نہیں کر پاتا۔ مگر آپ سمجھدار اور نیک دل انسان ہیں۔''

تیسرے پہر ڈاکٹر بھومک نے چائے پر بلایا تھا۔ میرے علاوہ دو لوگ اور مدعو تھے۔ چائے کے ساتھ چنا چور اور کیک کھاتے کھاتے میں نے سنکی بابو کا ذکر چھیڑ دیا۔ بھومک بابو نے دریافت کیا، ''وہاں کتنی دیر تک تھے؟''

''تقریباً ایک گھنٹے تک۔''

Scanned with CamScanner

''باپ رے!'' ڈاکٹر بھومک کو بے حد حیرانی ہوئی۔ ''ایک گھنٹے تک اس جھوٹے کی بکواس سنتے رہے؟''

میں مسکرایا۔ ''اتنی بارش ہورہی ہے کہ آزادی سے گھومنا پھرنا مشکل ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں بندر ہنے کے بجائے ان کی سننا کہیں اچھا لگتا ہے۔''

''کس کے بارے میں باتیں چل رہی ہیں؟''

یہ سوال تقریباً چالیس سال کے ایک آدمی نے پوچھا۔ ڈاکٹر بھومک نے تعارف کے طور پر ان کا نام مسٹر خاشگیر بتایا تھا۔ سنکی بابو کے سنکی پن کی باتیں سن کر مسٹر خاشگیر نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا، ''ایسے لوگوں کو یہاں ڈیرا ڈالنے کا موقع دے کر یہاں کی آب وہوا خراب کیوں کر رہے ہیں، ڈاکٹر بھومک؟''

ڈاکٹر بھومک نے مسکرا کر کہا، ''اتنے بڑے شہر کی آب وہوا خراب کردیں، ایسی صلاحیت کیا ان میں ہے؟ شاید نہیں۔''

مسٹر نسکر نامی ایک تیسرے شخص نے ہندوستان کے دروغ گویوں کے برے اثرات پر ایک چھوٹی موٹی تقریر کرڈالی۔ آخر کار لاچار ہوکر مجھے کہنا پڑا کہ سنکی بابو چونکہ تنہا زندگی گزار رہے ہیں، لہٰذا ان کے جھوٹ کا اثر دوسروں پر پڑنے کی امید کم ہی ہے۔

بھومک صاحب دارجیلنگ میں لگ بھگ تیس سال سے رہ رہے ہیں۔ خاشگیر بھی پرانے باشندے ہیں۔ لہٰذا میں ان دونوں سے ایک سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''جل پہاڑ روڈ میں کوئی انگریز گھڑسوار دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے مرگیا ہو، ایسا کوئی واقعہ آپ لوگوں کو معلوم ہے؟''

''تم میجر بریڈلے کے بارے میں کہہ رہے ہو؟ یہ تو تقریباً آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ اسٹروک ہوا تھا۔ شاید جل پہاڑ روڈ پر ہی۔ اسپتال لایا گیا تھا، مگر اس کے پہلے ہی ان کی موت ہو چکی تھی، مگر تم یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے سنکی بابو کے بٹن کی بات بتائی۔

مسٹر خاشگیر آگ بگولا ہوگئے۔ ''وہ اس قسم کی باتیں کرکے کسی غیبی طاقت کا دعویٰ کر رہا ہے؟

Scanned with CamScanner

ارے، یہ تو نمبری شیطان معلوم ہوتا ہے۔ اتنے عرصے سے دار جیلنگ میں رہ رہا ہے۔ گھوڑے سے گر کر انگریز مر چکا ہے، یہ بات یوں بھی اس کے کانوں میں پہنچ سکتی ہے۔ اس میں غیبی طاقت کی بات کہاں سے آ گئی؟''

میں نے بھی اس بات پر غور کیا تھا۔ دار جیلنگ میں رہ کر وہاں کے ایک واقعے کو جاننا سنکی بابو کے لیے ناممکن نہیں ہے۔ اس لیے میں نے بات چیت کا سلسلہ آگے نہیں بڑھایا۔ چائے کا دور جب اس قسم کی باتوں کے بیچ ختم ہو گیا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ ہی مسٹر نسکر بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی ایلس ولا کی طرف رہتے ہیں، لہٰذا میرے ساتھ ہی چہل قدمی کرتے ہوئے لوٹیں گے۔ ہم ڈاکٹر بھومک سے وداع لے کر باہر نکل آئے۔ شام ہونے والی ہے۔ دار جیلنگ آنے کے بعد پہلی بار میں نے دیکھا کہ بادل چھٹنے لگا ہے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں اسٹیج کی اسپاٹ لائٹ کی مانند شہر اور شہر کے آس پاس کے پہاڑوں پر چمک رہی ہیں۔

مسٹر نسکر دیکھنے میں کافی طاقتور لگ رہے تھے، مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ چڑھائی کے راستے میں کافی پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔ ہانپتے ہانپتے انھوں نے مجھ سے پوچھا، ''وہ صاحب کہاں رہتے ہیں؟''

میں نے کہا، ''ملیں گے؟''

''نہیں، یوں ہی پوچھ لیا۔''

سنکی بابو کے مکان کا پتا بتاتے ہوئے میں نے کہا، ''وہ چہل قدمی کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے راستے میں ہی ملاقات ہو جائے۔''

کتنی حیرت انگیز بات ہے! وہی ہوا۔ بات کہنے کے بعد دو منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایک موڑ پر آتے ہی ہم نے دیکھا، سامنے بیس ہاتھ کی دوری پر سنکی بابو ہیں۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ میں لاٹھی تھامے اور بائیں ہاتھ میں ایک مڑا ہوا اخبار لیے ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ان کے چہرے پر جو تاثر آیا اسے اگر ہنسی نہ کہا جائے تو ناگواری بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بتایا، ''گھر میں بجلی فیل ہو گئی ہے بھائی، لہٰذا موم بتی خرید کر آ رہا ہوں۔'' اخلاقاً میں نے مسٹر نسکر سے ان کا تعارف کرایا، ''آپ ہیں مسٹر نسکر، اور آپ مسٹر مکر جی۔''

نسکر رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ نمسکار کرنے کے بجائے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ زبان سے کسی قسم کا جملہ ادا کیے بغیر سنکی بابو نے ان سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح کھڑے رہے جیسے پہلے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ مسٹر نسکر بھی اکتاہٹ محسوس کرنے لگے۔ تقریباً آدھا منٹ تک خاموش رہنے کے بعد حالات جب نسکر کی برداشت کے باہر ہو گئے تو انھوں نے کہا، ''اچھا، میں پھر آگے بڑھتا ہوں۔ آپ کے بارے میں سنا تھا، اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔''

''اچھا، چلوں مسٹر مکر جی!'' لاچار ہو کر مجھے بھی یہی کہنا پڑا۔ اس وقت سنکی بابو بالکل پاگل جیسے لگ رہے تھے۔ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر وہ کیا سوچ رہے ہیں، پتا نہیں۔ ہم لوگوں کے وہاں سے چلے جانے کی بات کی جیسے انھیں پروا ہی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے نسکر صاحب انھیں پسند نہ آئے ہوں، مگر مجھ سے تو آج صبح بہت خلوص سے بات چیت کر چکے ہیں۔ انھیں پیچھے چھوڑ کر ہم آگے نکل گئے۔ اس کے بعد میں نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا، وہ تب بھی اسی طرح کھڑے تھے۔ نسکر صاحب نے اپنی رائے ظاہر کی، ''آپ سے سننے کے بعد یہ حضرت جتنے پاگل لگے تھے، اب دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس سے کہیں زیادہ پاگل ہیں۔''

رات کے نو بجے ہیں۔ اب میں کھانا کھا کر، منھ میں پان کا ایک بیڑا دبائے، جاسوسی ناول تھامے، بستر پر جانے کی سوچ رہا تھا کہ تبھی بیرے نے آکر خبر سنائی کہ ایک آدمی مجھے تلاش کر رہا ہے۔ باہر آکر دیکھا تو ایک دم حیران ہو گیا۔ اتنی رات میں سنکی بابو میرے پاس کیوں آئے؟ آج شام ہی ان میں اکتاہٹ کا جو جذبہ دیکھا تھا وہ احساس ابھی تک میرے ذہن سے پوری طرح سے دور نہیں ہوا ہے۔

انھوں نے کہا، ''یہاں بیٹھنے کی کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تنہائی ہو؟''

باہر کھڑے رہنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر پھر سے بارش کی بوندیں ٹپکنے لگی ہیں۔ میں انھیں اپنے کمرے کے اندر لے آیا۔

کرسی پر بیٹھ کر ہانپتے ہوئے بولے، ''ذرا میری نبض تو دیکھو... میں تمھیں تم کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں، برا مت ماننا۔''

ان کے بدن پر ہاتھ رکھتے ہی میں چونک اٹھا۔ کافی تیز بخار ہے۔ میں نے گھبرا کر کہا،

Scanned with CamScanner

''اینا سن دوں؟ میرے پاس ہے۔''

سنکی بابو نے ہنستے ہوئے کہا،''کسی بھی سن سے فائدہ نہ ہوگا۔ آج رات بھر بخار رہے گا۔ کل ریمیشن ہو جائے گا۔ مگر اصل بات بخار نہیں ہے۔ میں تمھارے پاس علاج کرانے نہیں آیا ہوں۔ مجھے اُس انگوٹھی کی ضرورت ہے۔''

انگوٹھی؟ کس انگوٹھی کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟

مجھے حیران دیکھ کر وہ تھوڑی بے صبری کے ساتھ بولے،''وہی لسکر یا نسکر... ایسا ہی کچھ نام تم نے بتایا تھا۔ ان کے ہاتھ کی انگوٹھی پر تمھاری نظر نہیں پڑی؟ سستی انگوٹھی ہے۔ نگ یا پتھر جڑا ہوا نہیں ہے، مگر مجھے وہ انگوٹھی ہر حال میں چاہیے۔''

اب مجھے یاد آیا کہ مسٹر نسکر کے داہنے ہاتھ کی انگلی میں میں نے چاندی کی ایک سکنڈ رنگ دیکھی تھی۔

سنکی بابو کہنے لگے،''ہاتھ ملاتے وقت انگوٹھی میری ہتھیلی سے چھوگئی۔ ایسا محسوس ہوا، میرے جسم کے اندر جیسے کوئی دھماکا سا ہوگیا ہو۔ اس کے بعد میرے ساتھ جیسا ہوتا ہے، وہی ہوا۔ سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر میں نے واقعے کو دیکھنا شروع ہی کیا تھا کہ سامنے سے ایک جیپ آئی اور اس نے سب کچھ برباد کر ڈالا۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ واقعے کو آپ دیکھ نہیں سکے؟''

''جتنا کچھ دیکھ چکا ہوں وہ کافی ہے۔ قتل کا معاملہ ہے۔ حملہ آور کا چہرہ میں دیکھ نہیں سکا۔ انگوٹھی سمیت ہاتھ ایک آدمی کے گلے کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ شکار غیر بنگالی ہے۔ اس کے سر پر ایک راجستھانی ٹوپی ہے، آنکھوں پر سونے کا چشمہ۔ آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں۔ چیخنے کے لیے منھ کھولنا چاہتا ہے۔ نچلے جبڑے کا ایک دانت سونے سے منڈھا ہے... بس اتنا ہی۔ وہ انگوٹھی مجھے ہر حال میں چاہیے۔''

میں کچھ دیر سنکی بابو کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے بعد کہا،''دیکھیے، مسٹر مکر جی، اگر آپ کو انگوٹھی کی ضرورت ہے تو اسے خود ہی مسٹر نسکر سے مانگ لیجیے۔ میں انھیں سرسری طور سے جانتا ہوں، اور جہاں تک بات میری سمجھ میں آئی ہے، وہ آپ کی اس خوبی یا صلاحیت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں

دیکھتے۔"

"پھر میرے مانگنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟ بہتر تو یہی ہے کہ ..."

"ویری سوری، مسٹر مکرجی ..." ان کی بات کاٹ کر صاف صاف کہے بغیر میں نہیں رہ سکا۔ "میں مانگوں تو بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ انگوٹھی وغیرہ کے معاملے میں کبھی کبھی آدمی میں اتنا لگاؤ ہوتا ہے، یہ بات آپ سے چھپی نہیں ہے۔ وہ اس چیز کو اگر استعمال میں نہ لائے ہوتے تو ..."

اس کے بعد وہ وہاں بیٹھے نہیں۔ ایک لمبی سانس لے کر کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بوندا باندی میں ہی اندھیرے میں نکل پڑے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا، ۱۰۱ کی فرمائش عجیب طرح کی ہے۔ راستے سے چیزیں چن لینا الگ طرح کی بات ہے، لیکن لوگوں سے ان کے ذاتی استعمال کی چیزیں مانگ کر اپنے ذخیرے میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنا بے انصافی ہے۔ اس معاملے میں کوئی بھی ان کی مدد نہ کرتا۔ میں بھی کیسے کروں؟ اور نسکر ویسے بھی بے حد خشک آدمی ہیں۔ مانگنے پر ان سے انگوٹھی مل جائے گی، یہ امید کرنا ہی غلط ہے۔

دوسری صبح بادل چھٹ گئے تھے اور آسمان صاف ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر میں برچ ہل کی طرف گھومنے نکل گیا۔ بالکل روکھا سوکھا دن ہے۔ ہال میں لوگوں کا جمگھٹ لگا ہے۔ بھیڑ کے بیچ سے ہوتا ہوا، گھوڑوں اور خچروں سے خود کو بچاتا ہوا، آہستہ آہستہ میں آبزرویٹری ہل کے مغربی اور ویران راستے پر پہنچ گیا۔ کل رات سے ہی سنکی بابو کا اداس چہرہ میرے سامنے آجاتا تھا اور دل میں یہ تمنا جاگ رہی تھی کہ اگر نسکر سے میری ملاقات ہو جائے تو ایک بار اس انگوٹھی کے بارے میں کچھ کہوں۔ ہوسکتا ہے انگوٹھی سے ان کو کوئی خاص لگاؤ نہ ہو اور میرے طلب کرنے پر وہ اسے دے دیں۔ سنکی بابو کو انگوٹھی دے دینے سے ان کے چہرے کا رنگ کیسا ہو جائے گا، یہ بات میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ بچپن میں میں ڈاک ٹکٹوں کو جمع کیا کرتا تھا، لہٰذا میں جانتا ہوں کہ ہابی کا نشہ کس قسم کا ہوتا ہے۔ اور سنکی بابو ایک ایسے شخص ہیں جو کسی طرح کے جھنجھٹ یا جھمیلے میں نہیں رہتے۔ اپنا انوکھا شوق ہے، اپنے آپ میں کھوئے رہتے ہیں۔ زور زبردستی کسی کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کی چیز کے لیے ان میں لالچ جگا ہو، اور وہ کوئی قیمتی چیز بھی نہیں ہے۔ سچ کہوں، کل رات کے بعد سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان میں روحانی شکتی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کے شوق کا سارا

دارومداران کے سنکی پن کے تصورات پر منحصر ہے۔ لیکن اگر اس شوق سے وہ تنہا شخص خوش رہتا ہے تو دوسرے کو نقصان ہی کیا ہے؟ لیکن برچ ہل کے راستے پر دو گھنٹے تک چہل قدم کرنے پر بھی نسکر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ جب میں ہل پہنچا تب تقریباً ساڑھے دس بج چکے تھے۔ بھیڑ تب بھی تھی، لیکن جاتے وقت جتنی بھیڑ تھی، اس سے تھوڑی کم۔ یہاں وہاں دس بیس آدمیوں کی کئی ٹولیاں کھڑی ہیں اور ان ٹولیوں میں کسی موضوع پر زوردار بحث چھڑی ہوئی ہے۔ ایک اجنبی ادھیڑ بنگالی کو اپنے قریب دیکھ کر میں نے پوچھا، ''کیا بات ہے جناب؟ کچھ ہوا ہے کیا؟''

اس نے جواب دیا، ''کلکتہ کا کوئی بھاگا ہوا مجرم یہاں آکر چھپ گیا ہے۔ اس کا پیچھا کرتی ہوئی پولیس یہاں آئی ہے، اور تلاشی چل رہی ہے۔''

''اس آدمی کا نام آپ کو معلوم ہے؟''

''اصل نام معلوم نہیں ہے۔ یہاں اس نے اپنا نام نسکر بتایا ہے۔''

میرا دل دھڑکنے لگا۔ ایک ہی آدمی ایسا ہے جو اصلی بات بتا سکتا ہے، اور وہ ہیں ڈاکٹر بھومک۔ مجھے ان کے گھر تک جانا نہیں پڑا۔ لیڈین لا روڈ پر، رکشے کے ڈیرے کے پاس خاستگیر اور ڈاکٹر بھومک سے ملاقات ہوگئی۔

بولے، ''کل تیسرے پہر یہ آدمی میرے گھر آکر چائے پی گیا۔ تین روز قبل میرے پاس پیٹ درد کا علاج کروا گیا تھا۔ تنہا آدمی ہے، نیا نیا یہاں آیا ہے، یہی سوچ کر گھر پر کھانا کھانے بلایا تھا، اور آج یہ بات سن رہا ہوں۔''

''پکڑا گیا یا نہیں؟'' میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''ابھی تک پکڑا نہیں گیا ہے۔ صبح سے ہی غائب ہے۔ پولیس اس کو تلاش کر رہی ہے۔ لیکن ہے تو اسی شہر میں، بھاگ کر جائے گا کہاں؟ لیکن کتنی بری بات ہے۔۔۔!''

ڈاکٹر بھومک اور خاستگیر چلے گئے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری نبض تیز چل رہی ہے۔ یہ سوچ کر نہیں کہ نسکر مجرم ہے، بلکہ اس لیے کہ سنکی بابو انگوٹھی کے لیے کتنے بے چین تھے! قاتل کے ہاتھ کی انگوٹھی ہے، یہ بات سنکی بابو نے بتائی تھی۔ تو کیا وہ روشن ضمیر ہیں؟

راستے میں کھڑا کھڑا جب میں یہ سوچ رہا تھا تو دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ایک بار سنکی بابو

Scanned with CamScanner

سے مل آؤں۔ انھیں کیا یہ خبر ملی ہے؟ ایک بار اس کی تحقیقات کرنا ضروری ہے۔

لیکن سترہ نمبر مکان کے دروازے پر تین تین بار دستک دینے پر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ میں تیز قدموں سے ہوٹل چلا آیا۔ آدھے گھنٹے کے اندر موسلا دھار بارش ہوگئی۔ جھلملاتی ہوئی صبح اب جیسے کسی دور کے خواب میں تبدیل ہوگئی۔ پولیس کی تلاش چل رہی ہے۔ کہاں چھپ گئے مسٹر نسکر؟ کس کا قتل کیا تھا انھوں نے؟ کس طرح قتل کیا؟

ساڑھے تین بجے ہم لوگوں کے ہوٹل کے منیجر مسٹر سوندھی نے خبر دی کہ نسکر جس مکان میں تھے، اس کے پیچھے کے پہاڑ کے تقریباً تیس ہاتھ نیچے کے کھڈ میں نسکر کی لاش ملی ہے۔ اس کا ماتھا چور چور ہو گیا ہے۔ خودکشی، دماغی گڑبڑ، بھاگتے وقت پاؤں پھسل جانا، وغیرہ وغیرہ — لوگ اس طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ کاروبار کے معاملہ میں پارٹنر سے دشمنی ہوگئی تھی، اسی وجہ سے اس کو قتل کر دیا اور لاش کو چھپا کر آ کر دارجیلنگ میں چھپ گیا۔ پولیس نے لاش کو برآمد کیا، وغیرہ وغیرہ۔

اب تو سنکی بابو سے ایک بار ملاقات کرنا ہی ہوگی۔ اب ان کو نظر انداز کر کے یا ہنس کر ان کی بات ہوا میں نہیں اڑائی جاسکتی۔ سوئٹزرلینڈ اور والٹیئر کے واقعات من گھڑت ہو سکتے ہیں، دارجیلنگ کی بات انھیں پہلے سے معلوم ہو سکتی ہے، مگر نسکر قاتل ہے، انھیں اس بات کا علم کیسے ہوا؟

پانچ بجے جب بارش کچھ تھمی تو میں ان کے گھر پر گیا۔ دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سنکی بابو نے ہنس کر کہا، ''آؤ بھیا، اندر چلے آؤ۔ میں تمھارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔''

میں اندر گیا۔ شام اتر چکی ہے۔ سنکی بابو کی میز پر ایک موم بتی جل رہی ہے۔

''آج بھی بجلی نہیں ہے،'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں بینت کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا، ''آپ کو خبر ملی ہے؟''

''تمھارے اس نسکر کی خبر؟ مجھے کیا خبر ملے گی؟ میں پہلے ہی جان گیا تھا۔ اور ہاں، میں اس کا احسان مند ہوں۔''

''احسان مند؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میرے ذخیرے کی سب سے قیمتی چیز وہ مجھے دے گیا ہے۔''

''دے گیا ہے؟'' میرا گلا خشک ہونے لگا۔

Scanned with CamScanner

''دیکھ لو نا، میز پر ہے۔''

میں نے جیسے ہی میز کی جانب نظریں دوڑائیں، موم بتی کے پاس ہی کھلی کاپی کے سفید ورق پر وہی انگوٹھی رکھی ہوئی نظر آئی۔

''واردات کا حساب میں نے لکھ لیا ہے۔ تماشا نمبر ایک سات تین،'' سنکی بابو نے کہا۔

مجھے ایک سوال پریشان کر رہا ہے۔ ''دے گیا ہے — اس کا مطلب؟ کب دے گیا؟''

''دینا کیا آسانی سے چاہتا تھا؟'' سنکی بابو نے ایک لمبی سانس لی۔ ''زور زبردستی سے لینا پڑی۔''

میں حیران بیٹھا ہوں۔ کمرے میں صرف گھڑی کی آواز ٹک ٹک کر رہی ہے۔

''تم نے آکر اچھا ہی کیا،'' سنکی بابو نے کہا۔ ''تمھیں ایک چیز دے رہا ہوں، اسے اپنے پاس ہی رکھ لینا۔''

سنکی بابو کرسی سے اٹھ کر کمرے کی دوسری طرف اندھیرے کونے کی جانب چلے گئے۔ وہاں سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ان کی آواز سنائی دی۔

''اسے بھی مجھے اپنے ذخیرے میں رکھ لینا چاہیے تھا، مگر اس کا اثر میں برداشت نہیں کر پا رہا ہوں۔ بار بار بخار آتا ہے اور ایک بہت ناخوشگوار منظر میری آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتا ہے۔''

باتیں کرتے کرتے وہ تاریکی سے روشنی میں آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اپنے داہنے ہاتھ کو میری طرف بڑھائے ہوئے ہیں۔ اس ہاتھ میں ان کی وہی جانی پہچانی لاٹھی تھمی ہوئی ہے۔

براؤن صاحب کی کوٹھی

جب سے براؤن صاحب کی ڈائری ملی تھی، بنگلور جانے کا موقع تلاش کر رہا تھا، اور وہ موقع اچانک میرے سامنے آ گیا۔ بالی گنج اسکول کے سالانہ ری یونین کے موقعے پر پرانے ہم جماعت انیک چندر بھومک سے میری ملاقات ہوگئی۔ انیک نے بتایا کہ وہ بنگلور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس میں نوکری کرتا ہے۔ ''ایک بار میرے یہاں گھومنے پھرنے آؤ نا۔ دَ بیسٹ پلیس اِن انڈیا۔ میرے گھر میں ایک علیحدہ کمرہ بھی ہے۔ آؤ گے نا؟''

اسکول میں انیک میرا گہرا دوست تھا۔ اس کے بعد جیسا ہوتا ہے وہی ہوا۔ ہم الگ الگ کالج میں داخل ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ سائنس کا طالب علم تھا اور میں آرٹ کا۔ دونوں نے مختلف راستوں پر چلنا شروع کیا۔ پھر وہ ولایت چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں کی دوستی میں تھوڑی بہت رکاوٹ آ گئی۔ آج تقریباً بارہ سال کے بعد اس سے ملاقات ہوئی۔

میں نے کہا، ''آ سکتا ہوں۔ کون سا موسم سب سے اچھا رہتا ہے؟''

''کبھی بھی۔ بنگلور میں گرمی نہیں پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبوں کو یہ جگہ اتنی پسند تھی۔ جب مرضی ہو چلے آنا۔ اور ہاں، سات دن پہلے خبر بھیج دو تو بہتر ہوگا۔''

خیر، اب ہو سکتا ہے براؤن صاحب کی کوٹھی دیکھنے کا سنہرا موقع مل جائے۔ لیکن اس کے پہلے یہ ضروری ہے کہ براؤن صاحب کی ڈائری کے بارے میں بتا دوں۔

مجھے آپ ایک طرح سے پرانی کتابوں کا کیڑا کہہ سکتے ہیں۔ بینک میں نوکری کر کے جتنا کماتا ہوں اس کا تقریباً آدھا پرانی کتابوں کی خریداری میں چلا جاتا ہے — سیاحتوں کی کہانیاں، شکار کی کہانیاں، تاریخ، سوانح عمری اور ڈائری وغیرہ۔ بہت ساری کتابیں پانچ سال کے درمیان میرے پاس جمع ہوگئی ہیں۔ کیڑوں کے چاٹے ہوئے صفحات، پرانے اور کمزور صفحات، ایک جگہ رکھے رہنے

کی وجہ سے بے رنگ صفحات، ان سب سے بھی اچھی طرح واقف ہوں اور یہ سب میری عزیز ترین چیزیں ہیں۔ اور پرانی کتابوں کی خوشبو! پہلی برسات کے بعد بھیگی مٹی سے جو سوندھی خوشبو آتی ہے اس کی اور پرانی کتابوں کے صفحات کی خوشبو، ان دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اگر، زعفران، گلاب، خس، حنا، یہاں تک کہ فرانس کے عمدہ سے عمدہ پرفیوم کو ان دونوں کے سامنے ہار ماننا پڑے گی۔

پرانی کتابیں خریدنے کا مجھے نشہ ہے اور پرانی کتابیں خریدنے کے سلسلے میں ہی براؤن صاحب کی ڈائری ملی تھی۔ اتنا بتا دوں کہ یہ چھپی ہوئی ڈائری نہیں ہے۔ حالانکہ چھپی ہوئی ڈائری بھی میرے پاس ہے۔ وہ ڈائری سرپت کے قلم سے لکھی ہوئی اصلی ڈائری ہے۔ سرخ چمڑے سے مڑھی ہوئی، ساڑھے تین سو اوراق کی رول دار کاپی، ساڑھے چھ انچ ضرب ساڑھے چار انچ جلد کے چاروں طرف سونے کے پانی کی نقاشی کیا ہوا بارڈر ہے اور بیچ میں سنہرے چھپے حروف میں صاحب کا نام لکھا ہوا ہے — جان مڈلٹن براؤن۔ جلد الٹنے کے بعد پہلے ورق پر صاحب کے دستخط ہیں اور نیچے ان کا پتا — ایور گرین لاج، فریزر ٹاؤن، بنگلور۔ اور اس کے نیچے لکھا ہے: جنوری 1858۔ یعنی اس ڈائری کی عمر ایک سو تیرہ سال ہے۔ براؤن صاحب کا نام کئی اور کتابوں پر تھا اور انھیں کتابوں کے ساتھ یہ سرخ چمڑے سے منڈھی کاپی تھی۔ شہرت یافتہ کتابوں کے مقابلے میں اس کتاب کی قیمت بہت کم تھی۔ مقبول نے بیس روپے کا مطالبہ کیا، میں نے دس روپے قیمت لگائی، آخر کار بارہ روپے میں سودا طے ہو گیا۔ براؤن صاحب کوئی نامی آدمی ہوتے تو اس کتاب کا دام ایک ہزار روپے تک ہو سکتا تھا۔

ڈائری سے اس زمانے کے ہندوستان کے صاحبوں کی روزمرہ کی زندگی کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں بھی علم حاصل ہو سکتا تھا، ایسی امید مجھے نہیں تھی۔

سچ کہہ رہا ہوں، شروع کے سو ورق پڑھ جانے پر بھی اس سے زیادہ کچھ نہ ملا۔ براؤن صاحب اسکول ماسٹر تھے۔ بنگلور کے کسی اسکول میں پڑھانے کا کام کرتے تھے۔ صاحب نے اپنی باتیں زیادہ لکھی ہیں؛ بیچ بیچ میں بنگلور شہر کا بھی ذکر ہے۔ ایک جگہ بڑے لاٹ صاحب کی بیوی لیڈی کیننگ کے بنگلور آنے کے واقعے کا بھی ذکر کیا ہے۔ بنگلور کے پھول پھل، پیڑ پودوں اور باغیچوں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ایک جگہ انگلینڈ کے اپنے آبائی گھر اور بچھڑے ہوئے قریبی رشتے داروں کا تذکرہ بھی کیا

Scanned with CamScanner

ہے۔ بیوی الزبتھ کا بھی ذکر ہے جس کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اس میں سب سے دلچسپ بات جو ہے وہ یہ کہ سائمن کون تھا — اس کا لڑکا یا بھائی یا بھانجا۔ یہ بات ڈائری سے سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ مگر ہاں، سائمن کے لیے صاحب کے دل میں جو گہرا لگاؤ تھا اسے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ڈائری میں سائمن کی عقل، سائمن کی ہمت، سائمن کے غصے، غرور، شرارت اور من موجی پن وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ سائمن فلاں کرسی پر بیٹھنا پسند کرتا ہے، آج سائمن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آج دن بھر سائمن پر نظر نہ پڑنے کی وجہ سے دل اداس ہے — اس طرح کی چھوٹی موٹی باتیں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ سائمن کی دردناک موت کی خبر بھی ہے۔ 22 ستمبر کو شام ساڑھے سات بجے بجلی گرنے سے سائمن کی موت واقع ہوئی تھی۔ دوسرے دن صبح کے وقت براؤن صاحب کے باغیچے کے جھلسے ہوئے یوکلپٹس کے درخت کے پاس سائمن کی لاش ملی تھی۔

اس کے بعد ایک مہینے تک ڈائری میں ایسی کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ جو ہے اس میں دکھ اور مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ براؤن صاحب نے اپنے وطن لوٹ جانے کی بات سوچی ہے، مگر ان کا دل نہیں چاہتا کہ وہ سائمن کی روح سے دور چلے جائیں۔ صاحب کی صحت بھی ذرا خراب ہوگئی ہے۔ آج بھی اسکول نہیں گیا — اس بات کا ذکر پانچ پانچ جگہ پر ہے۔ لکاس نام کے ایک ڈاکٹر کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس نے براؤن صاحب کی صحت کی جانچ کی تھی اور دوا لکھ کر دی تھی۔

اس کے بعد اچانک دو نومبر کی ڈائری میں ایک حیرت انگیز واقعے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی واقعے نے میری نظر میں ڈائری کی قیمت ہزاروں گنا بڑھا دی ہے۔ براؤن صاحب روزانہ کے واقعات نیلی روشنائی سے لکھتے تھے مگر اس واقعے کو انھوں نے سرخ روشنائی سے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں:

"میں تیسرے پہر اپنا دل بہلانے کے لیے لال باغ کے پیڑ پودوں کے پاس گیا تھا۔ شام ساڑھے سات بجے گھر لوٹ کر جیسے ہی ڈرائنگ روم کے اندر داخل ہوا، دیکھا، سائمن آتشدان کے پاس اپنی پیاری ہائی بیکڈ کرسی پر بیٹھا ہے۔ سائمن! — واقعی سائمن ہی تھا۔ میں اسے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اور وہ صرف بیٹھا ہی نہیں ہے، بلکہ اپنی محبت بھری نگاہوں سے مجھے ایک ٹک دیکھ رہا ہے۔ اس کمرے میں روشنی نہیں ہے۔ میرے کام چور خانساماں ٹامس نے یہاں بتی نہیں جلائی ہے۔ اس

لیے سائمن کو غور سے دیکھنے کے لیے میں نے جیب سے دیا سلائی باہر نکالی۔ تیلی کو ڈبیا سے رگڑتے ہی روشنی ہو گئی، مگر مجھے بہت ہی افسوس ہوا کیونکہ اس دوران سائمن غائب ہو گیا۔ اتنا ضرور ہے کہ مجھے یہ امید نہیں ہے کہ پھر کبھی سائمن کو دیکھ سکوں گا۔ اس طرح بھوت کی حالت میں بھی اگر وہ کبھی کبھی دکھائی دے جائے تو میرے دل سے تمام دکھ دور ہو جائیں۔ واقعی آج بہت خوشی کا دن ہے۔ مر کر سائمن مجھے بھول نہیں سکا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی پیاری کرسی کو بھی نہیں بھولا۔ دہائی ہے سائمن! بیچ بیچ میں تم نظر آ جانا۔ اس کے علاوہ میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں۔ اتنا ہی میسر ہو جائے تو میں اپنی باقی زندگی چین و سکون سے گزار لوں گا۔''

اس کے بعد ڈائری پڑھی نہیں جاتی۔ جو کچھ بھی ہے، اس میں دکھ کی کوئی چھاپ نہیں، کیونکہ سائمن سے براؤن صاحب سے ہر روز ملاقات ہو جاتی ہے، سائمن کے بھوت نے صاحب کو مایوس نہیں کیا تھا۔

ڈائری کے آخری ورق پر لکھا ہے: ''جو مجھے پیار کرتا ہے، اس کی موت کے بعد بھی اس کا پیار برقرار ہے۔ یہ جان کر مجھے بے حد سکون ملتا ہے۔''

بس، اتنا ہی۔ لیکن اب سوال اٹھتا ہے: براؤن صاحب کی کوٹھی، بنگلور کے فریز رٹاؤن کا ایور گرین لاج، اب ہے یا نہیں، اور وہاں اب بھی شام کے وقت سائمن کے بھوت کی آمد ہوتی ہے یا نہیں؟ میں اگر اس کوٹھی میں جا کر ایک شام گزار دوں تو کیا سائمن کے بھوت کو دیکھ سکوں گا؟

بنگلور آنے پر پہلے دن انیک کو اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔ اس کی ایمبیسڈر گاڑی پر گھوم کر پورے بنگلور شہر کی سیر کی۔ یہاں تک کہ فریز رٹاؤن کو بھی نہیں چھوڑا۔ بنگلور واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے، اس لیے اس شہر کی تعریف کرنے میں مجھے جھجک نہیں ہوئی۔ بنگلور صرف خوبصورت ہی نہیں ہے، کلکتہ سے یہاں آنے پر محسوس ہوا جیسے بنگلور ہر قسم کی ہلچل سے دور شانت شہر ہے — بالکل میرے غیر حقیقی خوابوں کے دیس جیسا۔

اگلے روز اتوار تھا۔ صبح انیک کے باغیچے میں رنگین چھتری کے نیچے بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میں نے براؤن صاحب کا ذکر کیا۔ سن کر اس نے چائے کی پیالی بینت کی کرسی پر رکھ دی اور کہا، ''دیکھو رنجن، جس کوٹھی کا تم نے ذکر کیا وہ شاید اب بھی ہو۔ ایک سو سال یوں کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہے۔ اور

Scanned with CamScanner

ہاں، وہاں جا کر اگر بھوت دیکھنے کا ارادہ ہے تو میں اس کام میں بالکل ساتھ نہیں دے سکتا۔ برامت ماننا بھائی، میں ہمیشہ سے ذرا حساس رہا ہوں۔ یوں ہی مزے میں ہوں۔ آج کل شہر میں کوئی فساد نہیں ہے۔ بھوت کے پیچھے دوڑنے کا مطلب ہے جان بوجھ کر فساد کو دعوت دینا۔ میں اس کام میں شریک نہیں ہوسکتا۔''

انیک کی باتیں سن کر محسوس ہوا، بارہ سال کے دوران میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اسکول میں بھی وہ ڈرپوک کے نام سے مشہور تھا۔ یاد آیا، ایک بار ہمارے ہم جماعت جینت اور کچھ شرارتی لڑکوں نے مل کر ایک شام بالی گنج کے سرکلر روڈ کے رائیڈنگ اسکول کے پاس خود کو سر سے پیر تک سفید کپڑے سے ڈھک کر اسے ڈرادیا تھا۔ انیک اس واقعے کے بعد دو دن اسکول نہیں آیا تھا اور انیک کے والد نے ہیڈ ماسٹر ویریشور بابو کے پاس آ کر اس واقعے کی شکایت کی تھی۔

میں اس بارے میں کچھ کہوں، اس کے پہلے ہی اچانک انیک نے کہا، ''اگر تمھیں جانا ہی ہے تو ساتھی کی کمی نہیں ہوگی۔ آیئے مسٹر بنرجی!''

میں نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ تقریباً پینتالیس سال کے ایک ادھیڑ عمر شخص انیک کے باغیچے کے پھاٹک سے داخل ہو کر ہنستے ہوے ہماری طرف آرہے ہیں۔ ہٹا کٹا بدن، تقریباً چھ فٹ اونچا قد، لباس سلیٹی رنگ کی ہینڈلوم کی پتلون اور اس پر گہرے نیلے رنگ کی ٹیریلین کی بش شرٹ، گلے میں کالا سفید بو اور ریشمی مفلر۔

انیک نے تعارف کرایا، ''آپ ہیں میرے دوست رنجن سین گپت اور آپ مسٹر ہرشی کیش بنرجی۔''

معلوم ہوا کہ وہ بنگلور کی ایرکرافٹ فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ بہت دن سے بنگال کے باہر ہیں اس لیے ان کے لہجے میں غیر بنگالی پن کی چھاپ ہے۔ ساتھ ہی انگریزی الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔

انیک نے بیرے کو پکارا اور ایک پیالی چائے لانے کا حکم دیا، اور پھر سیدھے براؤن صاحب کی کوٹھی کا ذکر چھیڑ دیا۔ سن کر انھوں نے ایسا قہقہہ لگایا کہ ایک گلہری جو کچھ دیر پہلے ہماری میز کے اردگرد چکر لگا رہی تھی، اپنی دم اٹھا کر دیودارو کے پیڑ کے تنے کو پار کر اونچی ڈال پر چل گئی۔

Scanned with CamScanner

''گوسٹس؟ گوسٹس؟ یو سیریسلی بی لیو اِن گوسٹس؟ اس زمانے میں بھی؟ اس دور میں بھی؟''

بنرجی کی ہنسی کا سلسلہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دیکھا ان کے دانت سفید اور مضبوط ہیں۔

انیک نے کہا، ''چاہے جو بھی ہو مسٹر بنرجی، گوسٹ اور نو گوسٹ، ویسا اگر کوئی مکان ہے اور رنجن جبکہ ایک عجیب وہم پالے ہوئے ہے تو اس کے ساتھ کسی شام آپ وہاں تھوڑی دیر تک رہ سکتے ہیں یا نہیں، یہ بتایئے۔ وہ کلکتہ سے آیا ہے اور میرا مہمان ہے۔ اسے میں وہاں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ اور سچ کہوں، میں بہت محتاط رہنے والا آدمی ہوں، اگر میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں تو اسے آسانی کے بجائے پریشانی ہوگی۔''

مسٹر بنرجی نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک ترچھے پائپ کو باہر نکالا اور اس میں تمبا کو ٹھونستے ہوئے کہا، ''مجھے کوئی دقت نہیں ہے۔ مگر ہاں، میں ایک ہی شرط پر جا سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں اپنے ساتھ ایک کے بجائے دو آدمی لے کر جاؤں گا۔''

اپنی بات ختم کر کے بنرجی نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور اس قہقہے کی وجہ سے آس پاس کے پیڑوں سے چار پانچ قسم کے پرندوں کی کرخت آواز اور پنکھوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔

انیک کا چہرہ حالانکہ ذرا اتر گیا مگر وہ انکار نہیں کر سکا۔

''کوٹھی کا نام کیا بتایا؟'' بنرجی نے پوچھا، ''ایورگرین لاج؟''

''ڈائری تو یہی بتاتی ہے۔''

''ہوں... '' انھوں نے پائپ کا کش لیا۔ ''فریزر ٹاؤن میں صاحبوں کی کچھ کوٹھیاں ہیں، کاٹیج ٹائپ کی۔ اینی وے... اگر جانا ہی ہے تو دیر کرنے سے کیا فائدہ؟ واٹ اباؤٹ آج تیسرے پہر؟ یہی کوئی چار بجے؟''

انجینئر ہونے سے کیا— انداز بالکل ملٹری مین اور صاحب کے جیسا ہے۔ گھڑی دیکھ کر ٹھیک چار بجے ہرشی کیش بنرجی اپنی موریس مائنر کار لے کر آدھمکے۔ جب گاڑی میں بیٹھ گئے تو انھوں نے کہا، ''ساتھ میں کیا کیا لیا؟''

Scanned with CamScanner

انیک نے فہرست بتائی۔ پانچ سیل کا ایک ٹارچ، چھ موم بتیاں، فرسٹ ایڈ باکس، ایک بڑے فلاسک میں گرم کافی، ایک ڈبا ہیم سینڈوچ، ایک پیکٹ تاش، زمین پر بچھانے کے لیے ایک چادر، مچھروں کو بھگانے کے لیے ایک ٹیوب اوڈوماس۔''

''اور ہتھیار؟'' بنرجی نے پوچھا۔

''بھوت کو کس ہتھیار سے قابو میں کیا جاتا ہے؟''

''کیوں رنجن، تمھارے سائمن کا بھوت کیسا ہے؟ خیر...'' مسٹر بنرجی نے گاڑی کے دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا، ''میرے پاس ایک چھوٹا سا آگ اگلنے والا ہتھیار ہے، اس لیے سالڈ لیکوڈ کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

گاڑی روانہ ہونے پر، بنرجی نے کہا، ''ایورگرین لاج کی بات بے پر کی نہیں ہے۔''

میں نے حیران ہو کر کہا، ''آپ نے اس درمیان پتا بھی لگالیا؟''

بنرجی نے ایک ایک کر دو سائیکل سواروں کے بیچ سے گاڑی نکالتے ہوئے کہا، ''آئی ایم اے ویری میتھوڈیکل مین، مسٹر سین گپت۔ جہاں جانا ہے، وہ جگہ ہے یا نہیں، اس کے بارے میں پہلے سے ہی پتا لگالینا کیا ٹھیک نہیں ہے؟ اُس طرف شری نواس دیش مکھ رہتے ہیں۔ ہم ایک ساتھ ہی گولف کھیلتے ہیں۔ ان سے میری کافی پرانی جان پہچان ہے۔ صبح یہاں سے انھیں کے گھر گیا تھا۔ انھوں نے بتایا، ایورگرین نام کا ایک منزلہ کاٹیج تقریباً پچاس سال سے خالی پڑا ہے۔ مکان کے باہر ایک باغیچہ ہے، جہاں لوگ دس سال پہلے تک پکنک کرنے جایا کرتے تھے، مگر اب نہیں جاتے۔ مکان بالکل سنسان علاقے میں ہے۔ پہلے بھی اس مکان میں کوئی ایک لمبے عرصے تک نہیں رہا ہے اور ہاں، کسی نے ہانٹڈ ہاؤس کہہ کر اسے بدنام نہیں کیا ہے۔ مکان کا فرنیچر بہت پہلے ہی نیلام ہو چکا ہے۔ ان میں سے کچھ کرنل مارسر کے مکان میں ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ آرمی افسر ہیں اور فریزر ٹاؤن میں ہی رہتے ہیں۔ سب کچھ سننے کے بعد لگتا ہے، مسٹر سین گپت، ہمیں پکنک کر کے ہی لوٹ آنا پڑے گا۔ انیک نے تاش لا کر اچھا ہی کیا ہے۔''

بنگلور کی صاف ستھری چوڑی سڑک سے گاڑی گزرتے ہوئے محسوس ہو رہا ہے، یہ شہر بھوت پریت سے اتنا خالی ہے کہ یہاں کسی بھوت بنگلے کے وجود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

Scanned with CamScanner

لیکن اس کے بعد ہی مجھے براؤن صاحب کی ڈائری کی بات یاد آجاتی تھی۔ پاگل ہوئے بغیر کوئی آدمی اس طرح کی حیرت انگیز باتیں ڈائری میں کیوں لکھے گا؟ سائمن کے بھوت کو براؤن صاحب نے خود ہی دیکھا ہے — ایک بار نہیں، کئی بار۔ وہ بھوت کیا ہمیں ایک بار بھی دکھائی نہ دے گا؟

میں ولایت نہیں گیا ہوں مگر ولایت کی کاٹیجوں کی بے شمار تصویریں کتابوں میں دیکھی ہیں۔ ایورگرین لاج کے سامنے آنے پر آکر محسوس ہوا، میں واقعی انگلینڈ کے دیہی علاقے کے ایک پرانے ویران مکان کے سامنے آگیا ہوں۔

کاٹیج کے سامنے باغیچہ ہے۔ یہاں اب پھولوں کی کیاریوں کی جگہ گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ ہیں۔ لکڑی لے کر باغیچے کے اندر جانا پڑتا ہے۔ اس گیٹ کے سرے پر گھر کا نام لکھا ہے۔ اور ہاں، شاید کسی پکنک کرنے والے کی جماعت نے ہی مذاق میں ''ایورگرین'' لفظ سے پہلے ایک 'این' جوڑ کر اسے ''نیورگرین'' بنادیا ہے۔

ہم گیٹ سے داخل ہوکر مکان کی طرف بڑھنے لگے۔ چاروں طرف ان گنت پیڑ پودے ہیں۔ تین چار یوکلپٹس کے پیڑ ہیں، باقی جتنے بھی پیڑ ہیں ان کا مجھے نہیں معلوم۔ بنگلور کی آب و ہوا میں یہ خاصیت ہے کہ وہاں کسی بھی علاقے کا درخت زندہ رہ جاتا ہے۔

کاٹیج کے سامنے ٹائل سے چھاؤنی کیا ہوا پورٹیکو ہے۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے کھمبوں سے ہوتی ہوئی بیل اوپر کی طرف چلی گئی ہے۔ چھاؤنی کی بہت سی ٹائلیں غائب ہیں، جس کی وجہ سے درار سے آسمان دکھائی دیتا ہے۔ سامنے کے دروازے کا ایک پٹ ٹوٹ کر تر چھا پڑا ہوا ہے۔ مکان کے سامنے کے دروازے کھڑکیوں کے کانچ ٹوٹ گئے ہیں۔ دیوار پر لونی لگنے کی وجہ سے ایسی حالت ہوگئی ہے کہ مکان کا اصل رنگ کیا تھا، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ہم دروازے سے مکان کے اندر داخل ہوئے۔

اندر جاتے ہی ایک گلیارا ملا۔ پیچھے کی طرف ٹوٹی دیوار سے ایک کمرہ نظر آرہا ہے۔ ہمارے داہنے اور بائیں طرف بھی کمرے ہیں۔ داہنی طرف کا کمرہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا، یہی بیٹھک رہی ہوگی۔ فرش پر ولایتی انداز کے تختے لگے ہیں، مگر ایک بھی تختہ صحیح سالم نہیں ہے۔ ہوشیاری سے قدم رکھنا پڑتا ہے اور ہر قدم پر کھٹ کھٹ کی آواز ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

خاصا بڑا کمرہ ہے۔ فرنیچر نہ ہونے کی وجہ سے اور بھی سونا لگتا ہے۔ مغرب اور شمال کی طرف کھڑکیوں کی قطار ہے۔ ایک طرف کی کھڑکی سے گیٹ سمیت باغیچہ دکھتا ہے، دوسری طرف کی کھڑکی سے درختوں کی قطار۔ کیا انھیں پیڑوں میں سے کسی پر بجلی گری تھی؟ سائمن اسی کے نیچے کھڑا ہوگا اور وہیں پر اس کی موت واقع ہوئی ہوگی۔ سوچتے ہی رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

اب میں نے جنوب کی طرف بغیر کھڑکی والی دیوار کی طرف دیکھا۔ بائیں کونے میں آتشدان ہے۔ اس آتشدان کے پاس ہی سائمن کی پیاری کرسی رہی ہوگی۔ کمرے کی چھت کی طرف دیکھنے پر مکڑی کے جالوں کو جھولتے ہوئے پایا۔ کسی زمانے میں ایورگرین لاج خوبصورت رہا ہوگا، اب اس کی حالت خستہ ہوگئی ہے۔

مسٹر بنرجی شروع میں ''لا... لا... لا...'' کرتے ہوئے ولایتی لہجے میں گنگنا رہے تھے۔ اب انھوں نے پائپ سلگایا اور کہا، ''آپ لوگ کون سا کھیل کھیلنا جانتے ہیں؟ برج یا پوکر یا رمی؟''

انیک اپنے سامان کو فرش پر رکھنے جا رہا تھا، تبھی ایک آواز سنائی دی۔

کسی دوسرے کمرے میں کوئی آدمی جوتا پہن کر چہل قدمی کر رہا ہے۔

انیک کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ اترا ہوا پایا۔ پیروں کی آواز ختم گئی۔ مسٹر بنرجی اچانک اپنے منھ سے پائپ ہٹا کر زور سے چلا اٹھے، ''اِز اینی باڈی دیئر؟'' اور ہم تینوں گلیارے کی طرف بڑھ گئے۔ انیک اپنے ہاتھ سے میرے کوٹ کی آستین تھامے ہوئے تھا۔

جوتے کی آواز پھر سے شروع ہوئی۔ ہم جیسے ہی باہری گلیارے میں پہنچے، دوسری طرف کے کمرے سے ایک آدمی نکل آیا اور ہم پر نظر پڑتے ہی چونک کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی ایک ہندوستانی ہی تھا۔ چہرہ داڑھی اور مونچھوں سے بھرا ہونے کے باوجود بھی وہ شریف اور تعلیم یافتہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا، ''ہیلو!''

وہ کون ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تبھی اجنبی نے خود ہی ہمارے تجسس کو رفع کر دیا۔

''میرا نام وینکٹیش ہے۔ آئی ایم اے پینٹر۔ آپ لوگ اس مکان کے مالک ہیں یا خریدار؟''

Scanned with CamScanner

بنرجی نے ہنستے ہوئے کہا،''دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ ہم چکر لگاتے لگاتے یوں ہی یہاں پہنچ گئے ہیں۔''

''آئی سی! میرا خیال تھا، اگر یہ مکان مجھے مل جاتا تو اپنے کام کے لیے ایک اسٹوڈیو بنالیتا۔ ٹوٹا پھوٹا ہونے پر بھی مجھے اعتراض نہیں ہے۔ مالک کون ہے، اس بارے میں آپ لوگوں کو کوئی علم نہیں ہے؟''

''جی نہیں، سوری۔ آپ کرنل مارسر کے یہاں جا کر معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ سامنے کے راستے سے بائیں طرف چلے جائیے۔ پانچ منٹ کا راستہ ہے۔''

''شکریہ'' کہہ کر مسٹر وینکٹیش وہاں سے چلے گئے۔

گیٹ کھولنے اور بند کرنے کے بعد مسٹر بنرجی نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا،''مسٹر سین گپت، یہ آدمی آپ کے سائمن یا اس قسم کا کوئی بھوت وغیرہ نہیں ہے۔''

میں نے ہنس کر کہا،''ابھی صرف سوا پانچ ہی بجے ہیں، ابھی سے آپ بھوت کی امید کیسے کر سکتے ہیں؟ اور یہ بھلے آدمی اگر بھوت تھے تو انیسویں صدی کے نہیں ہوں گے، کیونکہ ویسا ہونے پر ان کا لباس اور ہی طرح کا ہوتا۔''

اس بیچ ہم بیٹھک میں لوٹ آئے ہیں۔ انیک نے فرش پر بچھی ہوئی چادر پر بیٹھتے ہوئے کہا، ''بے وجہ کوئی وہم پالنے کا مطلب ہے نروس ہونا۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ ہم تاش کھیلیں۔''

''پہلے تو کچھ موم بتیاں جلا لو،'' بنرجی نے کہا،''یہاں شام اچانک اتر آتی ہے۔''

دو موم بتیاں جلا کر ہم نے انھیں لکڑی کے فرش پر کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد فلاسک کے ڈھکن میں کافی نکال کر باری باری سے پی۔ ایک بات میرے دل میں بہت دیر سے تھی، اسے بغیر کہے نہیں رہ سکا۔ بھوت کا نشہ میرے سر پر کتنا سوار ہو گیا ہے، یہ آپ پر میری اس بات سے ظاہر ہو جائے گا۔ بنرجی کی طرف مخاطب ہو کر میں نے کہا،''آپ نے بتایا تھا کہ کرنل مارسر نے یہاں کا کچھ فرنیچر خریدا تھا۔ وہ جب اتنے قریب ہیں تو کیا ان سے ایک بات دریافت کی جا سکتی ہے؟''

''کیا؟'' بنرجی نے پوچھا۔

''ایک خاص قسم کی ہائی بیک چیئر کے بارے میں؟''

انیک نے تھوڑا اکتا کر کہا، ''اچانک ہائی بیکڈ چیئر کے بارے میں پوچھ کر کیا ہوگا؟''

''نہیں، یعنی براؤن صاحب نے لکھا ہے وہ سائمن کی بڑی ہی پیاری کرسی تھی۔ بھوت ہونے کے بعد بھی وہ اسی کرسی پر بیٹھتا تھا اور وہ آتشدان کے پاس رکھی رہتی تھی۔ ہوسکتا ہے اسے یہاں لاکر رکھنے سے . . .''

انیک نے میری کاٹتے ہوئے کہا، ''تم بنرجی صاحب کی اس مارس کار پر ہائی بیکڈ چیئر لے آؤ گے یا ہم تینوں ہی اسے کندھوں پر ڈھو کر لے آئیں؟ تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟''

بنرجی نے ہاتھ اٹھا کر ہم دونوں کو چپ کرایا اور کہا، ''کرنل مارسر نے جو کچھ خریدا ہے اس میں اس قسم کی کرسی نہیں ہے، یہ بات مجھے معلوم ہے۔ میں اکثر ان کے گھر جایا کرتا ہوں۔ اگر وہ کرسی وہاں ہوتی تو میری نگاہ ضرور پڑتی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، انھوں نے دو بک کیس، دو آئل پینٹنگ، کچھ گلدستے اور شیلف سجانے کی کچھ شوقیہ چیزیں، جنھیں آرٹ آبجیکٹ کہتے ہیں، خریدی تھیں۔''

میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ تاش نکال کر پھینٹنا شروع کیا۔ بنرجی نے کہا، ''رمی ہی چلے، اور یہ کھیل تبھی جمتا ہے جب پیسہ لگا کر کھیلا جائے۔ آپ لوگوں کو اس بات پر کوئی اعتراض ہے؟''

میں نے کہا، ''بالکل نہیں۔ بس اتنی بات ضرور ہے کہ میں ٹھہرا بینک کا معمولی ملازم۔ بہت زیادہ پیسہ لگانے کی میری حیثیت نہیں ہے۔''

باہر دن کی روشنی پھیکی ہوگئی ہے۔ ہم کھیل میں مشغول ہو گئے۔ تاش کے کھیل میں تقدیر کبھی میرا ساتھ نہیں دیتی ہے۔ آج بھی وہی حالت رہی۔ میں جانتا ہوں، انیک دل ہی دل میں گھبرایا ہوا ہے، اس لیے اگر جیت اس کی ہو تو مجھے بہت سکون ملے گا، مگر اس کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے۔ صرف مسٹر بنرجی کی تقدیر ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ ولایتی لہجے میں گنگناتے جا رہے ہیں اور داؤں پر داؤں جیتتے جا رہے ہیں۔ کھیلتے کھیلتے سناٹے کے بیچ ایک بلّے کی آواز سنائی دی، جس کی وجہ سے میرے جوش پر اور زیادہ پانی پھر گیا۔ بھوت بنگلے میں بلّے کا رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بات جب میں نے بنرجی سے کہی تو وہ ہنس کر بولے، ''بٹ اٹ واز اے بلیک کیٹ۔ اسی گلیارے سے ہو کر گیا ہے۔ بلیک کیٹ تو بھوت کے ساتھ جاتا ہی ہے، ہے نا یہ بات؟''

کھیل کا سلسلہ چلتا رہا۔ بیچ میں ایک انجان پرندے کی کرخت آواز کے سوا کسی طرح کی

Scanned with CamScanner

آواز، منظر یا واقعے نے ہماری تنہائی میں خلل نہیں ڈالا۔

گھڑی ساڑھے چھ بجا رہی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ باہر بالکل روشنی نہیں ہے۔ اچھے پتے مل جانے کی وجہ سے میں لگاتار دو مرتبہ جیت چکا ہوں۔ اس بیچ رمی کا ایک اور دور چل چکا ہے۔ تبھی کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔

کوئی باہر سے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

ہم تینوں کے ہاتھ تاش سمیت نیچے گر پڑے۔

کھٹ کھٹ... کھٹ کھٹ...

انیک کا چہرہ اس بار اور زیادہ اتر گیا۔ میرا سینہ بھی اندر ہی اندر دھڑک رہا ہے۔ مگر بنرجی میں گھبراہٹ کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اچانک سناٹے کو چیر کر وہ اپنی پرزور آواز میں چیخ اٹھے، ''ہواز اٹ؟''

دروازے پر دوبارہ کھٹکھٹاہٹ شروع ہوگئی۔

بنرجی پتا لگانے کے لیے جھٹ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا، ''اکیلے مت جایئے۔''

ہم تینوں ایک ساتھ کمرے کے باہر آئے۔ گلیارے میں آنے کے بعد بائیں طرف ہم نے ایک آدمی کو کھڑا پایا۔ وہ سوٹ پہنے ہے اور اس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ اندھیرے میں اسے پہچاننا مشکل ہے۔ انیک نے میری آستین پکڑ لی، اس بار اور زیادہ زور سے۔ اس کی حالت دیکھ کر خود بخود میرا حوصلہ بلند ہو گیا۔

اس بیچ بنرجی کئی قدم آگے بڑھ چکے تھے وہ چلا اٹھے، ''اوہ، ہیلو ڈاکٹر لارکسن! آپ یہاں؟''

اب میں نے بھی اس ادھیڑ شخص کو غور سے دیکھا۔ سونے کے چشمے کے پیچھے اس کی نیلی آنکھوں میں ایک دھندسی آگئی اور اس نے کہا، ''تمھاری مارس گاڑی باہر دکھائی دی۔ اس کے بعد دیکھا، کھڑکی سے موم بتی کی روشنی آرہی ہے۔ اس لیے سوچا، ایک بار دیکھ لوں کہ تم پر کس پاگل پن کا بھوت سوار ہوا ہے۔''

Scanned with CamScanner

بنرجی نے ہنس کر جواب دیا،''میرے ان دو جوان دوستوں کو ایک عجیب ایڈونچر کا شوق چرایا ہے۔کہا،ایور گرین لاج میں بیٹھ کر تاش کھیلیں گے۔''

''ویری گڈ،ویری گڈ۔جوانی ہی اس قسم کے پاگل پن کا وقت ہوا کرتا ہے۔ہم بوڑھے صرف اپنے اپنے گھر کے کوچ پر بیٹھ کر پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ویل ویل،ہیوا ے گڈ ٹائم۔''

لارکسن صاحب نے ہاتھ اٹھا کر''گڈ بائی'' کہا اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلے گئے،اور ہمیں بھی بھوت کی امید چھوڑنا پڑی۔اب اور کیا کریں!

ہم پھر تاش کھیلنے میں مشغول ہو گئے۔شروع میں تقریباً ساڑھے چار روپے ہار گیا تھا۔پچھلے آدھے گھنٹے کے درمیان اس میں سے کچھ واپس آ گیا ہے۔سائمن کا بھوت نہ بھی نظر آئے مگر تاش میں جیت کر اگر گھر لوٹ سکوں تو آج کے اس سنسنی خیز ماحول اور ایڈونچر میں کوئی معنویت پیدا ہو سکتی ہے۔

بیچ بیچ میں آنکھیں گھڑی کی طرف چلی جاتی تھی۔اصلی واقعہ کب ہوا تھا،اس کا وقت مجھے معلوم نہیں۔براؤن صاحب کی ڈائری سے اتنا پتا چلا تھا کہ شام کے کسی وقت بجلی گرنے سے سائمن کی موت ہوئی تھی۔

میں تاش بانٹ رہا ہوں،مسٹر بنرجی اپنا پائپ سلگا رہے ہیں،انیک سینڈوچ کھانے کی غرض سے پیکٹ میں ہاتھ ڈالنے جا رہا ہے کہ اسی وقت اچانک اس کی نگاہ ایک دم بدل جاتی ہے اور اس کے جسم کے اعضا جیسے اکڑ سے جاتے ہیں۔

اس کی نگاہ دروازے کے باہر گلیارے کی طرف ٹکی ہوئی ہے۔ہم دونوں کی نگاہ بھی اسی طرف چلی جاتی ہے۔جو کچھ دیکھتا ہوں اس کی وجہ سے چند پل کے لیے میرا گلا بھی سوکھ جاتا ہے اور سانسوں کا چلنا بند ہو جاتا ہے۔

باہر گلیارے کے اندھیرے سے دو چمکتی ہوئی آنکھیں بلا پلک جھپکائے ہماری طرف گھور رہی ہیں۔

مسٹر بنرجی کا داہنا ہاتھ آہستہ آہستہ کوٹ کے ویسٹ پاکٹ کی طرف چلا جاتا ہے اور عین اسی وقت آئینے کی طرح وہ معاملہ میرے سامنے صاف ہو جاتا ہے اور میرے دل سے سارا خوف

دور ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا، ''آپ کے پستول کی ضرورت نہیں ہے، صاحب! یہ وہی کالا بلاّ ہے۔''

میری بات سے انیک کی ہمت بھی بڑھ گئی۔ بنرجی نے پاکٹ سے ہاتھ باہر نکال کر کہا، ''ہاؤ رڈیکلس!''

اب وہ چمکتی آنکھیں ہمارے کمرے کی طرف آنے لگیں۔ چوکھٹ پار کرتے ہی موم بتی کی روشنی میں میری بات سچ ثابت ہوئی۔ یہ وہی کالا بلاّ تھا۔

چوکھٹ پار کر کے بلا بائیں طرف مڑا۔ ہماری نگاہ اس کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی، اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس بار ہم تینوں کے حلق سے ایک ساتھ ایک ہی لفظ نکلا — اچانک حیران ہونے پر جو لفظ حلق سے نکلتا ہے، بالکل ویسا ہی لفظ۔ اس لفظ کے ادا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم تاش کھیلنے میں مشغول تھے، اس بیچ نہ جانے کہاں سے گاڑھے سرخ رنگ کے مخمل سے لپٹی ہوئی ہائی بیکڈ کرسی آتشدان کے پاس آگئی تھی۔

اماوس جیسی کالی رات کے اندھیرے میں بلاّ چپ چاپ کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے بعد وہاں ایک پل رکا رہا، پھر اس نے ایک چھلانگ لگائی اور کرسی پر گول مول ہو کر لیٹ گیا۔ ٹھیک اس وقت ایک عجیب آواز سن کر میرا جسم جیسے پتھر کا یا سُن سا ہو گیا۔ کسی نا دیدہ بوڑھے کی ہنسی ہوئی آواز اور اس کے درمیانی وقفوں میں بار بار یہ صدا آ رہی تھی:

''سائمن... سائمن... سائمن... سائمن!'' اور اس کے ساتھ ہی بچکانہ پن سے بھری خوشیوں اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ۔

ایک چیخ سنائی دی اور انیک بے ہوش ہو گیا۔ اور مسٹر بنرجی؟ وہ انیک کو گود میں لے کر گلیارے سے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

میں بھی اب بیٹھا نہ رہ سکا۔ تاش، موم بتی، چادر، فلاسک، سب کچھ پڑا رہ گیا۔

خوش قسمتی سے بنگلور کی سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت کم رہتی ہے، ورنہ ہماری گاڑی کی تیز رفتار کی زد میں آ کر اس وقت کتنے آدمی زخمی ہوتے، کہنا مشکل ہے۔

انیک کو گاڑی میں ہوش آ چکا تھا، مگر اس کے منھ سے ایک لفظ بھی باہر نہیں نکل رہا تھا۔ پہلی بار مسٹر بنرجی کے حلق سے آواز نکلی۔ انیک کے ہاتھ سے برانڈی کا گلاس چھین کر ایک ہی گھونٹ میں

Scanned with CamScanner

آدھا گلاس پی گئے اور گھر گھراتی آواز میں بولے، "سوسائمن وازاے کیٹ۔"

میں بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ کچھ بولتا، مگر میرے دل نے ہامی بھری۔

واقعی سائمن براؤن صاحب کا عقلمند، من موجی، سعادت مند، پر تمکنت اور لاڈلا تھا۔ جس سائمن کی موت آج سے ایک سو تیرہ برس پہلے بجلی گرنے سے ہوئی تھی، یہ وہی پالتو بلاّ تھا۔

Scanned with CamScanner

سدانند کی چھوٹی سی دنیا

آج میرا دل خوش ہے، اس لیے سوچتا ہوں تم لوگوں کو راز کی بات بتادوں۔ جانتا ہوں تم لوگ میری بات پر یقین کرو گے۔ تم لوگ اُن کی طرح نہیں ہو۔ اُن لوگوں کا خیال ہے، میری ساری باتیں جھوٹی اور بناوٹی ہیں۔ یہی وجہ ہے، میں ان لوگوں سے اب بات چیت ہی نہیں کرتا۔

ابھی دوپہر ہے، اس لیے یہ لوگ میرے کمرے میں نہیں ہیں۔ تیسرے پہر آئیں گے۔ ابھی یہاں میں اور میرا دوست لال بہادر ہے — لال بہادر سنگھ۔ اُف، کل اس نے مجھے کتنی فکر میں ڈال دیا تھا۔ میرا یہ خیال تھا ہی نہیں کہ وہ پھر لوٹ کر آئے گا۔ وہ بہت ہی عقلمند ہے، اس لیے اس نے بھاگ کر اپنی جان بچالی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک مر کر بھوت بن چکا ہوتا۔

لو، دوست کا نام تو بتادیا مگر اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔ میرا نام ہے سدانند چکرورتی۔ سننے سے داڑھی والے بوڑھے جیسا نہیں لگتا ہوں کیا؟ دراصل میری عمر تیرہ سال ہے۔ نام اگر بوڑھے جیسا ہے تو میں کیا کروں؟ میں نے خود تو اپنا نام رکھا نہیں، رکھا ہے میری دادی اماں نے۔

اتنا ضرور ہے کہ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ نام کی وجہ سے مجھے پریشانی میں پڑنا ہوگا تو وہ میرا نام کچھ اور ہی رکھتیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور کہیں گے، ''تیرا ہی نام سدانند ہے نا؟''

کاش ان میں تھوڑی بھی عقل ہوتی! سیار کی طرح صرف کھوں کھوں کر ہنسنے سے کیا خوشی حاصل ہوتی ہے؟ کبھی طرح کی خوشی میں کیا ہنسا جاتا ہے، یا ہنسنا مناسب ہوتا ہے؟

فرض کرو کہ تم بغیر کچھ سوچے سمجھے زمین میں ایک لکڑی گاڑ دیتے ہو، ایک پتنگا اڑتا ہوا آتا ہے اور اس لکڑی کے اوپر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ تو بہت مزیدار بات ہے۔ مگر اس کو دیکھ کر اگر تم ہو ہو کر کے ہنسنے لگتے ہو تو لوگ تمھیں پاگل ہی کہیں گے۔ اسی طرح کے ایک میرے سنگی سے دادا جی تھے۔ میں نے

Scanned with CamScanner

انھیں دیکھا نہیں ہے، مگر بابو جی سے سنا ہے کہ وہ بے وجہ ہنسا کرتے تھے۔ آخر میں جب ان کا پاگل پن بہت بڑھ گیا تو بابو جی، چھوٹے چاچا اور اویناش چاچا نے مل کر انھیں زنجیروں سے باندھ دیا۔ اس وقت بھی اتنا ہنستے تھے، اتنا کہ کیا کہوں!

جانتے ہو اصل بات کیا ہے؟ مجھے جن چیزوں میں دلچسپی ہے، زیادہ تر لوگوں کے ذہن میں وہ چیزیں آتی ہی نہیں۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ہی میں بہت سی مزیدار چیزیں دیکھتا رہتا ہوں۔ بیچ بیچ میں کھڑکی کے راستے سے کمرے کے اندر سیمل کا بیج اڑ کر چلا آتا ہے۔ اس میں لمبا لمبا رُواں رہتا ہے اور وہ اِدھر اُدھر اڑتا رہتا ہے۔ وہ بڑی ہی مزیدار چیز ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ایک بار تمھارے چہرے کے پاس اڑتا ہوا آئے۔ تم جیسے ہی ایک بار پھونک مارو گے وہ جھٹ سے اڑ کر شہتیر کی طرف چلا جائے گا اور کھڑکی پر اگر ایک کوا آکر بیٹھے تو ادھر دیکھنے پر تمھیں محسوس ہوگا کہ یہ تو سرکس کا مسخرہ ہے۔ کوا جیسے ہی آکر بیٹھتا ہے، میں ہلنا ڈُلنا بند کر دیتا ہوں اور ترچھی نگاہوں سے اس کا تماشا دیکھتا رہتا ہوں۔

اتنا ضرور ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ مجھے سب سے زیادہ مزہ کس بات میں ملتا ہے تو میں کہوں گا کہ چیونٹی میں۔ صرف مزہ کہنا غلط ہوگا۔ وجہ... نہ! وجہ ابھی نہیں بتاؤں گا۔ پہلے ہی سے اگر حیرت انگیز باتیں بتادوں تو مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ شروع سے ہی بتاؤں۔

آج سے تقریباً ایک سال پہلے میں بخار کی چپیٹ میں آگیا تھا۔ یہ کوئی نئی چیز ہو، ایسی بات نہیں۔ مجھے اکثر بخار آجایا کرتا تھا— سردی اور بخار۔ ماں کہتی تھیں، صبح شام میدان میں بھیگنے اور بھیگی گھاس اور زمین پر بیٹھنے کی وجہ سے یہ سب ہوتا ہے۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی بخار کی شروعات کے دنوں میں اچھا ہی لگ رہا تھا— ٹھنڈا ٹھنڈا، بدن میں اینٹھن اور سستی کا احساس، اس کے ساتھ اسکول نہ جانے کا آرام تو ہے ہی۔ بستر پر لیٹا ہوا کھڑکی کے باہر ایک پیڑ پر گلہری کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تبھی ماں نے آکر ایک کسیلی دوا پینے کو دی۔ میں نے اچھے لڑکے کی طرح دوا پی کر گلاس سے پانی کے کئی گھونٹ حلق سے نیچے اتارے اور باقی پانی کو کلی کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ماں خوش ہو کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس کے بعد چادر کو اچھی طرح کھینچ کر بدن پر ڈالا۔ پھر گاؤ تکیے کو بغل میں دبا کر لیٹنے ہی جا رہا

تھا کہ ایک چیز پر میری نظر گئی۔

دیکھا،کلی کا تھوڑا سا پانی کھڑکی پر پڑا ہوا ہے اور اس پانی میں ایک چھوٹی کالی چیونٹی غوطے لگا رہی ہے۔ یہ بات مجھے اتنی عجیب وغریب لگی کہ اچھی طرح دیکھنے کے خیال سے میں اپنی آنکھوں کو چیونٹی کے بالکل قریب لے گیا۔

دیکھتے دیکھتے اچانک مجھے لگا، وہ چیونٹی چیونٹی نہیں کوئی آدمی ہے، اور نہ صرف آدمی بلکہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جھنٹو کے بہنوئی صاحب مچھلی پکڑنے گئے ہیں اور پھسل کر کیچڑ میں گر پڑے ہیں، اچھی طرح سے تیرنا نہ جاننے کی وجہ سے ڈبکیاں لگا رہے ہیں اور ہاتھ پاؤں پٹک رہے ہیں۔ یاد ہے جھنٹو کے بہنوئی صاحب کو جھنٹو کے بڑے بھیا اور نوکر نرہری نے بچایا تھا؟

جیسے ہی مجھے یہ بات یاد آئی، میرے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ چیونٹی کو بچالوں۔

بخار کی حالت میں ہی جھٹ سے بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بغل کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں پتاجی کے رائٹنگ پیڈ سے ذرا سا بلوٹنگ پیپر پھاڑ کر ایک ہی دوڑ میں اپنے کمرے میں واپس چلا آیا اور چھلانگ لگا کر بلوٹنگ پیپر کے ٹکڑے کو پانی پر رکھ دیا۔ رکھنے کے ساتھ ہی بلوٹنگ پیپر نے پانی کو جذب کر لیا۔

جان بچنے کی وجہ سے چیونٹی ایک پل کو ہکا بکا رہ گئی، ایک دوبار اِدھر اُدھر مڑتی ہوئی سیدھی نالی میں چلی گئی۔

اس دن پھر کوئی چیونٹی نہیں آئی۔

دوسرے روز میرا بخار بڑھ گیا۔ دوپہر میں ماں اپنا کام ختم کر کے کمرے میں آئیں اور بولیں، ”کھڑکی کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیوں تاک رہے ہو؟ اتنا بخار ہے، چاہے نیند آئے چاہے نہ آئے، آنکھیں بند کر کے چپ چاپ لیٹے رہو۔“

ماں کو خوش کرنے کی غرض سے میں نے آنکھیں بند کر لیں، مگر ان کے جاتے ہی آنکھ کھول کر نالی کی طرف تاکنے لگا۔

تیسرے پہر جب سورج پیڑوں کے پیچھے چلا گیا، ایک چیونٹی کو نالی کے منہ سے جھانکتے ہوئے دیکھا۔

Scanned with CamScanner

اچانک وہ باہر نکل آئی اور کھڑکی پر چہل قدمی کرنے لگی۔

سبھی چیونٹیاں حالانکہ ایک جیسی ہوتی ہیں، پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کل والی ہی وہ چیونٹی ہے جو مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ میں نے چونکہ دوست کی طرح برتاؤ کیا تھا، اس لیے آج ہمت جٹا کر میرے پاس آئی ہے۔

میں نے پہلے سے ہی منصوبہ بنالیا تھا۔

بھنڈار خانے سے ایک چمچہ چینی لے آیا تھا اور اسے کاغذ میں موڑ کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ اس میں سے ایک بڑا دانہ نکال کر میں نے کھڑکی پر رکھ دیا۔

چیونٹی اچانک چونک کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ چینی کے دانے کے پاس آکر اسے چاروں طرف سے چھو کر دیکھا۔ اس کے بعد نہ جانے کیا سوچا اور مڑ کر نالی کے اندر چلی گئی۔

میں نے سوچا، واہ جی واہ، کھانے کے لیے اتنی عمدہ چیز دی اور محترمہ چھوڑ کر لاپتا ہوگئیں! پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب آئے۔ میری نبض اور زبان دیکھی، چھاتی اور پیٹھ کی اسٹیتھوسکوپ سے جانچ کی۔ سب کچھ دیکھنے سننے کے بعد کہا کہ مجھے کسیلی دوا اور پینا ہے۔ دو دن کے بعد بخار اتر جائے گا۔

سن کر میرا دل اداس ہوگیا۔ بخار اترنے کا مطلب ہے اسکول جانا، اور اسکول جانے کا مطلب ہے دوپہر کی بربادی۔ دوپہر کو ہی چیونٹی میری کھڑکی سے ہوکر آتی ہے۔ خیر، ڈاکٹر کے کمرے سے جاتے ہی میں نے پھر سے کھڑکی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور میرا دل پھر سے خوشیوں سے بھر اٹھا۔ اس بار ایک نہیں بے شمار چیونٹیاں قطار باندھ کر نالی سے ہوکر اندر آرہی ہیں۔ سامنے کی چیونٹی میری وہی جانی پہچانی چیونٹی ہے۔ اسی نے باقی چیونٹیوں کے پاس خبر پہنچائی ہوگی اور اب سب کو اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔

تھوڑی دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد چیونٹی کی عقلمندی کا نمونہ دکھائی دیا۔ سبھی چیونٹیوں نے مل کر چینی کے دانے کو ڈھکیلنا شروع کیا اور کھینچتی ہوئی نالی کی طرف لے گئیں۔ یہ بات اتنی مزیدار تھی کہ بغیر دیکھے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دل ہی دل میں سوچنے لگا، میں اگر چیونٹی ہوتا تو ضرور ہی سنتا کہ وہ کہہ

Scanned with CamScanner

رہی ہیں: ''مارو جوان، ہیا! اور بھی تھوڑا، ہیا! چلے انجن، ہیا!''

بخار اترنے کے بعد شروع میں کئی دنوں تک اسکول میں بہت برا لگتا رہا۔ کلاس میں بیٹھا بیٹھا صرف اپنی کھڑکی کی بات سوچتا رہتا تھا۔ پتا نہیں کتنی طرح کی چیونٹیاں وہاں آجا رہی ہوں گی۔ اتنا ضرور ہے کہ آتے وقت ہر روز میں کھڑکی پر چینی کے دو تین دانے رکھ آتا تھا۔ تیسرے پہر جب میں لوٹ کر جاتا تو ان دانوں کو وہاں سے ندارد پاتا تھا۔

کلاس میں زیادہ تر میں بیچ کی بنچ پر بیٹھتا تھا۔ میری بغل میں شیتل بیٹھتا تھا۔ ایک دن مجھے جانے میں دیر ہوگئی اور وہاں پہنچنے پر شیتل کی بغل میں فنی کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ کیا کرتا، پیچھے دیوار کی طرف ایک سیٹ خالی تھی، اسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

ٹفن سے پہلے تاریخ کی کلاس تھی۔ ہارادھن بابو اپنی مہین آواز میں ہینی بال کی بہادری کی کہانی سنا رہے تھے۔ ہینی بال نے کارتھیج سے فوج لے کر آلپس پہاڑ کو پار کیا تھا اور اس کے بعد اٹلی پر چڑھائی کی تھی۔ سنتے سنتے مجھے لگا کہ ہینی بال کی فوج اسی کمرے میں ہے اور میرے قریب سے ہو کر چلی جا رہی ہے۔

اِدھر اُدھر تاکتے ہی پیچھے کی دیوار پر میری آنکھیں ٹک گئیں۔ دیکھا، چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار دیوار سے نیچے اتر رہی ہے۔ ٹھیک فوج کی طرح کالی کالی چھوٹی چھوٹی ان گنت چیونٹیوں کی قطاریں مسلسل ایک ہی انداز سے چلی جا رہی ہیں اور رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہیں۔

ٹفن کی گھنٹی بجتے ہی میں باہر نکل آیا۔ کلاس کے پیچھے کی طرف جا کر اس درار کو ڈھونڈ نکالا۔ دیکھا، چیونٹیاں دیوار کی درار سے نکل کر گھاس کے بیچ سے سیدھے امرود کے درخت کی طرف جا رہی ہیں۔

چیونٹیوں کی قطار کا پیچھا کرتے ہوئے جب پیڑ کے تنے کے پاس پہنچا تو جس چیز پر نگاہ پڑی اسے قلعے کے علاوہ کیا کہا جائے!

دیکھا، قلعے کی طرح ہی اونچا ایک مٹی کا ٹیلا ہے، اس کے نیچے کی طرف ایک پھاٹک ہے اور اسی پھاٹک سے قطار باندھ کر چیونٹیوں کی فوج اندر داخل ہو رہی ہے۔

میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ قلعے کی اندرونی حصے کو ذرا دیکھ لوں۔ جیب میں جو پنسل

Scanned with CamScanner

تھی، اس کی نوک سے میں نے ٹیلے کے اوپر کی مٹی کو آہستہ آہستہ ہٹانا شروع کیا۔

شروع میں کچھ نہ ملا، مگر اس کے بعد جس چیز پر میری نگاہ پڑی اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ قلعے کے اندر چھوٹے چھوٹے بہت سے خانے بنے ہیں اور ایک خانے سے دوسرے خانے میں جانے کے لیے ان گنت سرنگیں بچھی ہیں۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے! ان چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیروں سے اس طرح کے مکان ان لوگوں نے کیسے بنائے؟ ان میں اتنی عقل کہاں سے آئی؟ کیا ان لوگوں کے بھی اسکول اور ماسٹر ہیں؟ یہ لوگ بھی کیا پڑھتے لکھتے ہیں، حساب کرتے ہیں، تصویر بناتے ہیں اور کاریگری سیکھتے ہیں؟ پھر کیا سوائے چہرے کے آدمی اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے؟ شیر، بھالو، ہاتھی، گھوڑا وغیرہ اپنے اپنے گھر اپنے ہاتھوں سے کہاں بنا پاتے ہیں؟ یہاں تک کہ پالتو کتے بھی نہیں۔

چڑیا ضرور گھونسلا بناتی ہیں مگر ان کے گھونسلے میں بہت سی چڑیاں رہ سکتی ہیں؟ چڑیاں کیا ان لوگوں کی طرح قلعہ بنا سکتی ہیں جن میں ہزاروں چڑیاں ایک ساتھ رہ سکیں؟

قلعے کا کچھ حصہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے چیونٹیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔

مجھے بہت افسوس ہوا۔ دل ہی دل میں سوچا، ان لوگوں کو میں نے نقصان پہنچایا ہے تو اب بھلائی بھی کرنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں کروں گا تو چیونٹیاں مجھے اپنا دشمن سمجھ لیں گی، اور میں ان کا دشمن نہیں بننا چاہتا۔ اصل میں ان کا دوست ہوں، اس لیے دوسرے دن میں نے اس سندیش کا آدھا حصہ، جو ماں نے مجھے کھانے کو دیا تھا، سکھوئے کے ایک پتے میں موڑ کر جیب میں رکھ لیا۔ اسکول پہنچنے پر گھنٹہ بجنے کے پہلے ہی سندیش کے اس ٹکڑے کو چیونٹیوں کے بل کے پاس رکھ دیا۔ بیچاروں کو کھانے کی تلاش میں بہت دور جانا پڑتا ہے۔ آج گھر سے باہر نکلتے ہی انھیں اپنے سامنے کھانے کا پہاڑ دکھائی دے گا۔ یہ کیا کوئی کم احسان ہے؟

اس کے کچھ دن بعد ہی گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور چیونٹیوں سے میری دوستی اور بھی گہری ہوگئی۔ چیونٹیوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے بارے میں جو ساری حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئیں بیچ بیچ میں میں بڑے بزرگوں کو وہی باتیں بتاتا تھا، مگر وہ میری بات پر توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے اس وقت آتا جب وہ میری باتیں ہنس کر اڑا دیتے۔ اس لیے ایک دن طے کیا کہ اب کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا، جو کرنے کا ہوگا خود ہی کروں گا۔ جو کچھ بھی معلومات ہوگی اسے اپنے تک ہی محدود

رکھوں گا۔

ایک دن ایک واقعہ پیش آیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ میں جھنو کے مکان کی دیوار پر بنی ماٹے کی ایک بانبی کے پاس بیٹھا تھا اور ماٹوں کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ بہت سے لوگ کہیں گے کہ ماٹے کی بانبی کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھا نہیں جا سکتا، کیونکہ ماٹا کاٹ لیتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس کے پہلے ماٹا مجھے کاٹ چکا ہے، مگر کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اب وہ مجھے نہیں کاٹتا۔ میں بے فکری کے ساتھ بیٹھا ہوا ماٹوں کو دیکھ رہا تھا کہ تبھی چھکو وہاں آدھمکا۔ چھکو کے بارے میں اس کے پہلے میں نے کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔ اس کا اصل نام شری کمار ہے۔ وہ ہمارے ہی درجے میں پڑھتا ہے، مگر ہم لوگوں سے کافی بڑا ہے، کیونکہ داڑھی مونچھیں اُگ آئی ہیں۔ چھکو صرف شاگردی کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اسے پیار نہیں کرتا— میں بھی نہیں۔ لیکن ایسا ہونے پر بھی میں اس سے کبھی الجھتا نہیں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت طاقتور ہے۔

مجھے دیکھ کر چھکو نے کہا، ''ارے بیوقوف، یہاں بیٹھ کر کس کا انتظار کر رہا ہے؟''

میں نے چھکو کی باتوں پر توجہ نہیں دی مگر دیکھا، وہ میری طرف آرہا ہے۔

میں ماٹوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چھکو نے میرے پاس آکر پوچھا، ''کیا ہو رہا ہے؟ حال چال اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

میں نے اب چھپانے کی کوشش نہیں کی اور اصل بات بتا دی۔

سن کر چھکو دانت پیسنے لگا اور بولا، ''ماٹے دیکھ رہے ہو۔ اس کا مطلب؟ اس میں دیکھنے کی کیا چیز ہے؟ چیونٹی کیا تمھارے گھر میں نہیں ہے کہ یہاں دیکھنے پہنچ گئے؟''

مجھے بہت غصہ آیا۔ میں کچھ بھی کروں، اس سے تمھارا کیا بگڑتا ہے؟ ہر بات میں دخل اندازی کرتا ہے اور اپنی قابلیت دکھاتا ہے!

میں نے کہا، ''دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے، اس لیے دیکھتا ہوں۔ چیونٹی کا راز تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تمھیں جو اچھا لگے جا کر وہی کرو، یہاں پریشان کرنے کیوں آگئے؟''

میری بات سن کر چھکو جنگلی بلّے کی طرح کھسیا گیا اور بولا، ''اوہ! دیکھنا اچھا لگتا ہے! چیونٹی

Scanned with CamScanner

دیکھنا اچھا لگتا ہے؟ پھر تو دیکھو!'' یہ کہہ کر چھکو نے لاٹھی کی چوٹ سے ماٹے کی بانبی کو توڑ کر برباد کر دیا، اور اس چوٹ سے کم سے کم پانچ سو چیونٹیوں کی جان چلی گئی۔ لاٹھی مار کر چھکو ہنستا ہوا چلا جا رہا تھا۔ تبھی میرے سر پر بھوت سوار ہو گیا۔

میں نے چھلانگ لگائی اور چھکو کے بالوں کو کس کر پکڑ لیا اور پھر اس کے سر کو جھنو کی دیوار سے چار پانچ بار زور سے ٹکرا دیا۔

اس کے بعد جب میں نے چھکو کو چھوڑا تو وہ روتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

میں جب گھر پہنچا تو چھکو اس سے پہلے ہی میری شکایت پہنچا گیا تھا، مگر حیرت کی بات ہے کہ تب ماں نے نہ تو مجھے مارا اور نہ ہی ڈانٹا پھٹکارا۔ دراصل اسے یقین ہی نہیں ہوا، کیونکہ اس کے پہلے میں نے کسی سے مار پیٹ نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ ماں کو یہ معلوم تھا کہ میں چھکو سے ڈرتا ہوں۔

مگر بعد میں جب ماں نے مجھ سے اس بارے میں پوچھ گچھ کی تو میں نے سچ بات کہہ دی۔

''چھکو کا سر پھوڑ دیا ہے؟''

میں نے کہا، ''ہاں! چھکو ہی کیوں، جو بھی آدمی چیونٹی کی بانبی توڑے گا، اس کا سر پھوڑ دوں گا۔''

اس بات پر ماں کو بہت غصہ آیا۔ اس نے مجھے بہت پیٹا اور کمرے کے اندر بند کر دیا۔ وہ ہفتے کا دن تھا۔ پتا جی جلدی ہی کچہری سے لوٹ آئے تھے۔ جب ماں سے انھیں ساری باتیں معلوم ہوئیں تو انھوں نے میرے کمرے کے دروازے پر باہر سے تالا لگا دیا۔ مار کھانے کی وجہ سے حالانکہ میری پیٹھ میں درد ہو رہا تھا، مگر اس کا میرے دل میں کوئی افسوس نہیں تھا۔ اگر افسوس تھا تو چیونٹیوں کی موت کا ہی۔ ایک بار صاحب گنج میں، جہاں پریمل رہتا ہے، دو ریل گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئی تھیں اور تقریباً تین سو آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ آج چھکو کے لاٹھی کے وار سے اتنی بہت سی چیونٹیاں مر گئیں۔

کتنی بے انصافی ہے! کتنی بے انصافی!

بستر پر لیٹے لیٹے جب یہی سوچ رہا تھا تو میرا سر چکرانے لگا اور میں بدن میں سردی محسوس کرنے لگا۔ چادر تان کر میں نے کروٹ بدلی۔

اس کے بعد کب میری آنکھوں میں نیند اتر آئی، اس کا پتا نہیں چلا۔

Scanned with CamScanner

ایک بہت ہی مہین اور شیریں آواز، بہت کچھ موسیقی کی طرح، با قاعدہ اتار چڑھاؤ کے ساتھ سنائی دے رہی ہے۔

میں نے غور سے سننے کی کوشش کی مگر پتا نہیں چلا کہ وہ آواز کدھر سے آرہی ہے۔ شاید کہیں دور موسیقی کا پروگرام چل رہا ہے، لیکن اس طرح کا گیت اس سے پہلے سننے کو نہیں ملا ہے۔

لیجیے، میں گیت سننے میں مگن ہوں، اور یہ ہستی کب نالی سے آکر حاضر ہوگئی ہے اس کا علم ہی نہیں ہو سکا۔

اب میں نے ٹھیک سے پہچانا۔ یہ میری وہی پرانی اور جانی پہچانی چیونٹی ہے، جسے میں نے پانی سے بچایا تھا۔ میری طرف تاکتی ہوئی، دونوں پیروں کو ماتھے سے جوڑ کر مجھے نمسکار کر رہی ہے۔ اس کا نام کیا رکھا جائے؟ کالی؟ کیشٹو؟ کالا چاند؟ سوچنا ہوگا۔ دوست ہو مگر کوئی نام نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔

میں نے اپنی ہتھیلی کھڑکی پر رکھ دی۔ اپنے اگلے پیروں کو سر سے نیچے کی طرف ہٹا کر چیونٹی آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگی۔ اس کے بعد میری چھنگلیا سے ہوتی ہوئی میرے ہاتھ پر آئی اور میری ہتھیلی کی بل کھاتی ہوئی ندی جیسی لکیروں پر چہل قدمی کرنے لگی۔ اسی وقت دروازے پر کھٹ کی آواز ہوئی اور میں چونک اٹھا۔ چیونٹی بھی بڑبڑاتی ہوئی ہاتھ سے نیچے اتر آئی اور نالی کے اندر چلی گئی۔

اس کے بعد ماں تالا کھول کر اندر آئی اور مجھے ایک کٹورا دودھ پینے کے لیے دیا۔ پھر میری آنکھوں کو دیکھنے اور بدن کو چھونے پر اس کو پتا چلا کہ مجھے بخار آگیا ہے۔

دوسرے روز صبح ڈاکٹر صاحب آئے۔ ماں نے کہا، ''سدا نند رات بھر چھٹ پٹ چھٹ پٹ کرتا رہا ہے اور کالی کالی بڑبڑاتا رہا ہے۔'' ماں نے شاید سوچا کہ میں دیوی دیوتا کا نام لے رہا تھا۔ اصل بات ماں کو معلوم ہی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جب میری پیٹھ پر اسٹیتھو سکوپ لگایا تو اس وقت بھی مجھے کل کی طرح شیریں موسیقی سنائی دی۔ آج آواز کل سے کچھ تیز تھی اور سُر بھی کچھ دوسری طرح کا محسوس ہوا۔ کھڑکی کی طرف سے موسیقی کی آواز آرہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے مجھے چپ چاپ لیٹے رہنے کو کہا تھا، اس لیے میں مڑ کر نہیں دیکھ سکا۔ ڈاکٹر میرے بدن کی جانچ کر کے کھڑے ہوگئے اور میں نے ترچھی نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باپ رے، آج تو ایک نیا ہی دوست آیا ہے۔ چیونٹا، اور وہ مجھے

Scanned with CamScanner

نمسکار کر رہا ہے! پھر کیا تمام چیونٹیاں ہی میری دوست ہیں؟

گانا بھی کیا یہ چیونٹا گا رہا ہے؟

مگر ماں تو گانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ رہی ہے۔ تو کیا وہ سن نہیں پا رہی ہے؟ پوچھنے کے خیال سے میں ماں کی طرف مڑا ہی تھا کہ دیکھا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھڑکی کی طرف تاک رہی ہے۔ اس کے بعد اچانک میز سے میری حساب کی کاپی اٹھا کر میری طرف جھکی اور کاپی پٹک کر اسے مار ڈالا۔

اس کے ساتھ ہی گانے کا سلسلہ ختم گیا۔ ماں نے کہا، "باپ رے، چیونٹے کا حوصلہ کتنا بڑھ گیا ہے! کہیں تکیے پر چڑھ کر کان کے اندر جا کر کاٹ لے تو حالت خراب ہو جائے!"

ڈاکٹر صاحب جب انجکشن دے کر چلے گئے تو میں نے مرے ہوئے چیونٹے کی طرف دیکھا۔ اتنا پیارا گیت گاتے گاتے بیچارہ چل بسا۔ یہ حال تو ٹھیک میرے اِندرناتھ دادا جی کی طرح ہوا۔ وہ بھی بہت میٹھے گیت گاتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ ان کا گیت ہماری سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آتا تھا، لیکن بزرگوں کا کہنا تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کا شاستریہ سنگیت تھا۔

وہ بھی اسی طرح ایک دن تان پورا لے کر گیت گا رہے تھے کہ اچانک ان کی موت ہو گئی۔ جب انھیں شمشان کی طرف لے جایا گیا تھا تو ان کے پیچھے پیچھے شہر کا ایک کیرتن منڈل بھی تھا جو ہری نام کا سنکیرتن گاتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ بات مجھے اب بھی یاد ہے، حالانکہ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔

آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ انجکشن لے کر جب میں نیند میں کھو گیا تو خواب میں دیکھا، چیونٹیوں کا ایک بہت بڑا جلوس مرے ہوئے چیونٹے کو اندرناتھ دادا جی کی طرح ہی شمشان کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ دس یا بارہ چیونٹوں نے اسے کندھے پر اٹھا لیا ہے اور باقی چیونٹیاں کیرتن جیسا گیت گاتی ہوئی پیچھے پیچھے چلی جا رہی ہیں۔

تیسرے پہر جیسے ہی ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ویسے ہی میری نیند کھل گئی۔ میں نے غور سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں مرا ہوا چیونٹا نہیں تھا۔ اس بار میرا بخار آسانی سے اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اترے تو کیسے، قصور تو میرے گھر والوں کا ہی ہے۔ گھر کے سبھی لوگوں نے چیونٹیوں کو مارنا

Scanned with CamScanner

شروع کر دیا تھا۔ اگر دن بھر چیونٹیوں کی اس طرح کی چیخیں سننا پڑیں تو بخار بڑھے گا ہی۔

مجھے ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے گھر کے لوگ جب بھنڈار خانے یا آنگن میں چیونٹیوں کو مارتے ہیں تو دوسری چیونٹیوں کا دل میری کھڑکی کے پاس آ کر بے حد رونے لگتا ہے۔ سمجھ گیا، یہ چیونٹیاں چاہتی ہیں کہ میں ان کی طرف سے کوئی کام کروں۔ یا تو چیونٹیوں کا مارا جانا رکوا دوں یا جو لوگ ان کو مارتے ہیں، انھیں ڈانٹ پھٹکار سناؤں۔ مگر بخار رہنے کی وجہ سے میرے بدن میں طاقت نہیں تھی، اور طاقت ہوتی تو بھی چھوٹا ہونے کی وجہ سے بڑے بوڑھوں اور بزرگوں کو کیسے ڈانٹ پھٹکار سناتا؟

مگر آخر میں کچھ نہ کچھ انتظام کرنا ہی پڑا۔ دن کون سا تھا، یاد نہیں۔ اتنا ہی یاد ہے کہ اس روز صبح جلد ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔ نیند کھلتے ہی سنا، پھٹک کی ماں خوب چلا چلا کر کہہ رہی ہے کہ رات کے وقت ایک چیونٹے نے اس کے کان کے اندر جا کر کاٹ لیا ہے۔ یہ بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی، مگر اس کے بعد ہی جھاڑو پیٹنے کی آواز سمجھ گیا کہ چیونٹیوں کو مارنے کی مہم شروع ہو گئی ہے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اچانک کانوں میں ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ''بچاؤ بچاؤ! ہم لوگوں کی حفاظت کرو!'' میں نے کھڑکی کی طرف بغور دیکھا۔ چیونٹیوں کی قطار کھڑکی کے اوپر آ کر گھبراہٹ کے باعث بے چینی سے ٹہل رہی ہے۔

چیونٹیوں کے منھ سے یہ بات سن کر میں خاموش نہیں رہ سکا۔ بیماری کی بات بھول کر میں بستر سے کود کر برآمدے میں چلا آیا۔ شروع میں میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں۔ اس کے بعد سامنے ایک گھڑا دیکھ کر اسے اٹھا کر پٹک دیا۔

اس کے بعد جو بھی ٹوٹنے لائق چیزیں تھیں، انھیں توڑنا شروع کر دیا۔

میں نے بہت ہی کارگر طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا، کیونکہ اس کے بعد میرا غصہ دیکھ کر چیونٹیوں کو مارنے کا کام رک گیا، مگر اس وقت ماں، بابو جی، چھوٹی بُوا جی، سابی جی، جتنے بھی لوگ تھے گھبرا کر باہر نکل آئے اور مجھے کس کر پکڑ لیا۔ اس کے بعد مجھے گود میں اٹھا کر پلنگ پر پٹک دیا اور دروازے کو تالے سے بند کر دیا۔ میں دل ہی دل میں بے حد ہنسا اور میری کھڑکی پر چیونٹیوں نے خوشی کے مارے ناچنا شروع کر دیا اور مجھے شاباشی دینے لگیں۔

Scanned with CamScanner

اس کے بعد میں زیادہ دنوں تک گھر میں نہیں رہا، کیونکہ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے میری جانچ کرنے کے بعد کہا کہ گھر پر رہنے سے علاج میں پریشانی ہوگی اور اس لیے مجھے اسپتال جانا ہوگا۔

اس وقت میں جہاں ہوں، وہ اسپتال کا ایک کمرہ ہے۔ میں یہاں چار دنوں سے ہوں۔

پہلے دن یہ کمرہ مجھے بہت برا لگا تھا کیونکہ یہ اتنا صاف ستھرا ہے کہ لگتا ہے چیونٹی یہاں ہو ہی نہیں سکتی۔ چونکہ کمرہ نیا ہے اس لیے کوئی سوراخ یا درار نہیں ہے۔ کوئی الماری بھی نہیں ہے کہ جس کے نیچے یا پیچھے کوئی چیونٹی رہ سکے۔ نالی البتہ ہے، مگر وہ بھی بے حد صاف ستھری ہے۔ ہاں، ایک کھڑکی ہے اور کھڑکی کے باہر ہی آم کے ایک پیڑ کا اوپری حصہ ہے۔ اس کی ایک شاخ کھڑکی کے بالکل قریب ہے۔

سمجھ گیا، اگر چیونٹی ہوگی تو اسی شاخ پر ہوگی۔

مگر پہلے دن میں کھڑکی کے پاس جا ہی نہ سکا کیسے جاؤں؟ دن بھر ڈاکٹر، نرس اور گھر کے لوگ میرے کمرے میں اندر آتے جاتے رہتے ہیں۔

دوسرے دن بھی یہی حالت رہی۔ میرا دل بے حد اداس ہوگیا۔ میں نے دوا کی ایک شیشی توڑ ڈالی۔ نئے ڈاکٹر صاحب بے حد جھنجھلا اٹھے۔ نئے ڈاکٹر صاحب بھلے آدمی نہیں ہیں، یہ بات سمجھ گیا تھا۔ تیسرے روز ایک اور واقعہ پیش آیا۔

اس وقت میرے کمرے میں ایک نرس کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور وہ بھی کونے کی ایک کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھنے میں محو تھی۔ میں خاموش لیٹا ہوا تھا اور یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی وقت دھپ سے آواز ہوئی اور میری آنکھیں اس طرف گھوم گئیں۔ دیکھا اس کے ہاتھ سے کتاب گود میں گر گئی ہے اور وہ نیند میں گم ہوگئی ہے۔

یہ دیکھ کر میں آہستہ سے بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے بعد کھڑکی کے نچلے پلّے پر پاؤں رکھ کر، اور اپنے جسم کو جہاں تک ہو سکا باہر نکال کر میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میرے ہاتھ کی پہنچ میں آم کی ایک شاخ آگئی جسے پکڑ کر میں نے کھینچنا شروع کیا۔ ٹھیک اسی وقت میرا داہنا پاؤں اچانک پلّے سے کھسک گیا اور کھٹ سے آواز ہوئی۔ اس آواز سے نرس کی نیند ٹوٹ گئی۔

اب جاؤں تو کہاں جاؤں!

نرس کے منھ سے ایک تیز آواز نکلی اور وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس کے بعد مجھے پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے آئی اور بستر پر پٹک دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک انجکشن دیا۔ ان لوگوں کی گفتگو سے پتا چلا کہ میں کھڑکی سے نیچے کودنے جارہا تھا۔ کتنے بے وقوف ہیں یہ لوگ! اتنی اونچائی سے اگر آدمی کودے تو اس کی ہڈی پسلی تو ٹوٹے گی ہی، ساتھ ہی ساتھ جان جانے کی بھی نوبت آجائے گی۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد مجھے نیند آنے لگی، اور اپنے مکان کی کھڑکی کی بات بھی یاد آنے لگی۔ میرا دل بہت ہی اداس ہوگیا۔ معلوم نہیں، کب گھر لوٹوں گا۔

سوچتے سوچتے میں سوگیا تھا کہ تبھی ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ''سپاہی حاضر ہے حضور، سپاہی حاضر ہے۔''

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ میرے پلنگ کی بغل والی میز کی سفید چادر پر دوا کی شیشی کے بالکل پاس ہی بے حد وقار کے ساتھ دو لال ماٹے کھڑے ہیں۔ یہ دونوں ضرور یہیں درخت سے میرے ہاتھ پر سے ہوتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ مجھے اس کا پتا بھی نہیں چلا۔

میں نے کہا، ''سپاہی؟''

جواب ملا، ''ہاں، حضور!''

''تم لوگوں کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ایک نے کہا، لال بہادر سنگھ، اور دوسرے نے اپنا نام لال چند بتایا۔

مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے ان دونوں کو ہوشیار کردیا کہ باہر کا کوئی آدمی آئے تو وہ کہیں چھپ جائیں، ورنہ ان کی جان چلی جائے گی۔ لال چند اور لال بہادر نے مجھے لمبی سلامی دی اور کہا، ''ٹھیک ہے حضور!''

اس کے بعد دونوں نے مل کر ایک بہت ہی مدھر گیت گانا شروع کردیا۔

میں اس گیت کو سنتے سنتے سوگیا۔

اب جلدی جلدی کل کا واقعہ سنادوں، کیونکہ گھڑی پانچ بار ٹن ٹن آواز کر چکی ہے۔ ڈاکٹر کے

Scanned with CamScanner

آنے کا وقت ہو چکا ہے۔

کل تیسرے پہر میں لیٹا لیٹا لال بہادر اور لال چند کی کشتی دیکھ رہا تھا۔ میں بستر پر تھا اور وہ لوگ میز پر۔ دوپہر میں مجھے سونا چاہیے تھا، مگر کل انجکشن لینے اور دوا کھانے کے باوجود نیند نہیں آئی تھی۔ یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ جان بوجھ کر میں نے نیند کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ دوپہر میں اگر سو جاتا تو چیونٹیوں کے ساتھ کب کھیلتا؟

کشتی زور شور سے چل رہی تھی۔ جیت کس کی ہوگی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تبھی کھٹ کھٹ کرتی جوتے کی آواز ہوئی— لو، ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔

میں نے اپنے دوستوں کو اشارہ کیا اور لال بہادر جھٹ سے میز کے نیچے چلا گیا۔

مگر بیچارا لال چند لڑتے لڑتے چت ہو کر گر پڑا تھا اور ہاتھ پاؤں خلا میں پٹک رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جلدی سے بھاگ نہیں سکا اور اسی وقت ایک بہت بڑا حادثہ ہو گیا۔

ڈاکٹر بابو نے وہاں آ کر لال چند کو میز پر دیکھا تو پتا نہیں انگریزی میں جھنجھلا کر کیا کہا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے فرش پر پٹک دیا۔

لال چند بے حد زخمی ہو گیا، یہ بات اس کی چیخ سے ہی ظاہر ہو گئی۔

مگر میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟ اس بیچ میری نبض کی جانچ کرنے کے خیال سے ڈاکٹر صاحب نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ایک بار میں نے ہاتھ ہٹا کر اٹھنے کی کوشش بھی کی مگر دوسری طرف سے نرس نے آ کر مجھے کس کر پکڑ لیا۔

نبض کی جانچ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب ہر روز کی طرح منھ لٹکائے، اپنی مونچھوں کے ارد گرد کے حصے کو کھجلاتے ہوئے دروازے کی طرف جا ہی رہے تھے کہ نہ جانے کیوں اچانک اچھل پڑے اور ان کے منھ سے تین چار قسم کے بنگلہ انگریزی کے الفاظ ادا ہوئے: ''آہ! اوہ! آؤچ!''

اس کے بعد تو طوفان آ گیا۔ اسٹیتھوسکوپ نکل کر نیچے گر پڑا، چشمہ گر کر ٹوٹ گیا، کوٹ کھولتے وقت بٹن ٹوٹ گیا، ٹائی کھولنے میں گلے میں گانٹھ لگ گئی، آخر میں قمیص کھولنے پر ناف کا سوراخ تک نظر آنے لگا، پھر بھی ڈاکٹر کا اچھلنا اور چلانا بند نہیں ہوا۔ میں تو حیران رہ گیا۔

نرس نے پوچھا، ''کیا ہوا سر؟''

ڈاکٹر صاحب نے اچھلتے اچھلتے کہا، ''اینٹ، ریڈ اینٹ... آستین سے چڑھ کر... اوہ! اوہ!''

واہ واہ! بات کیا میری سمجھ میں نہیں آئی؟
اب مزہ چکھو! آستین سے ہو کر لال بہادر سنگھ گیا تھا— دوست کا بدلہ لینے کے لیے۔
اس وقت اگر کوئی مجھے دیکھتا تو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سدانند ہنسنا نہیں جانتا۔

❄❄

Scanned with CamScanner

ہندوستانی کتب

موازنۂ انیس و دبیر
مولانا شبلی نعمانی
تصحیح و ترتیب: رشید حسن خاں
قیمت: 100 روپے

تنقیدی افکار
(تنقید)
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت: 248 روپے

آشفتہ بیانی میری
(خودنوشت)
رشید احمد صدیقی
قیمت: 100 روپے

خنداں
(طنز و مزاح پر مبنی ریڈیائی تقریریں)
رشید احمد صدیقی
قیمت: 160 روپے

طنزیات و مضحکات
(فنِ طنز نگاری)
رشید احمد صدیقی
قیمت: 120 روپے

تفہیم
(تحقیقی مضامین)
رشید حسن خاں
قیمت: 150 روپے

گدازِ شب
(شاعری)
معین احسن جذبی
قیمت: 80 روپے

انتخابِ مضامینِ شبلی
مولانا شبلی نعمانی
تصحیح و ترتیب: رشید حسن خاں
قیمت: 150 روپے

آدھا گاؤں
(ناول)
راہی معصوم رضا
ترجمہ: اسلم جمشید پوری
قیمت: 500 روپے

نیرنگِ خیال
مولانا محمد حسین آزاد
قیمت: 60 روپے

Scanned with CamScanner

پرمودیا اننتا تور (Pramoedya Ananta Toer) کو انڈونیشیا کا عظیم ترین ناول نگار مانا جاتا ہے۔ 1925 میں مشرقی جاوا کے بلورا (Blora) گاؤں میں پیدا ہونے والے پرمودیا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا چار ناولوں پر مشتمل سلسلہ (Buru Quartet) ہے جس میں انیسویں صدی کے آغاز سے انڈونیشیا کے نوآبادیاتی تسلط میں آنے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ انھوں نے ولندیزیوں کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران ملک پر جاپانی قبضے اور بیرونی تسلط کے خلاف چلائی جانے والی آزادی کی تحریک سے گہرا تخلیقی اثر قبول کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پانے کے بعد وہ جاوا کے مشرقی سرے پر واقع بندرگاہ سُرابایا (Surabaya) چلے گئے جہاں انھوں نے ریڈیو ووکیشنل اسکول میں اپنی تعلیم 1941 میں مکمل کی۔ جاپانی قبضے کے دنوں میں انھوں نے جکارتا میں ایک اسٹینوگرافر کے طور پر کام کرتے ہوئے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کا پہلا ناول 1947 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ولندیزی (Dutch) نوآبادیاتی حکومت نے انھیں سیاسی کارکن ہونے کی بنا پر مختلف مقامات پر دو برس قید میں رکھا۔ 1950 میں ان کی تحریروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ان کے کئی ناول، بہت سی کہانیاں اور مضامین شائع ہوئے۔ ان کے ناول مفرور (The Fugitive) کو ایک ادبی انعام بھی ملا۔ 1965 میں انڈونیشیائی فوج کے ہاتھوں بائیں بازو کے کارکنوں کے بہت بڑے قتل عام کے بعد سوہارتو نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ فوجی حکومت نے اسی سال اکتوبر میں مقدمہ چلائے بغیر پرمودیا کو قید میں ڈال دیا۔ اگلے چودہ برس انھیں بورو جزیرے میں قید رکھا گیا جہاں سے وہ 1979 میں رہا ہوئے۔ قید کیے جانے سے پہلے ان کی تمام کتابیں، مسودات اور کاغذات تلف کردیے گئے تھے۔ ان میں وہ نوٹس بھی شامل تھے جو پرمودیا نے ناولوں کے اس سلسلے کے لیے تحریر کیے تھے جو انھیں لکھنا تھا۔ قید کے ابتدائی برسوں میں ان کے لیے لکھنا ممنوع رہا۔ آخرکار 1973 میں انھیں ٹائپ رائٹر استعمال کرنے کی اجازت دی گئی جس پر انھوں نے یہ چاروں ناول تحریر کیے جو ان کی رہائی کے بعد شائع ہوئے۔ تاہم انڈونیشیا کے اندر ان ناولوں پر پابندی رہی۔ قید سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے اپنی خودنوشت گونگے کی خودکلامی کے عنوان سے تحریر کی۔ پرمودیا اننتا تور 2006 میں انتقال کر گئے۔

ان ناولوں کا مرکزی کردار منکے (Minke) نام کا ایک نوجوان ہے جو جاوا کے ایک قدیم متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور ولندیزی اداروں میں تعلیم پانے کی بدولت دونوں ثقافتوں سے آشنائی رکھتا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس سلسلے کے ناول قدموں کی آہٹ (Footsteps) کے پہلے باب کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس ناول کے اگلے ابواب کا ترجمہ آئندہ شماروں میں شائع ہوتا رہے گا۔

Scanned with CamScanner

پرمودیا اننتا تور

انگریزی سے ترجمہ: سلیم صدیقی

قدموں کی آہٹ

1

بٹاوی کی مٹی آخر کار میرے قدموں کو چومنے لگی تھی۔ میں نے سمندر کی ساحلی ہوا کو اپنی گہری سانسوں میں سمیٹنا شروع کر دیا۔ خدا حافظ میرے پیارے رفیق سمندری جہاز، خدا حافظ میرے عزیز سمندر، خدا حافظ میرے ماضی کا حصہ بننے کے لیے بیتاب واقعات، اے اندھیری ساعتو! تم بھی کچھ رعایتوں کی مستحق نہیں، تمھیں بھی الوداع۔

میں بٹاوی کی کائنات میں داخل ہو رہا ہوں۔ بیسویں صدی کی کائنات میں۔ ارے ہاں انیسویں صدی صاحب! تمھیں بھی میرا آخری سلام۔

میں یہاں نصرت و فتح مندی کے حصول کے لیے آیا ہوں۔ کچھ عظیم الشان کارہائے نمایاں سرانجام دینے۔ کچھ کامیابیوں اور کامرانیوں کے مزیدار ذائقے سے روشناس ہونے۔ اور اے مشکلو، رکاوٹو! تم سب ایک طوفانِ بلاخیز میں بہہ جاؤ گی۔ جی ہاں، اگر اب میرے سامنے آنے کی جرأت کرو گی تو۔ لیکن Veni, Vidi, Vici جیسے نعروں کے پرچم اٹھا کر میرا اپنی فتح مندی کا ڈھنڈورا پیٹنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں یہاں فاتح بننے کی نیت سے نہیں آیا۔ کسی کو مفتوح بنانے کا میں نے کبھی بھی نہیں سوچا۔ جس نے بھی سیزر کے ان نعروں کے جھنڈے اٹھائے، وہ کبھی بھی فاتح نہیں ہو سکا۔ میرا دشمن

Scanned with CamScanner

رابرٹ سرہاف جیل میں پڑا ہے۔ محض راتوں رات نام ونمود حاصل کرنے کے لالچ میں۔

یہاں مجھ سے کوئی بھی تو ملنے نہیں آیا۔ تو کیا ہوا! لوگ کہتے ہیں کہ اپنے دور میں جدید خیالات رکھنے والا آدمی ہی آگے بڑھتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں پوری انسانیت کی تقدیر ہوتی ہے۔ جدیدیت کو مسترد کرنے کا ارادہ ہے بھائی؟ میاں اس طرح تو دنیا کی تمام قوتیں جو آپ کے اردگرد موجود ہوتی ہیں، آپ کو ایک کھلونا بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ میں ایک جدید آدمی ہوں۔ میں نے اپنے بدن اور خیالات کو ہر طرح کی تصنع آمیزی سے آزاد کر دیا ہے۔

اب قصہ یہ ہے کہ جدیدیت یتیم و مسکین انسانیت سے منسلک تنہائی بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ انسانیت جس کو ایک قسم کی بددعا ہے کہ وہ غیر ضروری رسم و رواج کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد کرتی رہے، رشتے داروں، یہاں تک کہ اپنی سرزمین اور ضرورت پڑنے پر اسی قسم کی دوسری سرزمینوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتی رہے۔

مجھے ضرورت ہی نہیں کہ کوئی مجھ سے ملنے آئے۔ مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں! وہ لوگ جنھیں ہمیشہ مدد درکار ہوتی ہے، دراصل وہ لوگ ہوتے ہیں جو تقریباً غلاموں کی طرح محتاج بن جانے کا شیوہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اچھا ہے کہ میں آزاد ہوں— مکمل آزاد۔ اب ان لمحوں کے بعد انھی ضروریات کے تابع ہوں گا جن سے حقیقی طور پر میرا واسطہ یا تعلق ہوگا۔

اپنے دل، جسم اور دماغ کو اسی خوش کن آزادی کی مہک سے معطر کرنے کے بعد میں ٹرام کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ سُرابایا میں ایسی آرام دہ ٹرامیں کہاں پائی جاتی تھیں۔ اسٹیل کی پٹریوں پر سبک رفتاری سے یہ ٹرام دوڑی جا رہی تھی۔ پیتل کی گھنٹی سے گاہے گاہے مدھر آواز گونجتی تھی، جو مسافروں کو اپنی منزل پر اترنے کے لیے بیدار رکھتی تھی۔ تیسرا کمپارٹمنٹ ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ پہلا کمپارٹمنٹ، جہاں میں تھا، وہ نسبتاً خالی تھا۔ میرا زادِ سفر کچھ زیادہ نہ تھا۔ بس ایک جگہ جگہ سے اُدھڑا پرانا سوٹ کیس، ایک تھیلا اور انگوری شراب کے سے گہرے رنگ میں ڈوبا ایک عورت کا پورٹریٹ جو مخملی کور میں رکھا ہوا تھا اور یہ دونوں چیزیں ایک سوتی کپڑے کے غلاف میں بند تھیں۔

بندرگاہ سے ٹرام نکل گئی تھی اور اب وہ اُن دلدلی علاقوں میں بھٹک رہی تھی، جہاں اِدھر اُدھر جنگلات کے کچھ جھنڈ نظر آ جاتے تھے۔ ہوا میں اب سڑے ہوئے درختوں کی ناخوشگوار بو پھیلی ہوئی

Scanned with CamScanner

تھی۔ بیلوں اور شاخوں پر بندر لٹکے ہوئے تھے، جنھیں ٹرام کی گھنٹی کی آواز کی مطلق پروا نہ تھی۔ کچھ بندر تو مستی میں ٹرام کے بالکل قریب لڑھک رہے تھے۔ ان میں سے ایک جی دار تو ایسا بھی تھا کہ جو اپنے ہاتھوں میں پکڑی ایک درخت کی شاخ کی طرف مسافروں کی توجہ مبذول کرا رہا تھا۔ یہ شاید خاص طور پر میرا ابغور سازشی انداز میں جائزہ لینے میں بھی مصروف تھا۔ تو یہ ہیں جدیدیے بھائی، جن کا نام منکے ہے۔ ہاں یہ وہی صاحب ہیں۔ سب سے الگ کونے میں بیٹھے ہیں۔ جی ہاں، ان کی مونچھوں کا آغاز ہے، لیکن تھوڑی بھی تک بالوں سے پاک ہے۔ جی ہاں، یہی نوجوان ہیں، یہی مقامی النسل باشندے، جن کو یورپی انداز کے کپڑے پہننے کا ہوکا ہے۔ ان کے طور طریقوں میں sinyo کا رنگ بھی ملتا ہے۔[1] پھر یہ صاحب زادے "وائٹ کلاس"، یعنی فرسٹ کلاس میں بھی سفر کر رہے ہیں۔

ارے، یہ تو گولڈن اسٹار وِلا (Villa) نظر آ رہی ہے۔ ڈچ ایسٹ انڈیز کے دنوں میں اذیت ناک مشقت کرنے والے غلاموں کی کتنی ہی کہانیاں اس عمارت سے وابستہ ہیں۔ شاید کبھی مجھے ان غلاموں کی کہانی لکھنے کی فرصت مل جائے۔

یہ وِلا (Villa) ہی دلدلوں کے سلسلوں کو کچھ رونق بخشنے والی اکلوتی چیز تھی۔ باقی مناظر تو اتنے سپاٹ اور اکتا دینے والے تھے کہ ان کا ذکر ہی فضول ہے۔ لیکن یہی دلدلیں تھیں جو کمپنی کے ایک تہائی سپاہیوں کو نگل گئی تھیں جو اس علاقے پر پہلی بار قابض ہونے آئے تھے۔ اس طرح یہ خاص دلدل مقامی باشندوں کی مدت تک مددگار و معاون ثابت ہوئی۔ لیکن بعد میں یہ بھی ہوا کہ جب بٹاوی شہر کی تعمیر ہونی شروع ہوئی تو ساٹھ ہزار مقامی باشندے بھی اس سفاک دلدل کی نذر ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تعداد جنگی قیدیوں کی تھی۔ اور یہاں کی تاریخ میں منفرد جگہ پانے والے کیپٹن بانٹے جنھوں نے ٹینگرانگ (Tengerang) سے ریت اور پتھروں کو بٹاوی منتقل کرنے کے عظیم کارنامے پر زبردست شہرت حاصل کی تھی، وہ بھی یہاں کے جان لیوا دلدلی بخار کا شکار ہوئے اور تقریباً ادھ موئے ہو کر ستے چھوٹے۔

"اس جگہ کا کیا نام ہے؟" میں نے یورپین کنڈکٹر سے ملائے زبان میں پوچھا۔

---

[1] sinyo پرتگالی لفظ senhor سے نکلا ہے۔ یہ ولندیزی نوجوانوں اور یورپی لوگوں کے ساتھ یورپ زدہ انڈونیشین نوجوانوں کا بھی ایک اندازِ تخاطب تھا۔

Scanned with CamScanner

اس کی تقریباً بند آنکھیں میرے اچانک سوال کے بوجھ سے فوری طور پر نیم وا انداز میں کھل گئیں۔ ''اینکول نام ہے اس جگہ کا۔''

''کیا وہ بادبانی کشتیاں جو نظر آ رہی ہیں، بٹاوی بھی جاتی ہیں؟'' اب کے میں نے سوال ڈچ زبان میں کیا۔

''جی ہاں صاحب، اگر اُن کا رخ سلی ونگ کی طرف ہوتا ہے تو یہ بٹاوی بھی جاتی ہیں۔'' پھر کنڈکٹر صاحب دوسرے مسافروں کی جانب چلے گئے تاکہ بقیہ رہ جانے والے لوگوں سے کرایہ وصول کر سکیں۔

پھر ٹرام شہر میں داخل ہوگئی۔ سُرابایا کی مانند یہاں کی سڑکیں بھی تنگ سی تھیں — وہیں کی طرح سفید، پیلے رنگوں کے امتزاج کے پتھروں کی بنی ہوئی۔ کمپنی کے دنوں میں تعمیر شدہ پرانی عمارتیں سڑکوں کے دونوں طرف قطار بنائے کھڑی تھیں۔ سڑکیں گیس کی لالٹینوں سے روشن تھیں۔ ایک اور پریوں کے دیس جیسی کہانی یہ تھی کہ بٹاوی کی سڑکوں کو کولتار سے مضبوط اور ہموار کیا جانے لگا تھا۔ مسافروں کی گفتگو تھی یہ۔ بھئی اس چھوٹی سی دنیا میں اور کتنی محیر العقول پریوں کی داستانیں سننی باقی ہیں۔

بٹاوی کا شہر ہے یہ! انڈیز کا دارالخلافہ۔ اس کو گورنر جنرل جان پیٹرز کوئن (Jan Pieterz Coen) نے ساٹھ ہزار مقامی باشندوں کی زندگیوں کی قربانی دے کر تعمیر کرایا تھا۔ وہ کون صاحب تھے، جنھوں نے یہ تعداد نکالی تھی؟ یہی شہر ہے، جس پر سنہ 1629 میں سلطان آگنگ نے حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کیا۔ میرے ڈچ اسکول کے ساتھی طلبا اس تاریخی واقعے کے اسباق کے دوران میرا کتنا طعن و طنز کے ساتھ محاسبہ کرتے تھے کہ گویا میں ہی ہزیمت اٹھانے والا سلطان یا اس کا کوئی اہلکار ہوں۔ چھیڑ چھاڑ اس طرح ہوتی تھی: سلطان آگنگ کے پاس کتنے سپاہی تھے؟ دو لاکھ؟ کمپنی کے کتنے سپاہی شہر کی مدافعت کر رہے تھے؟ پانچ سو! ڈچ لوگوں کے پاس توپیں تھیں؟ بالکل تھیں، لیکن یہ تو سلطان آگنگ کے پاس بھی تھیں۔ پھر یہ کس طرح ہوا کہ آپ کے سلطان کی فوج ہار گئی؟ ہاں، یہ تو حقیقت ہے کہ وہ فوج ہار گئی۔ ڈچ لوگ اس کے بعد وہاں کے معاملات کو مکمل طور پر کنٹرول کر رہے ہیں۔ جی ہاں آج تک — اس کے باوجود کہ کوئن صاحب شہر کے بچاؤ کے وقت خود ہلاک ہو گئے اور

اپنے اصلی وطن کو دوبارہ نہ دیکھ سکے۔

مجھ سے تفریح لینے والے میرے دوستوں کے مطابق سلطان کے سپاہیوں کی تعداد دو لاکھ تھی۔ اس کے پاس توپیں بھی تھیں۔ کون اس بات کی نفی کر سکتا ہے؟ لیکن اپنے دعوے کے ثبوت میں بھی تو وہ کوئی ٹھوس مثال پیش نہیں کر سکتے تھے۔ ارے میں یہ کیا فضول باتیں سوچ رہا ہوں۔ ان سے تو میں مایوسی کا شکار ہو کر ہی مر جاؤں گا۔

بٹاوی سُرابایا کی مانند زیادہ مصروف شہر نہیں تھا۔ یہاں نسبتاً سکون تھا۔ یہ سُرابایا کے مقابلے میں صاف ستھرا شہر بھی تھا۔ یہاں کچرے کے بڑے چوبی ڈرم مناسب جگہوں پر ملتے تھے، جن میں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے تھے — سُرابایا کے لوگوں کے برعکس۔ پھر یہاں ہر جگہ پر چھوٹے چھوٹے پارک بھی دیکھنے کو ملتے تھے، جن کے گہری رنگت کے پھولوں کی وجہ سے رنگ و بو کا حسین ماحول پیدا ہو جاتا تھا۔ سُرابایا میں تو آپ کو ہمیشہ اور ہر جگہ جو ملتا تھا، وہ تھیں بانسوں کی جھونپڑپٹیاں، آگ اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر۔

سنہ 1951 — میں نے بندرگاہ پر جو اخبار خریدا تھا، اس کے مطابق پریانگن[2] کی عورتوں کو سنگاپور، ہانگ کانگ اور بینکاک میں بیچا جا رہا تھا۔ مجھے یہ خبر پڑھ کے ماضی کے جھروکوں میں جانا پڑا اور وہاں سے جاپانی طوائف میکو کے عدالتی بیان کو ازسرِ نو یاد کے گوشوں میں لانا پڑا۔ سُرابایا کی عدالت میں اُس نے تفصیل سے بیان کیا تھا کہ عصمت فروشی کا دھندا کہاں کہاں ہو رہا ہے (اور کن نرخوں پر)۔ میں نے اُن یادوں کو اپنے دماغ سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ ماضی کی طرف ایک بار پھر دوڑنے اور اسے دل و دماغ کا حصہ بنائے رکھنے سے آخر کیا فائدہ؟ ماضی اگر خود میری مدد کرنے پر آمادہ نہیں تو مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ یہ تلخ اور بھاری بوجھ اپنی ذات پر لیے پھروں؟

اخبار میں ایک دلچسپ ادارتی تبصرہ بھی تھا۔ وہ یہ تھا کہ ملائے اور چینی مشترکہ پریس غیر ملکی آقاؤں کی طرف سے ملائے زبان میں سی ایچ (ch) کی غیر محسوس اسپیلنگ کے داخلے کی شدت سے مخالفت کر رہا ہے۔ اس پریس کا استدلال تھا کہ ہم اسکول کی یا اعلیٰ سطح کی زبان استعمال ہی نہیں کر رہے، جس میں اس ch کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پڑھنے والے سرکاری

[2] Priangan جو مغربی جاوا کا ایک بڑا خطہ تھا۔

Scanned with CamScanner

اسکولوں کے تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ پھر ہم اس غیر ملکی اسپیلنگ کو اپنی زبان میں شامل کر کے کیوں اپنے دیوالیہ ہونے کا خطرہ مول لیں۔

اداریے میں نئی پوسٹل ہدایات کے بارے میں بھی شکایت کی گئی تھی جن کے تحت خطوط ارسال کرنے والوں کو لازمی طور پر یہ نئی اور نامانوس اسپیلنگ استعمال کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ اداریے میں کہا گیا کہ اس ڈاک کو جس میں پرانی اسپیلنگ استعمال کی گئی ہے، روکنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نہتے ہاتھوں سے ایک پورے سمندر کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ارے! یہ اتنے جلی الفاظ میں چھپی ہوئی سرخی میری نظروں سے کیسے دور رہی؟ جاپان جزیدہ سابانگ پر اپنی ملکیت دعویٰ کر رہا ہے، جہاں کوئلے کا اسٹیشن واقع ہے۔ کیا یہ دعویٰ سچا ہے؟ اخبار کا اس پر یہ تبصرہ تھا: ''اس مسخرے (ملک) کا رویہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔'' جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی، اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر یہ بھی لگی ہوئی تھی کہ اس سنگین مسئلے پر بات کرنے کے لیے فوری طور پر بحریہ کے اعلیٰ حکام کے درمیان ایک اجلاس بلا لیا گیا ہے۔

ٹرام اپنی گھنٹی کی گونج دار آواز میں آرام سے اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔

بٹاوی — اوہ بٹاوی — اب میں تمھارے درمیان ہوں۔ تم ابھی مجھے نہیں جانتے ہو، بٹاوی! لیکن میں تمھیں جانتا ہوں۔ تم نے سلی ونگ کو ایک آبی گزرگاہ میں تبدیل کر دیا ہے جس پر کشتیاں اور بانسوں کے بیڑے فراٹے بھرتے اور مسافروں اور سامان کو ڈھوتے رہتے ہیں۔ کم وبیش سُرابایا کی طرح۔ تمھاری عمارتیں بلند قامت ہیں اور پُر وقار بھی۔ لیکن پیارے، میرا جذبہ اُن سے بلند تر اور مفتخر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سلی ونگ بہت حسین چھوٹی چھوٹی عمارتوں سے گھرا ہوا تھا۔ لیکن اب یہ عمارتیں، دکانوں اور عارضی ورکشاپوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ان میں سے اکثر کے مالک چینی لوگ تھے۔ اور ان کے درمیان ایک عجوبہ قسم کے انسان کی صورت میں میں موجود تھا۔ موازنے کے طور پر یہی کافی تھا کہ میں نے پاؤں میں جوتے پہنے ہوئے تھے، جب کہ میرے اطراف کے بیشتر لوگ ننگے پاؤں چل پھر رہے تھے۔ میرے سر پر فیلٹ ہیٹ تھا، جب کہ اُن میں سے بیشتر کے سروں پر بانس کے بنے ہوئے دستار (destar) تھے،[3] میرا لباس یورپی انداز کا تھا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ

[3] جو مشرقی جاوا کی ایک قسم کی ٹوپی کا نام تھا۔

Scanned with CamScanner

جانگیے پہنے، برہنہ سینہ، آ جا رہے تھے۔ بہت سے پاجامے میں ملبوس نکلے ہوئے تھے۔

پورا منظر رنگوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرا دل اُس سے بھی زیادہ بھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ دو جہاں کی خوشیاں اس میں اُمڈ آئی ہیں۔ کہاں ہو تم پریان گن کی ناریو؟ تمھارے وقار، حسن اور ملائم، ریشمی جسم کی تو بڑی شہرت ہے۔ میں نے تم میں سے اب تک ایک کو بھی نہیں دیکھا۔ ارے بھئی اپنے گھروں سے اب نکل بھی آؤ! میں تمھارا منتظر ہوں۔ یہ سب دوشیزائیں کہاں چلی گئیں جن کی خوبصورتی کو فرانسس (Fransis)[4] نے ہدیۂ تحسین پیش کیا ہے؟ میں جن مہ وشوں کو تلاش کر رہا تھا، وہ واقعی میری نظروں سے اوجھل تھیں۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں بیشتر لوگ یوریشین تھے، موٹی خشک کھال والے۔ حرکات وسکنات میں طمطراق اور نخوت کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ۔ میرے برابر ایک بوڑھی یوریشین دادی اماں قسم کی خاتون بیٹھی تھیں، جو بار بار اپنا سر کھجا رہی تھیں۔ غالباً وہ کنگھا کر کے جوؤں کو بالوں سے گرانا بھول گئی تھیں۔ میرے مقابل ایک درمیانی عمر کے صاحب تھے، جن کی مونچھیں ان کے بازوؤں کی طرح لمبی تھیں۔ ان کے برابر ایک خالص یوریشین صاحب تھے، جو مکمل طور پر فنافی الاخبار تھے۔ ان کے اخبار کی ایک خبر پر میری نظر بھی جم گئی۔ اس خبر کے مطابق ایک ڈچ شاعر صاحب یہاں جلد تشریف لانے والے تھے اور پاسار بارو نامی مقام پر واقع کامیڈی ہال میں ڈچ شاعری کے علاوہ شیکسپیئر کی نظمیں سنانا بھی ان کے پروگرام میں شامل تھا۔ اخباری رپورٹ کے مطابق موصوف نے حال ہی میں نہایت کامیابی سے یورپ کے دارالخلافوں کے علاوہ جنوبی افریقہ میں بھی یہ نظمیں سنانے کا کامیاب مظاہرہ کیا تھا۔

نہیں! ابھی میرے پاس ان چیزوں کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں۔ فی الحال تو میرے لیے یہی مناسب ہے کہ جم کے بیٹھوں اور بتاوی کے مناظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتا رہوں۔

ڈیلمین گھوڑا گاڑیاں، چوپہیہ بینڈی گاڑیاں، لانڈو[5] اور کتا گاڑیاں — یہ سب چیزیں جو (تارک وطن لوگوں کے) تہذیب وتمدن کا حصہ تھیں، میرے سامنے ہر سڑک پر رواں دواں تھیں۔ ہر

---

[4] جی۔ فرانسس ملائے زبان کے ابتدائی مصنفوں میں سے ایک۔ وہ یورپی ایشیائی نسل کا تھا۔ ملائے ادب میں اس کا ناول Nyai Dasima مشہور ہے۔

[5] Landaus — یہ بھی ایک قسم کی چوپہیہ گاڑیاں ہوتی ہیں، جن کی اگلی چھتری اتاری جاسکتی ہے۔

Scanned with CamScanner

قسم کی پوشاک میں ملبوس لوگ اپنے گھوڑوں پر سوار دیکھے جا سکتے تھے۔ بائیسکلیں بھی موجود تھیں۔ اور پھر کوئی اُن کو حیرت واشتیاق سے بھی نہیں دیکھ رہا تھا! میں بھی ایک بائیسکل خرید لوں گا! اُس کی کتنی قیمت ہوگی؟ میاں — یہ بائیسکل سوار کچھ زیادہ ہی لچکیلے اور پھرتیلے نہیں؟ یہ کتنے آرام اور سکون سے سفر کے دوران ہر چیز کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

ٹرام اب بتاوی کے رہائشی اور بازاری مقامات سے ایک بار پھر جنگل اور دلدلی علاقے میں داخل ہو رہی تھی۔ اب اُس کو گمبیر نامی مقام سے گزرنا تھا۔ یہ بھی جلد آ جائے گا۔ ٹرام کچھ مسافروں کو اُگلے گی اور کچھ کو نگل لے گی۔ لیکن — ہائے — اب تک کوئی بھی تو چہرہ نظر نہیں آیا جو مجھے متاثر کرے۔

''ابھی نہیں،'' میرے پاس بیٹھے ہوئے چینی آدمی نے مجھے بتایا، ''گمبیر ابھی بہت دور ہے۔ تقریباً پندرہ منٹ اور لگیں گے وہاں پہنچنے میں۔''

تھرڈ کلاس میں ہنگامے جیسا شور وغل تھمنے میں نہیں آرہا تھا۔

''آپ کیا توقع کرتے ہیں یہاں؟'' چینی آدمی بچوں جیسے انداز میں مجھے معلومات فراہم کر رہا تھا۔ ''یہ لوگ گھوڑوں پر شرطیں لگا رہے ہیں۔ شاید آپ بتاوی میں پہلی بار آئے ہیں۔ مجھے یہی محسوس ہوتا ہے۔ جنابِ عالی! تمام لوگ، جن میں مرد، عورتیں شامل ہیں، جوئے اور شرطوں کے کاروبار میں بری طرح ملوث ہیں۔ گھڑ دوڑ، مرغوں کی لڑائی، پانسہ بازی، حتیٰ کہ چھپکلیاں لڑانے کے مقابلے، کن کن طریقوں سے جوا نہیں کھیلا جا رہا ہے۔ جب گمبیر کی مارکیٹیں کھلتی ہیں تو لگتا ہے کہ پورے ملک کے جواری یہاں ٹوٹ پڑے ہیں۔''

''گاؤں وغیرہ میں تو کچھ اچھے کھیل تماشے دیکھنے کو ملتے ہوں گے؟''

''کیا خوب سوال کیا محترم آپ نے۔ جناب، یہاں کے لوگ تو کھیل تماشوں کے ایسے دیوانے ہیں کہ کوئی نہ ہوگا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ سولو ڈانس یا میوزک پرفارمنس ہوتی ہے وہاں، تو جواب نفی میں ہے۔ دراصل Cokek، Dogar، Cromong، Gambang، یہ وہاں کی ڈانس، ڈراموں کی قسمیں ہیں۔ ٹولیوں، منڈلیوں میں یہ لوگ اُن کو گاتے ہیں۔ Lenong کا بھی وہاں چلن ہے — Kroncong تو آپ کو ضرور پسند ہوگا۔ واہ واہ، کیا کہنے! عظیم استاد لانگبور تو اس کرون کانگ کے فن کے بادشاہ ہیں۔ اُن کی گھنی مونچھیں بھی زبردست ہیں۔ اور خوبصورت آواز کا تو

Scanned with CamScanner

پوری دنیا میں جواب نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے بدن میں اصلی پرتگالی خون دوڑتا ہے۔ یہ ویسے بھی پرتگالی چرچ کے قریب ہی رہتے ہیں۔'' یہاں پہنچ کر میرے ہم سفر کی منزل آ گئی اور وہ ٹرام سے اتر گئے۔ ساتھ ہی ٹرام میں مرغی کے چوزوں کی سی آواز کا اختتام ہو گیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بے تکی گفتگو کرنے والے لیکچرار سے مجھے نجات مل گئی۔ ویسے میں خود اپنے آپ سے خوشگوار حیرت محسوس کر رہا تھا، کیونکہ ان صاحب سے میں نے خلافِ توقع بڑی روانی سے ملائے زبان میں گفتگو کی تھی جس کے ایک ایک لفظ کو انھوں نے سمجھ بھی لیا تھا۔ اسی طرح، مجھے بھی اُن کا لیکچر مکمل طور پر پلّے پڑ گیا تھا۔

اب یوریشین دادی اماں نے مجھے بغور دیکھا اور ملائے میں ہی مخاطب ہوئیں۔

''محترم کہاں سے تشریف لا رہے ہیں آپ؟''

''سُرابایا سے۔''

''آپ پہلی بار بٹاوی آئے ہیں؟''

''جی، اماں جی۔''

''بہت خوب، یہ دیکھیے۔'' انھوں نے کچھ توقف کے بعد کھڑکی سے ایک جانب اشارہ کیا، ''یہ ہارمنی کلب ہے جہاں سارے بڑے لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ یہ پرانی عمارت ہے۔ چھوٹے صاحب، ہر کوئی اس عمارت میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکتا ہے۔ یہاں قدم رکھنے کے لیے شرط ہے کہ آپ کی ماہوار آمدنی چار سو گلڈر سے زیادہ ہو۔ لیکن میں اور آپ اس سے ڈھائی گنا زیادہ آمدنی رکھتے ہوں، تو بھی ہم اس کلب کے اندر داخل ہونے سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔''

چار سو گلڈر! اور میری کل پونجی محض ایک سو ستر گلڈر اور کچھ سینٹ ہوں گے۔ اور یہ پوری دولت جمع کرنے میں مجھے کئی سال لگے۔ بہر حال چار سو گلڈر ماہانہ سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟ ہر مہینے خوب ٹھاٹھ سے رہنے کے بعد بھی آپ کم از کم تین بائیسکلیں خرید سکتے ہیں!

سیدھے رخ، ٹھوس اور وسیع عمارتیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے خوبصورت گھوڑا گاڑیوں کا ہجوم آتا اور چھٹ جاتا رہا۔ میری چھتری والی بینڈی تو اُن کے آگے محض بے مصرف کاٹھ کے ملڑے جیسی حیثیت کی تھی۔ کتنی کشادہ سڑکیں ہیں یہاں کی۔ فٹ بال کے میدانوں کی طرح۔ پھر یہ ہارمنی برج ہے۔ کیا موم کے سے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ لگتا ہے۔ یہاں پر تو

Scanned with CamScanner

خوبصورت مجسّمے بھی آویزاں ہیں۔ شاید کیوپڈ اور وینس کے؟

''ہم Weltervreden پہنچ گئے ہیں، چھوٹے صاحب۔ بٹاوی کے لوگ اس کو گمبیر کے نام سے پکارتے ہیں۔ آخری اسٹاپ ہے یہ۔ میاں آپ یہاں سے کہاں جائیں گے؟ یہ گمبیر کا بازار یہیں ہے۔ ٹرام اسٹیشن کے سامنے رکے گی۔ اگر آپ کو آگے جانا ہے تو آپ کو ٹرام بدلنی ہوگی ــ یا پھر ڈیلمان پکڑنی ہوگی۔''

میں نے کوننگ اسپیلن کے وسیع میدان کا جائزہ لیا، جو انڈیز کی شان اور آبرو قرار دیا گیا تھا۔ یہ تقریباً دو سوا ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ خوبصورتی سے تراشے ہوئے گھاس کے قطعے لیکن پھول ندارد تھے۔ بٹاوی کے ہزاروں لوگ گمبیر کی مارکیٹوں کے کھلے یا بند ہونے سے بے پروا یہاں جمع ہوتے اور کھیل تماشوں میں حصہ لیتے۔ ان میں پیسے والے بھی ہوتے اور خالی جیب بھی۔ دراصل یہ گھروں کے یکساں اور اکتا دینے والے معمولات سے کچھ وقت کے لیے چھٹکارا حاصل کرنے کی بہترین جگہ تھی۔

''Weltervreden! آخری اسٹاپ!'' کنڈیکٹر نے پہلے ڈچ، پھر ملائے زبان میں صدا بلند کی۔

دیکھیے، یہ گمبیر کا اسٹیشن کتنا بڑا ہے! ایک ہی چھت کے نیچے پورا گاؤں سما جائے۔ یہاں ٹرینیں کیا سامان اتارتی ہیں؟ بلاشک وشبہ وہی چیزیں جوئسر ابایا میں اتاری جاتی ہیں، گاؤں کی خوش حالی اور خوشیاں برآمد کیے جانے کے لیے۔ اور درآمدی اشیا بھی ــ یعنی وہ چیزیں جو آپ کے ذہن سے فراموش کردیتی ہیں کہ آپ کہاں ہیں۔ خوشحالی اور مسرت جنھیں گروی رکھ دیا گیا ہے۔ آپ کو جدید شہروں کی فطرت کے بارے میں ہمیشہ علم ہونا چاہیے۔ یہ شہر خوشیوں اور خوش حالیوں کی تجارتی آمد ورفت کے اوپر کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک گھوڑا گاڑی مجھے اپنی منزلِ مقصود تک لے چلی۔

اگر جدید شہروں کی یہی حقیقت تھی، تب بھی میں اپنے آپ کو بیشتر پکی عمر والے جہاندیدہ لوگوں کے درمیان ایک جدید ترین آدمی محسوس کر رہا تھا۔ کیا آپ کو مسلسل ارتقا کے عمل میں حصہ لینے میں دلچسپی نہیں؟ اگر نہیں تو پھر سمجھیے کہ آپ خاک نشیں ہو کر قدموں تلے روندے جانے والے ہیں۔

میری قمیص کی جیب میں بہت صاف ستھرے انداز میں تہہ کیے گئے دو کاغذ تھے۔ اُن میں

Scanned with CamScanner

ایک میرا گریجویشن ڈپلومہ تھا اور دوسرا بٹیاویا میڈیکل اسکول (Stovia) کا طلبی نامہ۔ کیا کہنے ہیں بھائی! نہ صرف شہر بٹاوی بلکہ اس کے میڈیکل اسکول کے دروازے بھی آپ کے لیے کھل رہے ہیں۔

واہ، واہ، کیا خوب۔ ناقابلِ یقین!

بٹاوی کے قلعے میں شگاف تو ڈال ہی دیا۔

اسکول کے ایک غیر ہنر مند کارندے نے میرا سوٹ کیس، تھیلا اور مخملی غلاف میں رکھا ہوا Annelies کا پورٹریٹ اٹھالیا۔ ان سب چیزوں کو اس نے سلیقے سے اسکول کے دفتر میں رکھ دیا۔ میں نے اس کے بعد اپنے کاغذات پیش کیے۔

''گڈ ڈے! ہم کافی عرصے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں جناب۔ آپ کو دراصل پچھلے سال ہی یہاں آنا تھا۔ درست کہا نا میں نے؟ پھر اس سال بھی آپ کو تاخیر ہوگئی۔ ایک ہفتے کی تاخیر۔ مجھے امید ہے کہ آپ ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ محض اس وجہ سے کہ آپ کے نمبر بہت اعلیٰ ہیں، ہم آپ کی کاہلی کو معاف کیے دیتے ہیں۔'' اسکول کے دفتری اہلکار صاحب مجھ سے گویا ہوے۔

مجھے یہ سن کر سخت برا لگا اور میں ایک قسم کے اضطراب میں مبتلا ہوگیا۔ یہ کوئی طریقہ نہیں تھا کہ مجھ سے اس طرح کا لہجہ اختیار کر کے میرا استقبال کیا جائے۔ ابھی تو میں نے اُن کے ہاں پڑھائی شروع بھی نہیں کی کہ انھوں نے بدتمیزی سے میری سرزنش شروع کر دی ہے۔

''آپ جاوانی ہیں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟''

لیجیے، انھوں نے تو اور زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کر لیا۔ کیونکہ میں کوئی جواب نہیں دے رہا تھا اور میری آنکھوں سے بھی جوابی حملے کی سن گن محسوس کی جانے لگی تھی، اس لیے انٹرویو کرنے والے صاحب نے اب مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ انھوں نے کچھ لمحوں بعد ایک چھپا ہوا کاغذ نکال کر میرے سامنے کر دیا اور مجھے اس کو اچھی طرح پڑھ لینے کی دعوت دی۔

''آپ کی سمجھ میں آیا؟'' وہ بولے ''اسکول کے قوانین طالب علموں کے داخلے کی منظوری اور اسکول کی چار دیواری میں قدم رکھنے کے بعد ہی لاگو ہو جاتے ہیں۔ ان قوانین کی پاسداری لازمی ہے۔''

Scanned with CamScanner

میں نے ایک بار پھر موصوف کو گھور کر دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے فوراً اندازہ کرلیا کہ میرا دل ان قوانین کے خلاف بغاوت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے پینترا بدلتے ہوے کہنا شروع کیا، ''میرا مقصد ہرگز آپ کو پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں۔ البتہ اُن کو پڑھوانا اس لیے ضروری تھا کہ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ ان قوانین کی موجودگی میں آپ یہاں کے طالب علم بننے کا ارادہ رکھتے ہیں یا نہیں۔''

میں اس دوران کوچ پر بیٹھا اپنی گود میں رکھے فیلٹ ہیٹ سے کھیل رہا تھا۔ میرے لیے صرف ایک ہی جگہ تھی جہاں میں جا سکتا تھا۔ مجھے صرف ایک ہی منزل کا علم تھا، اور وہ مقامی ڈاکٹروں کی یہی درس گاہ تھی۔ یہ میرے لیے کتنی اذیت ناک حقیقت تھی۔

وہ صاحب اب اپنی قوتِ برداشت کھونے لگے تھے اور مجھ سے چھٹکارا پانے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہونا چاہتے تھے۔

''دیکھیے وہاں آپ کا کمرہ ہے،'' انھوں نے اشارہ کرکے بتانا شروع کیا، ''ایگریمنٹ پر دستخط کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیجیے کہ قوانین کی بہرحال آپ کو پابندی کرنی ہوگی۔''

قوانین تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ پھر یہاں پر یہ اتنے سخت اور ناگوار کیوں ہیں؟ جاوانی اور ایک طالب علم ہونے کے ناتے مجھے جاوانی لباس پہننا ہوگا۔ سر پہ دستار، بالائی بدن پر روایتی بٹن لگی قمیص، پتلون کی جگہ باتک سارونگ۔ مزید یہ کہ مجھے ننگے پاؤں چلنا ہوگا، کیونکہ جوتے پہننے پر یہاں پابندی ہے!

''آپ کے پاس جاوانی لباس ہے؟'' انھوں نے مجھ سے پھر سوال کیا۔

میرے پاس یہ لباس تو تھا، البتہ دستار کی کمی تھی۔ لیکن اس معمولی چیز کی کمی ظاہر کرنے سے مجھے کتنی شرمندگی ہوگی۔ اس سے تو اچھا یہ ہے کہ پورے جاوانی لباس کے بارے میں ہی کہہ دوں کہ یہ میرے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے یہی کیا۔

''آپ کے پاس رقم بھی ہے؟''

اب تو سوالات اور زیادہ توہین آمیز ہوتے جا رہے تھے۔ شاید یہ صاحب خود ستر گلڈر مہینے سے زیادہ نہیں کماتے ہوں گے۔ ''صاحبزادے، اگر آپ کو کچھ مالی دشواری ہے تو ہم کچھ رقم آپ کو

ضروریات پوری کرنے کے لیے بطور ایڈوانس دے سکتے ہیں۔‘‘

بہت خوب۔ اب میں ایک طالب علم کا طرزِ عمل اختیار کروں گا۔ چنانچہ میں نے اپنی ضروریات کی خریداری کے لیے جانے کی اجازت چاہی۔

’’آپ کا سامان یہاں محفوظ ہے۔ ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر مارکیٹیں ہیں۔ ان کو Senen Markets کہا جاتا ہے۔ آپ کو تمام چیزیں یہاں مل جائیں گی۔

وہاں سے بدمزگی کے جذبات لیے میں مارکیٹ کی طرف چلا۔ دستار بیچنے والوں کی وہاں کمی نہیں تھی۔ میں جس اسٹال پر پہنچا، اس کا مالک ایک عرب باشندہ تھا۔ اس کی گہرائی میں ڈوبی چھوٹی چھوٹی آنکھیں تھیں۔ سر پہ اس کے ایک بڑی موٹی، مٹیالی سی فیض ٹوپی تھی۔ اس نے دستار کی قیمت تو آسمان سے باتیں کرتی بتائی، لیکن بہر حال آدھی قیمت پر اتر آیا۔ گو کہ یہ بھی بہت زیادہ معلوم ہوتی تھی، لیکن مجبوری بھی تھی۔ اس لیے اسی قیمت پر یہ دستار لینی پڑی۔

مجھے یہ تو اپنے ساتھ ایک قسم کا جبر کی محسوس ہوا۔ یہ سب ناانصافی میرے ساتھ صرف اس لیے ہو رہی ہے کہ میں ڈاکٹر بننے کی خواہش رکھتا ہوں۔ یعنی شکر بنانے کی مشین کا ایک پرزہ۔ دراصل یہ تبصرہ میرے ان دوست کا تھا کہ جو میرے ساتھ اس کشتی کے سفر میں شامل تھے، جب میں نے پہلی بار سُرابایا کو چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کا لب لباب یہی نکلتا ہے کہ اپنی اوقات میں رہو، اور چھوٹی چھوٹی الجھنوں، پریشانیوں کو خوشی سے جھیلتا رہوں۔ لیکن کیا میں اس میں کامیاب بھی ہوں گا یا نہیں؟ بہت مشکل سوال ہے یہ۔ بہر حال اس وقت تو مجھے توہین اور ذلت آمیز احکامت کی پابندی کرنی ہی پڑ رہی ہے۔

اسکول میں برہمی اور تلخی کے احساسات لیے واپس پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ سب یوریشین کپڑوں کو، اپنی پتلونوں کو، جوتوں کو، موزوں کو الوداع! میرے فیلٹ ہیٹ، تمھاری جگہ یہ دستار لے لے گی۔ میں نے سالوں سے دستار نہیں پہنی تھی۔ میرے محترم پاؤں جو جوتوں اور موزوں کی شریفانہ آغوش میں رہتے تھے، اب چوزوں کے پنجوں کی طرح برہنہ تھے۔ ٹھنڈا فرش میرے بدن کے خون کی گرمی چوسے لیتا تھا۔

میں نے بطور اسکول طالب علم اُس کیفیت میں اگریمنٹ پر دستخط کیے جیسے کوئی پرندہ بارش

میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ کنٹریکٹ کے مطابق میرا ماہانہ وظیفہ دس گلڈر مقرر ہوا۔ رہائش مفت تھی۔ ان مراعات کے عوض مجھے عین ٹریننگ کی مدت کے برابر خشکی یا سمندر پر کسی جگہ بھی حکومت کے لیے لازمی طور پر کام کرنا تھا۔

ایک مقامی اہلکار مجھے طالب علموں کے مشترک کمرے کی طرف لے گیا۔ وہاں فضا میں الکحل اور تارکول سے نکلنے والے تیل کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ راستے ہی میں امبون اسپتال پڑتا تھا، جو کہ امبون کے رہنے والے سپاہیوں اور اُن کے خاندانوں کے لیے مختص تھا۔

میرے تھیلوں نے ابھی مشکل ہی سے فرش کو چھوا تھا کہ ہمارے چاروں طرف طالب علموں کے غول کے غول جمع ہو گئے۔ میرے بیڈ کے عین مقابل میں نے ایک سوٹ کیس پر چپکا ہوا ایک اخباری تراشہ دیکھا، جس کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔

میں ابھی اپنے ہوش وحواس قابو میں لانے کی جدوجہد ہی میں تھا کہ ایک لمبے تڑنگے نوجوان لڑکے نے میرے جگہ جگہ سے چوٹیں کھائے ہوئے اور زخم خوردہ پرانے کتھئی رنگ کے ٹین کے صندوق پر انڈوڈچ کی زبان میں چیخ چیخ کر تبصرہ کرنا شروع کر دیا۔

''دیکھو دیکھو، اس کو! صرف کسی گاؤں کا غلیظ ترین لڑکا ہی ایسا گندہ بکسار کھ سکتا ہے!''

صرف یہی لڑکا جوتے پہنے ہوئے تھا۔ یہ سندا، جاوا، مدورا یا بالی میں سے کسی بھی علاقے کا نہیں لگتا تھا۔ یہ ملایا کے خطے کا بھی نہیں لگتا تھا۔ اچھا تو یہ شاید یوریشین ہے۔

پھر میں اچانک دم بخود رہ گیا، جب اُس کے بھاری جوتوں نے میرے صندوق پر ضرب لگا دی۔ مجھے اُس وقت محسوس ہوا کہ وہ صندوق ہی نہیں میری عزت وتوقیر پر بھی حملہ آور ہے۔ میرا سوٹ کیس سرعت سے رقص کرتا ہوا فرش پر پھیل گیا۔ آفس کلرک نے بہت کوشش کی کہ وہ سوٹ کیس پر اپنے جوتوں کی اب مزید بارش نہ کرے۔ لیکن اس کو روکا گیا تو دوسرے لڑکوں میں سے ہر ایک ہی کوشش کرنے لگا کہ کم از کم وہ ایک ٹھوکر تو مار ہی لے۔

میاں، کیا تم یہ گھناؤنا سلوک خاموشی سے برداشت کرتے رہو گے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''دوستو!'' میں غصے میں چیخا، ''صندوق کو چھوڑ دو۔ میں مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ ایک ایک

Scanned with CamScanner

کر کے آجاؤ یا سب مل کے۔ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میں نے زندگی میں کبھی کسی سے ہاتھا پائی نہیں کی تھی۔ نہ کبھی مجھے کسی قسم کے بڑے مار پیٹ کے منظر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن میں اب اس کا حصہ بننے کے لیے تیار تھا۔ میں نے اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ میری رانوں نے تہمد نما سارونگ کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ میرے بائیں ہاتھ نے میری قمیص کے بٹن کھول لیے۔ اور میری آنکھوں نے فیصلہ کن انداز میں ان سب کو مقابلے کی دعوت دے ڈالی۔

ان لڑکوں نے میرے چیلنج کا کوئی بھی نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ وہ تمسخرانہ انداز میں قہقہے لگاتے رہے۔ اور یہ میری شان ہی میں لگائے گئے تھے۔

پھر یوریشین کپڑوں میں ملبوس اسی لڑکے نے بہت اطمینان سے میری ناک پر گھونسا لگانے کی کوشش کی۔ یہ ہمت! جواب میں میرا بایاں ہاتھ تو اس کے منہ پر جا پہنچا اور دائیں ہاتھ کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا۔ وہ پیچھے کی طرف ہو گیا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ایک بار پھر میرا دایاں ہاتھ اپنے شکار کی طرف رواں ہوا۔ لیکن نشانے پر پہنچنے سے پہلے ہی فلک شگاف قہقہوں کے درمیان میں فرش پر دھڑام سے آ گرا۔

میں فوری طور پر اٹھ کر اس پر جوابی حملہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ میں ایسا کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی پہاڑ میرے بدن پر آ پڑا تھا۔ دراصل ان سب لڑکوں نے میری ٹانگوں کو دبوچ لیا تھا۔ میرے سارونگ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے اور میرے انڈرویئر کا سفید رنگ نظر آنے لگا تھا۔ تو اس طرح مجھے بالکل ہی آسانی سے قابو میں کر لیا گیا تھا۔

لیکن ابھی بات یہیں ختم نہیں ہوئی تھی۔ چند سیکنڈوں میں ہی انھوں نے میرے کپڑے اتار کر مجھے مادرزاد برہنہ کر دیا۔ اب میرے جسم پر رہ گئی تو صرف ایک لیدر بیلٹ یا پھر دستار۔ میرا کچھ ایسے گھوڑے کا سا حال تھا، جس کی زین اتار لی گئی ہو۔

"آؤ مسٹنڈے صاحب، پیارے ہیرو۔ اب ذرا پھر سے کائیں کر کے دیکھو!" یوریشین لڑکا اس درجے ذلیل کرنے کے بعد بھی مجھے چیلنج کرنے میں مصروف تھا۔

لڑکوں نے اب چیخنے چلانے اور میری حالتِ برہنگی کا مذاق اڑانے کے دوران مجھے آزاد

Scanned with CamScanner

کر دیا۔ چنانچہ میں اپنے بستر کی طرف فوری طور پر اپنے بدن پر کچھ ڈھانپنے کی نیت سے بھاگا۔

''اس کو پہننے کو کوئی بھی کپڑے نہیں دینا۔'' کسی لڑکے نے ملائے زبان میں اُس بیچارے آفس بوائے کو چیخ کر ہدایت کی جو تھوڑا بہت اس دوران میری مدد کرنا چاہتا تھا۔

''اس کو ہر طرف کھیتوں میں دوڑنے والی بھینس بنا دو،'' اسی لڑکے نے مزید دُہرایا۔ ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے۔

''آؤ، آگے بڑھو۔ کچھ ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز نکالنے آؤ۔''

نہیں صاحبو، گدھے کی آواز سنا کر تمھیں محظوظ کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔

سب لڑکے اب میرے گرد پھر جمع ہو گئے تھے اور عین کمرے کے وسط میں انھوں نے مجھے دوبارہ کھینچ لیا تھا۔ بالکل ننگ دھڑنگ حالت میں۔ میری تمام قوت زائل ہو چکی تھی۔ شاید اس لڑنے والے مرغ کی بھی یہی کیفیت ہوئی ہوگی جو لڑائی کے دوران اپنے تمام پروں سے محروم ہو گیا ہو۔ اس برہنگی کی حالت میں میں صرف یہی کر سکتا تھا کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے بدن کے مخصوص حصوں کو ہی چھپالوں۔

''کیا کہنے ہیں یارو۔ جاوانی بچہ نائٹ— کپڑوں سے محروم، صرف ایک بیلٹ اور دستار پہنے میدانِ جنگ میں کھڑا ہے۔''

''ایک لڑاکا مرغ، جو بانگ دینے کے بھی قابل نہیں!''

''اس کو کل تک اسی طرح کھڑا رکھو، تا کہ اسی حالت میں ڈائریکٹر صاحب بھی اس کا معائنہ کر لیں۔ کیا یہ سب کو منظور ہے؟''

''منظور ہے، منظور ہے۔'' سب نے شور مچایا۔

وہ واحد یوریشین لباس والا لڑکا پھر میرے قریب آیا اور میرے ہاتھ مخصوص اعضا پر سے ہٹانے لگا۔ اب برداشت کی حد ہو گئی تھی۔ پھر مجھے اندازہ ہو گیا کہ جلد ہی مجھ پر تابڑ توڑ حملہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ میں نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ایک لمبی چھلانگ لگائی اور میرے بلند ہوتے ہوئے پیروں نے اس کے منھ کا نشانہ لیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے پاؤں کی ایڑی اس کے منھ اور حلق پر ٹھیک ٹھاک جا لگی ہے، کیونکہ وہ اچانک لڑکھڑا کر بیٹھ گیا اور تھوکنے کے دوران اس کے دو دانتوں کے

Scanned with CamScanner

ٹپکنے کے علاوہ بہت سا خون بھی فرش پر بہنے لگا۔
چیخ پکار اب مزید بڑھتی جارہی تھی۔
''لیجیے جنگل کا آدمی اپنی اوقات پر آ گیا ہے۔''
میں نے اب اپنی عزت، بے عزتی کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ شرم و حیا مجھ سے اب رخصت ہو چکی تھی۔ میرے ہاتھ ہی نہیں، بدن کا ہر حصہ آزاد تھا اور میرا بھرپور جوابی حملہ اب عروج پر تھا۔
''صاحبو! اب ختم کریں یہ سلسلہ۔ بہت ہو چکا۔ اگر یہ سب دنگا فساد ختم نہیں ہوا تو مجھے ڈائریکٹر صاحب کو بلانا پڑے گا۔'' آفس بوائے اب چیخ رہا تھا۔
''رپورٹ کرنا چاہتے ہو؟ جاؤ رپورٹ کردو کہ ہمارے ان نئے ہیرو صاحب کو خطرناک دورہ پڑ گیا ہے، اور وہ اپنے آپے میں نہیں۔''
''ہاں، ان صاحب کی رپورٹ کردو۔''
مختلف آوازوں کے دوران تمام لڑکوں نے مجھے گھیرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔
''شوق سے کچھ کر کے دیکھ لو۔ جواب آپ کو ٹھیک ٹھاک دوں گا۔'' میں نے انھیں للکارا۔
خلافِ توقع ان میں سے کسی نے بھی میرے اوپر چھلانگ نہیں لگائی۔ کوئی بھی مجھے مارنے ایک انچ آگے نہیں بڑھا۔ بلکہ اب وہ بری طرح ہنس رہے تھے۔ مجھے ان کی اس حرکت سے گمان ہوا کہ یہ سب کچھ ان کا مجھ سے تفریح لینے کا انداز تھا۔ لیکن مجھ میں ایک بپھرا ہوا اور اب کچھ تجربہ کار مرغا سما گیا تھا، جو پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ بلکہ اس کی بانگ میں اور سختی آ گئی تھی۔
''کیا یہی شیوہ ہے پڑھے لکھے لوگوں کا؟'' وہ لوگ خاموش ہو گئے تھے۔ ''کیا آپ کے بزرگوں نے یہی آپ کو سکھایا ہے؟''
''یہ بات نہ کریں۔ ہمارے بزرگوں کو بیچ میں نہ لائیں۔''
اس دوران میرا ایک سارونگ کسی نے میری طرف اچھال دیا۔ میں نے آہستگی سے اسے کمر سے لپیٹ لیا۔ لیکن میری نظر ہر طرف تھی کہ کوئی دوبارہ چھیڑ خانی شروع نہ کر دے۔
''گاؤں والوں کے سامنے آپ سب لوگ دانشوروں کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن

Scanned with CamScanner

حقیقت یہ ہے کہ گاؤں والے آپ سے کہیں زیادہ مہذب ہوتے ہیں!'' میرے اندر کے جلے بھنے مرغ کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

ان لوگوں سے، اور خاص کر دانتوں سے محروم لڑکے کی طرف سے انتہائی ہوشیار اور چوکنا رہتا ہوا میں اپنے بیڈ پر جا پہنچا۔ کسی نے میرا راستہ نہیں روکا۔ لگتا تھا کہ تمام ہنگامہ یکسر ختم ہو چکا تھا۔

''شیطان بھی اتنا خبیث نہیں ہوگا، جتنا کہ آپ میں سے ہر ایک لڑکا،'' میری برہمی کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ ان کی خاموشی نے بلکہ اس کو مزید دو آتشہ کر دیا تھا۔ ''آپ لوگ دفع ہو جائیں میری نظروں کے سامنے سے۔ سب لوگ۔'' میری آواز میں غراہٹ کا تیز رنگ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

میرا احاطہ کیے ہوئے لڑکوں میں سے کسی کو بھی لب کشائی کی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ لوگ تو خاموشی سے کھڑے مجھ کو تک رہے تھے اور اب میرے جذبات کی شعلہ فشانی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس وقت وہ میرے پاس سے جانے کو بھی کسی قیمت پر تیار نہ تھے۔

میں نے کپڑے پھر سے پہن لیے۔ اب میں نے اس قسم کا ڈھونگ رچانا شروع کیا کہ گویا میں کوئی بہت بڑا رئیس قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے اپنی تمام چیزیں بیڈ کے نیچے رکھ دیں۔ گہرے سرخ رنگ کے مخملی کور میں بند اور اوپر سے سوتی غلاف میں لپٹی ہوئی تصویر کو بھی میں نے اپنے تکیے کے اوپر سجا دیا۔

آفس کلرک اب غائب ہو چکا تھا۔ یہ اس قسم کے معمولات دیکھنے کا غالباً عادی ہو چکا تھا۔ اس لیے غالب خیال یہی تھا کہ ڈائریکٹر وغیرہ کو تو کوئی رپورٹ نہیں کرے گا۔ البتہ گاؤں کے لوگوں کے علاوہ اپنی بیوی کو اس دلچسپ واقعے کی رپوری تفصیل مزے لے لے کر سنائے گا۔

میں اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ باری باری میں نے ان لوگوں کو اب بھی چیلنج کے سے انداز میں گھورا۔ لیکن یہ سب لوگ اب مسکرا رہے تھے۔ ایک ایک کر کے انھوں نے مجھے اپنے نام بتائے۔ اس سے بالکل ظاہر ہو گیا تھا کہ ایک نئے طالب علم کی اسکول میں آمد پر روایت کے مطابق اس کے ساتھ یہ مذاق کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ یہ مذاق اپنی حدود سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کی انھوں نے دست بستہ معافی بھی مانگی۔

Scanned with CamScanner

اس قسم کی پرتشدد حرکات اب دوبارہ مت دُہرانا— میں نے اپنے دل میں اُن کو تنبیہہ دینی شروع کی— اور اس غلیظ، ناکارہ نظر آنے والے، جگہ جگہ سے مُکھنے ہوئے پرانے ٹین کے صندوق کی بے عزتی کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ اے ڈاکٹر بننے کے امیدوارو! اس میں رکھی ہوئی چیزوں کی قیمت تم سب کو ملا کر بھی زیادہ ہے۔ جس طرح مجھے تم لوگوں سے واقفیت کی ضرورت ہے، اسی طرح تمھارا میرے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ اس سوٹ کیس میں میرے بہترین خیالات اور تصورات بھرے پڑے ہیں۔ نوٹس، خطوط، میرے دوستوں کے خطوط، محبت کے خطوط، اخباری تراشے، میری بیوی انلیز (Annelies) کی دائمی جدائی کے غم میں لکھے ہوئے دو مسودات۔ نیائے اونٹو ساروہ (Nyai Ontosoroh) اور میرے ساتھ جو ڈچ حکام کے ساتھ تجربات ہوئے تھے، ان کی روداد، جو چار پونڈ کاغذوں کے وزن سے زیادہ ہی ہوگی۔ کیا تمھارے پاس کبھی اتنا وزنی خزانہ رہا ہے؟ پھر دوسرے لوگوں کے نہایت اہم خطوط— کبھی اس قسم کے نوادر تمھارے نصیب میں ہوں گے؟ اور سب سے بڑھ کر میری ماں کے خطوط ہیں۔ یقیناً میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم میں سے کسی کی ماں خوبیوں اور نیکیوں میں میری ماں کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ اور میں یہ بھی یقین نہیں کر سکتا کہ تم میں سے کوئی اس طرح تجربات کی بھٹیوں سے گزرا ہوگا، جس طرح کہ میں، اور جس کا منھ بولتا ثبوت اس سوٹ کیس میں میرے تحریر کردہ خلاصوں کی شکل میں موجود ہے۔ میں تم سب حکومت کی طرف سے پیش کی جانے والی خطیر تنخواہوں کی طرف ٹوٹ پڑنے کے خواہش مندوں سے ہی مخاطب ہوں۔ ڈچ حکومت کی اشرافیہ میں مال توڑنے والے منتظم بننے کے امیدواروں سے۔ کسی کو بھی اب مجھے تنگ کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے میرا بھی فرض بن گیا کہ ان لوگوں سے خوشگوار تعلقات کا آغاز کروں۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کے دو دانت ضائع ہو گئے،'' میں نے یوریشین لڑکے سے معذرت کی۔

اس لڑکے کے ساتھ جواب میں سب نے ہی بات اڑا دی اور بدستور ہنستے رہے۔ اب میں نے ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کپڑے الماری میں منتقل کرنے شروع کر دیے۔ انھوں نے میرے ہر کپڑے پر خصوصی توجہ دینی شروع کر دی، اس طرح منہمک ہو کر کہ گویا میں کسی جادو کے تماشے کی تیاری کر رہا ہوں۔

''یہ جو جاوانی کپڑے پہنے ہوئے ہیں، غالباً اُن کے پاس اس قسم کا ایک ہی جوڑا ہے،'' کسی لڑکے نے دوسروں کی توجہ دلائی۔

''شاید یہ قانونی طور پر ڈچ ہیں،''[6] ایک اور نے اپنی رائے ظاہر کی۔

''ان کے پاس اس ایک جوڑے کے سوا تمام کپڑے یورپین ہیں،'' دوسرے لڑکے نے تبصرہ کیا۔ میں نے ایسا تاثر دیا کہ گویا میں کچھ سن ہی نہیں رہا۔ اب میرے کاغذات اور کتابیں نکلنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے وارڈروب کے اوپر خالی صندوق اور بیگ رکھ دیا۔

''آہاہا!'' کوئی اونچی آواز میں چلایا۔

میں نے کرسی گھما کر دیکھا۔ میری تصویر اب ان لوگوں کی کھلی نظروں کے سامنے موجود تھی۔ اور اب یہ پہلے لڑکے کے ہاتھوں سے دور کھڑے آخری لڑکے کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔

''آخر صدی کا پھول،'' کسی نے تصویر کے نیچے لکھا ہوا عنوان پڑھ کر دُہرایا۔

ان لوگوں کی طرف سے تصویر کو میری اجازت کے بغیر اس طرح ہاتھوں میں لینے اور اُس کا عنوان پڑھنے کی وجہ سے میرا خون کھول اٹھا تھا۔ میں نے غصے کی حالت میں وارڈروب میں رکھے خنجر کو پکڑ کر اس کو نیام سے آزاد کر دیا۔ ''اس تصویر کو فوراً اپنی جگہ پر رکھ دیا جائے!''

لیکن شاید دور کونے میں جمع ہونے اور تصویر کے بارے میں تبصرہ کرنے والے لڑکوں نے جان بوجھ کر میرے الفاظ کو سنا ہی نہیں۔

''تصویر کو ہوا میں اچھالنا بہتر نہیں ہوگا؟'' ایک لڑکے کی آواز آئی۔

''سنو سب لوگ، فوراً اس تصویر کو اپنی جگہ رکھ دو،'' میری طرف سے دہاڑتی ہوئی آواز میں حکم جاری ہوا۔

شور وغل اب ختم گیا تھا۔ اب سب مجھے اور میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کو دیکھ رہے تھے۔

''میں تین تک گنوں گا، اگر تصویر اپنی جگہ واپس نہیں رکھی گئی تو میں یہ خنجر ہوا میں لہرا دوں گا۔

---

[6] Londo Godong — کتابی معنوں میں اس کا مطلب ہے ''ڈچ خادم۔'' جاوا کے اس مقامی باشندے کو یہ نام دیا جاتا تھا جس کو ڈچ مین جیسی قانونی حیثیت مل جاتی تھی۔

Scanned with CamScanner

اب میری یہ ذمہ داری نہیں ہوگی کہ آپ میں سے یہ کس کو لگتا ہے۔''

میری یہ خطرناک دھمکی سن کر ایک بونے قد کا، انتہائی دبلا پتلا لڑکا آگے بڑھا اور اس نے سلیقے سے تصویر دوبارہ کور میں ڈال دی۔ پھر کچھ ندامت کے بل اپنی پیشانی پر لاتے ہوئے وہ گویا ہوا: ''ماس (Mas)[7] یہ لوگ کچھ زیادہ ہی اخلاقی حدود پار کر لیتے ہیں۔ مجھ میں تو اب ان کی بدتمیزی برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔''

مجھے اُسی لمحے اندازہ ہوگیا کہ ہم دونوں رفیق بن سکتے ہیں۔ میں نے خنجر کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر کے ایک جگہ رکھ دیا اور اس کی حرکات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اس نے کور کی سلوٹوں کو درست کیا اور جمی ہوئی کچھ گرد کو صاف کیا۔ ''میں اپنا تعارف کراتا ہوں ماس۔ میرا نام پرتو تینو جو ہے۔ لیکن لوگ مجھے پرتو کلیو و (Partokleooo) پکارتے ہیں۔'' لڑکا مجھ سے جاوانی زبان کے لہجے میں تر انتہائی خراب ڈچ زبان میں مخاطب تھا۔

''یہ لوگ تم کو بھی چھیڑتے رہتے ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جی — میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے سب کچھ۔''

''تمھارا بیڈ کہاں ہے؟''

''اس طرف کونے میں۔''

''کیا یہاں طالب علموں کے سونے کے سلسلے میں بھی قوانین ہیں؟''

''نہیں۔''

''بہت خوب۔ تم میرے ساتھ والے بیڈ پر آ جاؤ آج سے۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''لیکن اس بیڈ پر تو دوسرا لڑکا پہلے ہی سے ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ اس کو یہ بیڈ چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑے گا۔ اس کو بتا دو۔''

پارتو تینو جو عرف پارتو کلیو و جلد ہی مطلوبہ لڑکے کو لے آیا۔ اس کی آنکھیں استعجاب اور شک و شبے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ''آپ نے میرا بیڈ پارتو کلیو و کے بیڈ سے تبدیل کرنے کا حکم دیا ہے؟''

''بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔''

[7] جاوا کی زبان میں ''بڑے بھائی'' کہہ کر کسی کو عزت سے پکارنے کا طریقہ۔

Scanned with CamScanner

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کا یہاں خلیفہ بننے کا ارادہ ہے؟''

''اگر آپ اور آپ کے دوسرے ساتھی یہی چاہتے ہیں تو ایسا ہی سمجھیے۔ میرا خلیفہ بننے کا واقعی ارادہ ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ اگر نہیں تو آپ کا سامان آپ کے نئے بیڈ پر پہنچانے میں مدد کرسکتا ہوں۔ آپ پارتو کلیو کو بھی تنگ کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ بند ہو جانا چاہیے۔ اسی وقت سے۔''

تمام لڑکے اس دوران ایک بار پھر میرے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اس لڑکے نے ان سے شکایت کرنی شروع کی۔ سب لوگ اب میرے احکامات کے بارے میں آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔ یورپین لباس والا انڈو لڑکا ان لوگوں میں شامل نہیں تھا۔ شاید وہ کہیں اپنے مسوڑھوں کو پکڑے بیٹھا ہوگا۔

''دیکھو میں محض اپنی دادا گیری قائم کرنے کے لیے تم کو دوسری جگہ نہیں بھیجنا چاہتا ہوں۔ لیکن اگر مجبور کرو گے تو میں یہ سب بھی کروں گا۔ ویسے میرا مزاج یہ ہے کہ بس اُن لوگوں سے میری نہیں بنتی ہے، جو دوسروں کے حقوق کا خیال کرنے کی بجائے اُن سے کھیلتے ہیں۔''

لڑکوں نے آپس میں کھسر پھسر کرنی شروع کردی۔ پھر ان سب نے اپنے فیصلے کے مطابق اس لڑکے اور پارتو کلیو کا سامان کا تبادلہ شروع کردیا۔ لنچ کی گھنٹی بج گئی تھی۔ سب لوگ کھانا کھانے دوڑ گئے۔ اور پارتو کلیو اور میں ہی کمرے میں رہ گئے۔

''آپ نے صحیح کہا تھا بڑے بھائی! گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کے مقابلے میں یہ طرم خان قسم کے دانشور ہیں۔ جنگلی، گنوار!'' اس نے ان کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔

اس کی ڈچ زبان واقعی بہت خراب تھی۔ اس میں بھرپور جاوانی زبان کا لہجہ شامل تھا۔ مجموعی طور پر یہ لہجہ نہ صرف بے تکا تھا، بلکہ اس میں غیر ضروری بناوٹ بھی شامل تھی۔

''تم نے گریجویشن نہیں کیا ہے؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''بھائی صاحب میں ٹیچروں کے اسکول سے یہاں آیا ہوں۔ آیئے کھانا کھالیں۔''

لیکن یہ دیکھ کر کہ میں ابھی تیار نہیں ہوں، اس نے موضوع بدلتے ہوئے سوال کیا۔

''بھائی صاحب، آپ نے یہ تصویر کہاں سے حاصل کی؟''

''میں نے کسی سے اس کو پینٹ کرایا ہے۔''

Scanned with CamScanner

''یہ خوبصورت تصویر ہے۔ کبھی آپ اس خاتون سے ملے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''آپ ان سے واقف تھے؟''

''ہاں، میں ان سے اچھی طرح واقف تھا۔''

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں اس تصویر سے اتنا متاثر ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کہیں خلا میں کہیں کھوگئی تھیں۔ اوراس کے ہونٹ غیر مرئی طور پر کپکپا رہے تھے۔

پھر اس کے ہونٹوں سے الفاظ آہستہ آہستہ اور ٹوٹے ہوئے انداز میں نکلنے شروع ہوئے۔

''اخبار میں جو خبریں ان کے بارے میں آتی تھیں، میں بغور ان کو پڑھتا تھا۔ ساری اخباری رپورٹیں تو میری نظروں سے نہیں گزریں، لیکن جو کچھ گزریں وہی کافی تھیں۔ ان کی ایک انتہائی دردناک کہانی تھی۔''

''درست کہا تم نے۔''

''آپ نے اپنا نام مجھے اب تک نہیں بتایا ہے، بھائی صاحب۔''

''میرا نام منکے ہے۔ اب کھانا کھالیں ہم؟''

وہ میری طرف سوالیہ نشان سے دیکھتا ہوا میرے پیچھے چل رہا تھا۔

''کسی اور کو اس تصویر کے بارے میں نہ بتانا،'' میں نے اس کو دوستانہ انداز میں ہدایت کی۔

''بہتر ہے لیکن اب وہ کہاں ہیں؟''

''وہ مرچکی ہیں، پارتو۔''

''اللہ اُن کی روح کو بہتر مقام دے،'' اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

ڈائننگ ہال تمام گریڈوں کے طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان کی اکثریت مقامی لباس پہنے ہوئی تھی۔ اور صرف ہیناڈونیز اور انڈوز قومیت کے لڑکے ہی یورپین لباس میں تھے۔ جاوانی اور سنڈانیز کا لباس تقریباً ایک جیسا تھا۔ البتہ اُن کی دستاروں میں فرق تھا۔ ان طالب علموں میں صرف ایک ملائے قومیت کا تھا۔ وہ مسلمانوں کی کالی فیض ٹوپی (Songkok) پہنے تھا۔ اوراس کے

Scanned with CamScanner

بدن پر ایک مختصر سارونگ بندھا ہوا تھا۔ بہر حال دستاروں کی اکثریت تھی۔

ایسا لگتا تھا کہ ڈار میسٹری کے واقعے کی اطلاع فوراً ہی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا، سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ لوگ ہر طرف غالباً میرے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ میں نے کسی پر بھی توجہ نہیں دی اور پارتو کلیو و کے ساتھ بیٹھ گیا۔ لیکن میرے بیٹھتے ہی پیغام رساں ایک چھوٹا لڑکا میرے قریب آیا اور کہنے لگا، "مسٹر منکے آپ ہی ہیں؟"

پارتو کلیو و نے اس کو جھڑک کر دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لڑکے نے بہت شائستگی سے کہنا شروع کیا، "کوئی صاحب دریافت کر رہے ہیں کہ سُرابایا سے جس طالب علم کو بذریعہ جہاز سفر کر کے آج یہاں پہنچنا تھا، کیا وہ صاحب آ گئے ہیں یا نہیں۔" میں نے دیکھا کہ ایک گڑ امڑا کاغذ کا ٹکڑا اس لڑکے کے ہاتھ میں تھا، جس پر پنسل میں کوئی تحریر نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ میں اس پرچے کو چپکے سے اس کے ہاتھ سے اس تیزی سے اُچک لیا کہ پارتو کو بھی کچھ نظر نہیں آیا۔

"ہاں میاں، منکے میرا ہی نام ہے۔ کس نے مجھے یاد کیا ہے؟"

پیغام رساں لڑکے اور پارتو کلیو و کی طائرانہ نظریں مجھ پر ہی تھیں۔ پھر لڑکے نے بتانا شروع کیا۔

"ایک ڈچ صاحب — خون کے حساب سے خالص ڈچ صاحب — نے آپ کو یاد کیا ہے۔ وہ اس وقت ڈائریکٹر صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔"

"بہت خوب — اُن سے کہہ دو کہ کھانا ختم کرتے ہی اُن کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

پارتو کلیو و مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تصویر والی عورت کے بارے میں مزید مجھ سے جاننا چاہتا تھا۔ لیکن اب میں نے اس پر کوئی بھی توجہ نہیں دی۔

میں نے کچھ زیادہ نہیں کھایا۔ دراصل لڑائی جھگڑے کے بعد میری بھوک اڑ چکی تھی۔ میں ڈائننگ روم سے رخصت ہو کر سیدھا سٹنگ روم جا پہنچا۔ یہ ملاقاتی کوئی اور نہیں بلکہ میرے صحافی دوست مسٹر تیر ہار (Ter Haar) تھے۔ De Locomotief نامی اخبار سے میری وابستگی کے وقت کے ساتھی، جن سے ایک سال پہلے سیمارانگ کی طرف کشتی کے سفر میں بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔

''جناب— آپ سے ایک بار پھر ملاقات پر خوشی ہو رہی ہے،'' انھوں نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سیمرانگ سے اسی وقت بذریعہ ٹرین پہنچے ہیں۔ اور یہ کہ انھیں میرا خط ذرا دیر میں ملا اور جب وہ مجھ سے ملنے بندرگاہ پہنچے تو غالباً میں ٹرام پکڑ کر Weltevreden روانہ ہو چکا تھا۔ وہ اسی طرح دوستانہ گفتگو میں مصروف تھے کہ اس دوران ڈائریکٹر صاحب بھی آ گئے اور ہماری گفتگو میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے مجھ سے اپنا تعارف کچھ اس طرح سادگی اور انکسار سے کرایا کہ گویا وہ سرے سے ڈائریکٹر ہی نہ ہوں۔ انھوں نے دورانِ گفتگو سوال کیا۔

''آپ کتنے قلمی ناموں سے لکھتے ہیں؟''

میں ہنس پڑا۔

''مجھے فخر ہے کہ کوئی میرا طالب علم بہترین لکھاری بھی ہے۔ لیکن میاں یہاں تو تمھارا کام صرف علم حاصل کرنا ہے۔ اب مزید لکھنے لکھانے کا ارادہ ہے؟ پڑھائی میں تو کہیں خلل نہیں پڑے گا اس سے؟''

''جناب میرے دوست خارجی دنیا اور باطنی دنیا یعنی روح سے متعلق نت نئے اسرار اور تجربات کو خوبصورتی سے قلم بند کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آپ کے بہت بلند مرتبت طالب علم ثابت ہوں گے۔'' میرے صحافی دوست نے میری مدافعت کی۔

''بالکل درست ہے آپ کی بات۔ لیکن میڈیکل کی درس گاہ کچھ مختلف ہوتی ہے۔ مسٹر... کس نام سے پکارنا چاہیے مجھے آپ کو، میرے نئے طالب علم صاحب؟''

''منکے کہہ لیا کریں مجھے، محترم۔''

''تو مسٹر منکے، طالب علم چاہے کتنا بھی ہوشیار ہو، کتنے ہی وسیع اُس کے تجربات ہوں، اُس کو بہرحال اپنے درسی اسباق کی طرف سنجیدگی سے دھیان دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر چیز کو تفصیل سے پڑھنا ہوتا ہے۔ آپ کو عام جزئیات کا اسی طرح پیچھا کرنا ہوتا ہے جس طرح کہ گھڑی کی بڑی سوئی منٹوں کا پیچھا کرتی ہے۔ ایک سیکنڈ ضائع ہونے کا مطلب ہے کہ آپ نے زندگی کو رائیگاں کر دیا۔ مسٹر منکے، آپ نے ویسے بھی یہاں آنے میں بہت تاخیر کر دی ہے۔ آپ کو اب پچھلے سبق

Scanned with CamScanner

پورے کرنے میں بہت محنت درکار ہوگی۔''

''مسٹر ڈائریکٹر،'' ملاقاتی دوست نے کہنا شروع کیا: ''اگر انھوں نے کچھ دن اور پڑھائی نہ کی تو کوئی زیادہ حرج تو نہیں ہوگا؟ محترم، میں آپ کی اجازت سے ان کو آج ایک دن کے لیے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ دراصل ایک بڑا اہم موقع ہے، جس کو نظر انداز کر کے مسٹر منکے کو عرصے تک تاسف ہی رہے گا۔ مسٹر ڈائریکٹر، اجازت ہے اس موقعے کا فائدہ اٹھانے کی انھیں؟''

''آپ کس موقعے کی بات کر رہے ہیں؟''

''جی ایک اہم موقع ہے۔ اسی کا فائدہ اٹھانے کی خاطر میں یسمرانگ سے یہاں آیا ہوں، مسٹر ڈائریکٹر، نیدرلینڈر کے آنریبل ممبر آف دی ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو یعنی مسٹر انجینئر ایچ وان کولیو جن سے ملاقات۔''

''یعنی میرا ایک طالب علم کسی ممبر آف پارلیمنٹ سے ملاقات کرے گا؟''

''جی ہاں! آج رات The God of the Liberals جیسی ریڈیکل تنظیم نے ان کے اعزاز میں خصوصی دعوت نامہ رکھنے والوں کے لیے ایک میٹنگ بلائی ہے۔ ہارمنی کلب میں۔ اور منکے اس یادگار تقریب کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں،'' میرے صحافی یار کے لہجے میں قطعیت کا عنصر شامل تھا۔

''دیکھیے، دیکھیے، میں نے ابھی کہا تھا نا— ابھی تعلیم شروع بھی نہیں ہوئی ہے کہ آپ کی پرائیویٹ سرگرمیوں نے اسے متاثر کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں آپ کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟'' ڈائریکٹر صاحب مجھ سے مخاطب تھے۔

''آنریبل ممبر کا دورہ ایک نادر واقعہ ہوتا ہے جناب۔ پانچ سال بعد بھی اب یہاں اُن کا آنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے، مسٹر ڈائریکٹر۔ مسٹر منکے کی پڑھائی کے تو ابھی اَن گنت دن پڑے ہیں۔'' میرے دوست میری وکالت کرتے رہے۔

''بہت اچھا— لیکن لمبے سفر کی تھکن بھی اتار لی ہے، مسٹر منکے؟''

''کس بات کی تھکن؟ پروگرام کے بعد آٹھ گھنٹے نیند مل جائے گی۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟'' میرے دوست، ڈائریکٹر صاحب کی بجائے مجھ سے مخاطب تھے۔

❋❋

Scanned with CamScanner

''شہرزاد'' کی کتابیں اب ''سٹی پریس'' میں دستیاب ہیں

اشرف صبوحی دہلوی کی نمائندہ تحریروں کا انتخاب

بزمِ صبوحی

مرتبہ: ڈاکٹر اسلم فرخی، آصف فرخی

قیمت: 250 روپے

معروف ہندوستانی افسانہ نگار خالد جاوید کی کہانیوں کا تازہ مجموعہ

تفریح کی ایک دوپہر

قیمت: 250 روپے

سچی کہانیوں پر مبنی ڈاکٹر شیر شاہ سید کا تازہ افسانوی مجموعہ

کون دلاں دِیاں جانے (اردو)

قیمت: 100 روپے

نوجوان شاعر احمد آزاد کا پہلا شعری مجموعہ

تیز بارش کے دوران

قیمت: 395 روپے

اردو کے صاحبِ اسلوب افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کی
مختلف رسائل میں بکھری ہوئی کہانیوں کا مجموعہ

دفینہ

قیمت: 320 روپے

۱۸۵۷ء کے پس منظر میں لکھا گیا ناول

کبوتروں کی پرواز

رسکن بانڈ، ترجمہ: حمرا خلیق

قیمت: 395 روپے

معروف ہندوستانی افسانہ نگار نیر مسعود کا نیا مجموعہ

گنجفہ

قیمت: 450 روپے

افغانستان میں ایک بنگالی خاتون کی روداد

طالبان کے دیس میں

(زیرِ طبع)

حسن منظر کا نیا ناول

دھنی بخش کے بیٹے

(زیرِ طبع)

شاہد احمد دہلوی کی تحریروں کا انتخاب

بزمِ شاہد

(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

ہندی کے منفرد جدید شاعر اسد زیدی 1954 میں راجستھان کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ اب تک ان کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں: بہنیں اور دوسری نظمیں (1980)، کویتا کا جیون (1988)، اور سامان کی تلاش (2008)۔ پہلے مجموعے کی نظموں کا ایک انتخاب بارہ ہندوستانی شاعر نامی انتھولوجی میں شامل تھا جو "آج کی کتابیں" کے زیر اہتمام 1985 میں شائع ہوئی۔ آئندہ صفحات میں جو نظمیں پیش کی جا رہی ہیں وہ اسد زیدی کے باقی دو مجموعوں سے منتخب کی گئی ہیں۔

Scanned with CamScanner

اسد زیدی

ہندی سے ترجمہ: سعید الدین، اجمل کمال

کویتا کا جیون

مجھے ایک گھر میں بلایا گیا اور مجھے یاد آیا ایک دوسرا گھر
عورت دوسری تھی، مرد کوئی اور تھا، بچے نہیں تھے
اس سب سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا
آپ بہت اچھے لوگ ہیں، میں نے کہا کھانا کھا کر
شراب پی کر
سر اٹھا کر دیکھا، پتا نہیں کب سے گھوم رہا تھا پنکھا
گھڑی کی الٹی سمت

انھیں اب لٹا دینا چاہیے، انھیں بہت نشہ آ گیا
لگتا ہے، بتی بجھا دینی چاہیے
مجھے عورت کی آواز سنائی دی، مرد نے اس میں مدد کی
اور سرہانے ایک تکیہ لگا دینا چاہیے
تکیہ

[1] 'کویتا' کا لفظ 'شاعری' اور 'نظم' دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

شکریہ، میں نے کہا، میں گویا ایک مزار ہوں
اور آپ لوگ پیر
ہاہاہا کرتے دونوں ہنستے مجھے دیکھتے رہے
اور کہتے رہے شبھ راتری [2] بے شمار بار
اندھیرا ہو گیا، مجھے تھوڑی سی شرم آئی
اور میں سو گیا ایک عجیب سی کشمکش کے بعد

میں شاید ظاہر ہونا چاہتا تھا کسی اور جگہ پر
کسی اور گھر میں
کچھ اور کرتے ہوئے
اپنے کو گھومتے دیکھنا چاہتا تھا
پیں پیں کرتے ہوئے سڑکوں پر
شاید میں پیار اور اذیت کے کسی منظر سے
گزرنا چاہتا تھا
اپنے پرانے کمرے میں ساکت پڑے رات بھر

یہ ابھی یہاں کچھ دن اور ہیں، عورت کہہ رہی تھی مرد سے،
انھیں پھر ایک بار وہاں بلاؤ، ان کی باقی کویتائیں
اور کچھ کویتائیں پھر سے میں سننا چاہتی ہوں
ایسا کرنا، مرد بولا، صبح ناشتے پر
تمھی پوچھ کر دیکھنا
نہیں بابا تمھی کہنا، عورت نے کہا، میں ان کے لیے

---
2 شبھ راتری: شب بخیر

پڑوس سے مچھلی پکوالاؤں گی

صبح کی ناامیدی میں میں نے آنکھیں کھولیں
اور تھام لیا ایک اجنبی تولیہ
پرائی سی صابن دانی جسے دیکھ کر میرے اندر
کوئی چیز بے قابو ہوئی جاتی تھی

ان کا غسل خانہ اکیلا اور ڈراؤنا تھا
کیونکہ اور غسل خانوں کی طرح
یہاں بھی بند تھی گھر کی ساری الجھن
وہاں موجود تھا وہاں کا طاقتور بھوت
وہاں بے شمار دُکھوں سے واسطہ پڑ سکتا تھا
نہانا کچلے جانے کی طرح ہو سکتا تھا
میں نے گھبرا کر کھولا اس غریب ہمدرد نل کو
اور اُس بے چارے نے منظر کو بدل دیا

ناشتے پر میں نے پایا، تصویر کل شام سے مختلف تھی
وہ لوگ اپنے آپ تھے، چیزوں سے ان کا سروکار
بولتا تھا، اپنی بات کو صفائی سے سمجھا سکتے تھے
دو اوسط سے لوگ: عورت مرد
ان کا اپنا جیون تھا، اپنی بوسیدگی
فن کے شوق نے انھیں ابھی بودا
اور پلپلا نہیں بنایا تھا

Scanned with CamScanner

میں نہیں جانتا ان کی
کیوں کویتا میں ایسی دلچسپی تھی
ان کی صورت حال کو گلے سے اتارنے میں ہی
مجھے بہت دیر لگی

ناشتے پر خیر میں نے انھیں خوب ہنسایا
مجھے پتا تھا میں انھیں ہنسا کر
کسی دباؤ سے نکلنا چاہتا ہوں
کسی چیز کو
نکارنا[3] چاہتا ہوں

کویتا کا سوال

اوبڑ کھابڑ اور سنسان سے ایک شہر میں
جاڑے کی ایک شام کویتا پاٹھ[4] پورا کرنے کے بعد
مہمان شاعر نے اچٹتی نگاہ سے دیکھا
دھندلے اجنبی چہرے
ٹھٹھرتے ہوئے سامعین کے بیچ سے اٹھ کر
سانولی دبلی پتلی لڑکی نے
پوچھا ایک سوال:

---

[3] نکارنا: تردید کرنا، جھٹلانا۔ [4] کویتا پاٹھ: نظم خوانی۔

آپ کیوں لکھتے ہیں؟

وہ دین دیال بھنڈاری انٹرمیڈیٹ گرلز کالج میں
ہندی کی استانی تھی
اس کا نصیب اور اس کے مہاسے اُس شام
اسٹیج پر بیٹھے شاعر کو
اس کے سوال سے زیادہ منکھر [5] دِکھتے تھے
اُس کی آواز سن کر لگتا تھا وہ
بچوں کے لیے بنائی گئی تیز رفتار کارٹون فلم سے
نکل رہی ہے
اپنی بے چمک جلد کے پیچھے
چمکتی ہوئی ہڈیاں چھپائے وہ
ہر ہر عورت اپنے سوال پر اٹل تھی

سناٹا تھا جیسے کائنات میں پہلی بار
ایک مولِک [6] سوال پوچھا گیا ہو
کائنات کے پہلے شاعر سے

ٹھنڈ سے ٹھٹھرتے تھے منتظمین بھی
شاعر کے دانت کٹکٹاتے تھے
رَم کی بوتل ہوٹل میں تھی
تخت پر رکھا تھا صرف سادہ پانی

---

5 منکھر: باتونی، بلند آواز۔ 6 مولِک: اوریجنل۔

سوچنے کا بھی زیادہ وقت تھا نہیں
بہت مشکل سوال دیکھیے آپ نے کیا ہے
مہمان شاعر نے کہا
میرے ایک پُرکھے نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی تھی
جدائی کا مارا ہوگا پہلا شاعر . . .

باہر کے خالی پن اور اندر کی کھلبلی میں
اپنا سامان سمیٹ کر
بھاگ نکلنے کو ہوا
مہمان شاعر

دوپہر

عجیب سی آواز سے جاگ کر میں نے پایا
دلّی ایک دل شکن شہر ہے

کروٹ لی، بچہ دیکھا، اندازہ ہے بیوی بے سدھ سوئی پڑی ہے
اور ہم تینوں بیزار ہیں
نحوست اغل بغل، اوپر نیچے، ہر طرف پھیلی تھی
سوتی رہی تھی اور جاگتی رہی تھی
کھا چکی تھی اور رو چکی تھی
ہنسنے لگی تھی اور جانے لگی تھی

Scanned with CamScanner

پنکھا بھی ایک عذاب ہے، گلے کو
سکھا دیتا ہے، ناک ٹھس ہو جاتی ہے
میں نے منھ کھولا، ایشور، کسی طرح سانس لوں، آہ... آہہہ
اُسی وقت، اللہ، بیوی کی آنکھیں کھلی دیکھیں
اس کی مُدرا سے مجھے لگا
اسے لگ رہا ہے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں
اور اس کا اس کے پاس جواب موجود ہے
(جواب کا ایک لمبا تھان جو عرصے سے
بڑی لگن سے بُنتی رہی ہے)
میں نے کچھ نہیں کہا، گہری سانس لی اور چپ رہا
دوپہر بھر اسی طرح پھلتی پھولتی رہی
میری اپنی مستند کائنات

تمام جون اور آدھی جولائی میں اپنے دماغ کو
کوستا رہا، چٹانیں جو کبھی صاف پانی تھیں
بدل گئیں خواہ مخواہ دوڑتی ہوئی گاڑیوں میں
اسی طرح ڈامر، جو کافی سخت تھا، بلپلانے لگا
اس پر چلتے ہوئے لگتا تھا آپ
بہادر شاہ ظفر کے جسم پر چل رہے ہیں

یہ میرا نصیب رہا
کہ پہلے تو ہوا میں سب کے بیچ ایک ناچیز رچنا کار [7]

---

[7] رچنا کار: تخلیق کار، فنکار۔

اور پھر میری آتما کو جلتی ہوئی آگ نے مارا

اس آتما کو کئی طرح کے کشٹ تھے
آتما میری جس میں بہت سارے چھید تھے
اوپر سے وہ اتنی پھوہڑ تھی کہ چاہے جہاں
کلپنے لگتی: آگے ہی وہ اتنی کسیلی تھی
اور اب تو اس میں ایک عجیب سی بو آنے لگی تھی

میں خیر ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا اس عورت کو
جس نے برتن دھوئے، کھانا پکایا، اور مجھ کو
خوب چوما
خوب چوما اور کھانا پکایا
باڑھ میں بہہ کر چلا آیا اس کے پاس
ایک شیطان بچہ جو روتا تھا بے وجہ
رونے کی وجہ تلاش کرتے ہوئے روتا تھا

اس کم بخت بچے کے لیے
مجھے دنیا میں ایک اور جنم لینا پڑا
بیوی سے کہا، اسے زیادہ سزا نہ دو
سزا تو یہ میری ہے، اس نے جھنجھلا کر جواب دیا
اور بے بس ہو کر ہنس پڑی
اسی لمحے میں نے صاف طور پر دیکھا
میں کس حد تک بے ہوشی میں رہتا ہوں

Scanned with CamScanner

یہی وقت ہے، ارے یہی میری خوشی ہے
یہیں ہے میری زندگی کا مرکز اور
پوری دنیا کا محور، اور
میں ایک نہیں ہوں: ہم تین ہیں
اور اس طرح میں ایک بہت بڑی
لغویت سے بچ گیا

دوپہر بھر بھوک اور پیار کے سخت جبڑوں میں
ہم بری طرح پستے رہے
پیار پیار پیار کسی مرد سے
کسی عورت کا اتنا زیادہ پیار
آہ کہ آنکھیں جو کبھی پرسن اور سجل[8] تھیں
ماندی ہیں اور اب کچھ نہیں دیکھتیں

رات کو میں نے دیکھا

رات کو میں نے دیکھا میں گزر رہا ہوں دلی سے
جگہیں تو وہی ہیں لیکن لگتا ہے کچھ ہوا ہے

ارے! وہ لوگ کیا ہوئے جو یہاں کل تک تھے؟
تین ساہتیہ کار، پچیس دلال، چھ افسر، ایک حکیم،

8 پرسن: مسرور، مطمئن۔ سجل: نم، بھیگی ہوئی۔

Scanned with CamScanner

بے شمار اسمگلر، پانچ بھنگی، ایک شیطان، ایک پہلوان،
آٹھ دس عاشق، کچھ ایک جاسوس اور
فرشتوں کے کچھ گروہ...

دیکھا فقط دو کیکڑے چلے جا رہے ہیں
بدر پور کی سمت
ایک عدد سانپ رینگ رہا ہے سڑک پر
سنسان میں وہ ایک جگہ بستر بچھا ہے
ارے! یہ میری ہی تو چادر ہے، اسے تو میں
سانگانیر سے لایا تھا تاکہ اس پر سوؤں
تاکہ جھٹ سے یہ میلی ہو
تاکہ دھوبی موقع پائے ایک دم سے اسے کھو دینے کا
اور یہ تو وہی تخت ہے
اس پر میرا پرانا تہمد پڑا ہے
سڑکوں پر محض پہیے چلے جا رہے ہیں
کاروں کے، سائیکلوں کے، بسوں کے
جوتے چلے جا رہے ہیں، چپلیں گھسٹ رہی ہیں
انسانوں کا کہیں پتا نہیں، مشینیں غائب ہیں
دیواریں اب اپیل نہیں کرتیں
اندرا گاندھی کے لیے ووٹ کی
پاٹھک جی اور پروفیسر اروڑا کا وشال سامراج
مسمار ہو چکا ہے، ہر طرف ایک ہو کا عالم ہے
پیاس کا مارا کچھ پی رہا ہوں

Scanned with CamScanner

کس کا خون ہے یہ پتا نہیں
خون ہے یا کچھ اور
چونکہ میں نے کبھی اپنا خون نہیں چکھا
اور خون جان کر کبھی کچھ پیا نہیں
اس لیے پیے جاتا ہوں ایک گاڑھا، چپچپا
کھٹی بدبودار اور کھارا سا سیال
گہرے جوش میں اور گہری غفلت میں

میں رہنا چاہتا ہوں تمھارے ساتھ، میری اچھی بیوی
پہلی بار کرنا چاہتا ہوں، سارے دباؤوں سے اُبر کر
تم سے خوب پیار
اور پھر ہم سوئیں گے نہیں دہشت میں رات بھر
اپنے اپنے کمروں میں بھیانک تصور
باندھتے رہیں گے الگ الگ طرح کے
اور کبھی ایک دوسرے کو نہیں بتلائیں گے

مجھے ڈر ہے یہ تھوڑی دیر کا ہی رونا ہے
یہ حالت رہے گی نہیں، یہ خواب ہے
ہل رہی ہے یہ عمارت کہ جس میں سویا ہوں
کانپ رہی ہے دیکھو میری دلّی
کانپ رہا ہے سارا سنسار

اور اس کے اوپر لٹکا چاند

مکان

میں ایک مکان بنوانا چاہتا ہوں
اس میں رہوں، مکمل اس میں ایک تالا لگا سکے
جب بھی وہاں سے باہر جائے، میرے نہ رہنے کے بعد
جائیداد کی طرح نہ دیکھا جائے
جو پاس میں آئے اسے کاٹنے نہ دوڑے
ایک ٹھنگنی مٹ میلی مینار، کرائے پر نہ اٹھایا جا سکے جسے
کسی چیز سے بدلا نہ جا سکے
عصری سچائی کی طرح کھڑا رہ سکے جو چالیس پچاس سال

اوپر جس کے کچھ پتے کبھی کبھی دکھائی دیں
سکون سے ہلتے ہوئے

تیسرا پہر

سنیما کی دو مونہی ڈائن کھالیتی ہے
ایک شام کو بتا کا سارا کھانا
اور لگاتی ہے آسمان شگاف قہقہے
اندھیرے بھرے دن گزرتے ہیں پھسلن اور نمی میں
. برباد ہو جاتا ہے سارا فرنیچر

Scanned with CamScanner

جمع ہوتے رہتے ہیں سڑکوں پر جوتے
تیز سانسیں لینے لگتے ہیں دلی کے اخبار
پورے دنوں سے ایک عورت لڑکھڑاتی ہے اور
گلیارے میں گر جاتی ہے

اس طرح پلاٹ لیتا ہے ایک موڑ
آخری وفادار پڑھنے والا بھی صبر کھو دیتا ہے
نگاہ بھٹکتی ہے لفظوں کے آس پاس
پتلیاں دیکھنا بند کر دیتی ہیں کالے سفید کا فرق
وہ ایک انگڑائی لیتا ہے اور اٹھ کر چل دیتا ہے
میز پر بھول کر اپنا رومال، اور رومال
کتاب سے گھٹنا شروع کر دیتا ہے
لائبریری میں اترتی ہے
تیسرے پہر کی سنہری دھوپ

اب میں اپنا دکھ کیا
کسی گھوڑے سے کہوں گا؟

اپنی خبر

ہر چیز دھڑام سے نیچے آگرتی ہے
اچار کی ہنڈیا، دین الٰہی

Scanned with CamScanner

سُدا اما کے چاول، پی سی جوشی رپورٹ
سردار جی کا سر

پینتالیس فٹ کا اینٹینا بھی
نیچے آ گرتا ہے
وقت رہتے اُڑ جاتا ہے اس پر بیٹھا کوا
بھاگ لیتی ہے چھپکلی
اور گھریلو مکھی

چھوڑ جاتی ہے بوڑھی فاختہ اپنا گھونسلا
بڑے درخت کے اچانک گرنے سے پہلے
چیونٹیاں البتہ جھیل جاتی ہیں
زمین کی کپکپی

اُبھاگا انسان کہاں جائے
پھرتا ہے دربدر
سوچتے ہوئے:
میرا یہ حال تھا نہیں پہلے
ہو گیا ہے اب مگر

جہاں تک اس حقیر کا سوال ہے
آپ کیا جان لیجیے گا: میرے پاس
کچھ نہیں ہے سوا

Scanned with CamScanner

کان کے بھیتری پردے کے
اور ایک گڈ مڈ یاد کے

دلّی کی شہریت

جیسا پانچویں کلاس میں حساب میرے لیے ویسی اس شہر میں بھیڑ تھی

فلیش بیک ختم ہوا۔ بارش میں بھیگتا ایک روز چلا جاتا تھا
کہ ایک بھلی عورت نے مجھے ایک چھاتا دیا جو میں نے لے لیا
بنا کچھ بولے آخر میں ایک دن ایک مکان پر ہم ہوے وِداع

کہیے شریمان کیسے ہیں؟ یہ ایک دوست کا خط تھا شہر کے
دوسرے کونے سے

میں وہاں گیا
گلیوں میں بدبو تھی، اندھیرا کچھ نہیں کہتا تھا
اُس دوست نے دانت چمکائے
اور مجھے پیار سے کھانا کھلایا
وہاں کی ہر چیز میرا منہ دیکھتی تھی
ہم نے تھوڑی شراب پی لی، ریڈیو بھرّا رہا تھا
پھٹے گلے سے کوئی گاتا جاتا تھا
اچانک ایک وشواس مجھ میں آنے لگا، چاہے کچھ بھی ہو

میں انت کال[9] تک زندہ رہوں گا

ہاں بھائی

تاریخ میں غریب کی آواز
سنائی نہیں دیتی
توپوں کے دھماکے اسے دبا لیتے ہیں

غریب آدمی کے جیون میں البتہ
سنائی دیتی ہے اس کی تاریخ

نائی

ایک دن داڑھی بنواتے ہوئے
میں استرے کے نیچے سو گیا

کئی بار ایسا ہوتا ہے
کہ لوگ حجامت بنواتے ہوئے
سو جاتے ہیں
استرے، کنگھے اور قینچی کے نیچے

---

[9] انت کال: ابد۔ Eternity۔

Scanned with CamScanner

جیسے پیڑ کے نیچے

نائی نیند میں بھی گھس آیا اپنے قصے کا سرا سنبھالے
کہا: اجی میں کبھی کا ہو گیا ہوتا برباد
بھلا ہوا تاؤ نے ہاتھ میں استرا دے کر
بنا دیا جبراً مجھے نائی

جو دیکھا نہیں جاتا

ہیبت کے ایک ایسے دور سے گزر رہے کہ
روز اخبار میں اُلٹی طرف سے شروع کرتا ہوں
جیسے یہ ہندی کا نہیں، اردو کا اخبار ہو

کھیل کی خبروں اور کراس ورڈ پزل کے پردوں سے
جھانکتے اور جذب ہو جاتے ہیں
برے اندیشے
بیوپار اور فیشن کے صفحوں پر ڈولتی دکھتی ہے
خطرے کی پرچھائیں
اسی طرح بڑھتا ہوا کھولتا ہوں بیچ کے ورق، ادارتی صفحہ
دیکھوں وہ لوگ کیا چاہتے ہیں

پلٹتا ہوں ایک اور صفحہ

Scanned with CamScanner

علاقائی خبروں سے بھانپ لیتا ہوں
قومی خبریں

غرض یہ کہ شام ہو جاتی ہے بعض اوقات
اخبار کا پہلا صفحہ دیکھے بغیر

1857: سامان کی تلاش

1857 کی لڑائیاں جو بہت دور کی لڑائیاں تھیں
آج بہت پاس کی لڑائیاں ہیں

احساسِ گناہ اور جرم کے اس دور میں جب
ہر غلطی اپنی ہی کی ہوئی لگتی ہے
سنائی دے جاتے ہیں غدر کے نقارے اور
ایک ٹھیٹھ ہندوستانی شور غل
خوفزدہ دلاّلوں اور مخبروں کی سرگوشیاں
پالا بدلنے کو تیار ٹھکانے داروں کی بے چین چہل قدمی

ہو سکتا ہے یہ بعد کے عرصے میں لکھے ناولوں اور
کمرشل سنیما کا اثر ہو

پر یہ اُن 150 کروڑ روپوں کا شور نہیں

جو بھارت سرکار نے 'آزادی کی پہلی لڑائی' کے
150 سال بیت جانے کا جشن منانے کے لیے منظور کیے ہیں
اس وزیر اعظم کے قلم سے جو آزادی کی ہر لڑائی پر
شرمندہ ہے اور معافی مانگتا ہے پوری دنیا میں،
جو ایک بہتر غلامی کے قومی ہدف کے لیے کچھ بھی
قربان کرنے کو تیار ہے

یہ اُس ستاون کی یاد ہے جسے
پونچھ ڈالا تھا ایک اکھل بھارتیہ بھدر لوک [10] نے
اپنی اپنی گدّیوں پر بیٹھے بنکموں [11] اور امی چندوں [12] اور ہریش چندروں [13]
اور ان کے وارثوں نے
جو خود ایک بہتر غلامی سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے تھے
جس سن ستاون کے لیے سوائے بے نیازی یا خاموشی کے کچھ نہیں تھا
مول شنکروں [14]، شِو پرسادوں [15]، نریندر ناتھوں [16]، ایشور چندروں [17]، سید احمدوں [18]
پرتاپ نارائنوں [19]، میتھلی شرنوں [20] اور رام چندروں [21] کے من میں
اور ہندی کے بھدر ساہتیہ میں جس کی پہلی یاد
ستر اسّی سال بعد سُبھدرا [22] ہی کو آئی

---

10 اکھل بھارتیہ: کل ہند، آل انڈیا۔ بھدر لوک: تعلیم یافتہ متوسط طبقہ۔ بھدر ساہتیہ: اس طبقے کا ادب۔
11 بنگلہ ادیب بنکم چندر چٹرجی۔ 12 امی چند: ایسٹ انڈیا کمپنی کا ساتھ دینے والا ایک مارواڑی مہاجن۔
13 ہندی زبان کے پرجوش پرچارک بھارتیندو ہریش چندر۔ 14 سوامی دیانند سرسوتی، بانی آریہ سماج۔
15 راجہ شِو پرساد 'ستارۂ ہند'۔ 16 سوامی وویکانند۔ 17 بنگال کی نشاۃ ثانیہ کے اہم کردار ایشور چندر ودیا ساگر۔
18 سر سید احمد خاں۔ 19 'ہندی، ہندو، ہندوستان' نعرے کے خالق پرتاپ نرائن مشر۔ 20 میتھلی شرن گپت۔ 21 رام چندر شکل۔ 22 مشہور نظم "جھانسی کی رانی" کی خالق سُبھدرا کماری چوہان۔

Scanned with CamScanner

یہ اُس سلسلے کی یاد ہے جسے
چلا رہے ہیں اب 150 سال بعد خودکشی کرتے ہوئے
اس زمین کے کسان اور بنکر
جنھیں بلوائی بھی کہنا مشکل ہے
اور جو چلے جا رہے ہیں قومی ترقی اور
قومی بھک مَری کے اشاریے کی خوراک بنتے ہوئے
اسپیشل اکنامک زونز سے نکل کر
اجتماعی قبروں اور مرگھٹوں کی طرف
ایک اداس، مٹ میلے اور نراجی جلوس کی طرح
کس نے کر دیا ہے انھیں اتنا اکیلا؟

1857 میں میلا کچیلا پن
عام انسان کی شاید تقدیر تھی، سب کو تسلیم
آج وہ بھیانک جرم ہے،
لڑائیاں ادھوری رہ جاتی ہیں اکثر بعد میں پوری ہونے کے لیے
کسی اور یگ میں، کنھیں اور ہتھیاروں سے
کئی دفعہ تو وہ میلے کچیلے مُردے ہی اٹھ کر لڑنے لگتے ہیں پھر سے
زندوں کو للکارتے ہوئے، جو اُن سے بھی زیادہ مردہ ہیں

پوچھتے ہیں ان کی ٹکڑی اور رسالے اور سردار کا نام
یا ہمدرد سمجھ کر بتانے لگتے ہیں: اب میں نجف گڑھ کی طرف جاتا ہوں
یا ٹھٹک کر پوچھنے لگتے ہیں بختاور پور کا راستہ

1857 کے مرنے والے کہتے ہیں: بھول جاؤ ہمارے سامنتی نیتاؤں کو
کہ کن جاگیروں کی واپسی کے لیے وہ لڑتے تھے
اور ہم ان کے لیے کیسے مرتے تھے

کچھ اپنی بتاؤ

کیا اب دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے ناانصافی
یا تمھیں ہی نہیں سوجھتا اس کا کوئی اُپائے

ان چھپی کویتا

ایک کویتا جو پہلے ہی سے خراب تھی
ہوتی جارہی ہے اب اور خراب

کوئی انسانی کوشش اسے سدھار نہیں سکتی
محنت سے اور بگاڑ ہوتا ہے پیدا
وہ سنگین سے سنگین تر ہوتا جاتا
ایک مستقل حادثہ ہے
ساری رچناؤں کو اس کی بغل سے
لمبا چکر کاٹ کر گزرنا پڑتا ہے

میں کیا کروں اس ڈھیلی ڈھالی

سیسے سی بھاری کایا کا
جس کے آگے چھپی کویتائیں محض تتلیاں ہیں اور
ساری تنقید راکھ

آدمیوں میں یہ صرف مجھے پہچانتی ہے
اور میں بھی آدمی جب تک ہوں تب تک ہوں

اندرا وِکاس پتر

مڑ کر دیکھنے سے راستے میں پیدا ہو جاتا ہے ایک موڑ
ریل پٹریاں بدل دیتی ہے
وقت پشپا کو پشپا کی ماں جیسا بنا دیتا ہے

نکلتا ہوں اپنے سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ کی کینٹین کی طرف
گئی کے بارے میں سوچتا ہوں، پرانے بیروں کے چہرے یاد کرتا ہوں
لیکن پاتا ہوں نیا مالک کوئی گنڈوترا ہے
کاؤنٹر پر بیٹھا جس کا بیٹا جیسے مجھے پہچان کر انکل بلاتا ہے

کینٹین کا حساب تو لگ بھگ صاف تھا
لیکن کچھ بیروں کا مجھ پر ادھار باقی ہی رہا
بدایوں کے نوشاد کے ایک سو بتیس روپے اب پھول کر

23 اندرا وکاس پتر: اندرا گاندھی کے دور میں سرکاری طور پر جاری کیا ہوا سرمایہ کاری کا ایک سرٹیفکیٹ۔

ہزار آٹھ سو ہو چکے ہوں گے — قومی بچت کی پرانی شرح سود سے

کیمپس سے جاتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا : نوشاد بھائی
ایک آدھ ہفتے میں انتظام کر کے تمھارا ادھار لوٹا دوں گا
پھٹ سے اس نے کہا : ارے بھیا، کوئی فکر نہ کرو
میں ٹھہرا اکیلی جان، نہ بیوی کوئی نہ بچہ
گیارہ سال کی ایک بھانجی پانچ سال کا چھوٹا بھانجا
ان کے علاوہ کوئی اپنے کو یاد بھی کرنے والا نہیں
اِس ادھار کو چلائے رکھو
سمجھو یہ پیسے اندرا وکاس پتر میں لگا دیے تم نے
جب میری بھانجی کی شادی ہو
اُس وقت بھُنا کر دے دینا

اندرا... وِکاس... پتر...!
سنا ہے کنگ جارج ششم کی کھوپڑی والے سکے کی طرح
وہ پتر آج بھی ہندوستان میں جاری ہے
اور نوشاد تمھاری بھانجی اب چوبیس سال کی ہو گی
اور تمھارا کہیں اتا پتا نہیں

اور اُس ادھار کی کہانی جاری ہے

Scanned with CamScanner

حلف نامہ

نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا
آدمی اور کبوتر نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا
عورتوں نے شونیہ[24] کو نہیں جانا
کوئی سیال یہاں بہا نہیں
فرش کو رگڑ کر دھویا نہیں گیا

ہلکے اندھیرے میں ابھرتی ہے ایک شبیہ
چمکتے ہیں کچھ دانت
کوئی شے اٹھتی ہے، کیل پر ٹنگی کوئی چیز
اتارتی ہے، چلی جاتی ہے

نہیں کوئی بچہ یہاں سرکنڈے کی
تلوار لے کر مرغی کے پیچھے نہیں بھاگا

بندروں کے قافلوں نے
کمانڈ آفس پر ڈیرا نہیں ڈالا

میں نے سارے لالچ سارے شور سارے
سماجی اکیلے پن کے باوجود کیبل کنکشن نہیں لگوایا

---

24 شونیہ: صفر، خلا۔

چچا کے مصرعوں کو دہرانا نہیں بھولا

نہیں بہت سی پرجاتیوں[25] کو میں نے
نہیں جانا، جو سُننا نہ چاہا
نہیں سنا، گویا بہت کچھ میرے لیے
ناپید تھا

نہیں پہیہ کبھی ٹیڑھا نہیں ہوا

نہیں برابری کی بات کبھی ہوئی ہی نہیں
(ہو سکتی بھی نہ تھی)

اردو کوئی زبان ہی نہ تھی

امیر خانیؔ کوئی چال ہی نہ تھی

میر باقیؔ نے بنوائی جو
کوئی وہ مسجد ہی نہ تھی

نہیں تمھاری آنکھوں میں
کبھی کوئی فریب نہ تھا

---

[25] پرجاتی: نوع۔Species۔

دُرگا ٹاکیز: دن اور رات

اڑتالیس سال یہاں کی دیواریں
مَردوں کے پیشاب سے بھیگی ہیں

اندھیرے میں کام کرنے کے عادی پنکھے
پھینکتے ہیں سیلن بھری ہوا اور اندھیرا
تھوڑا لوگوں کی طرف، باقی کسی کی طرف نہیں

فرش بار بار اکھڑتا ہے، کسی کے پنجے
کسی کے گھٹنے کو پکڑ لیتا ہے، ٹھوکر کھا کر
پولیس والا لڑھکتا ہے ڈھول سا

نئے رپورٹر خدائی آواز میں کراہتے ہیں
غصے میں صفحہ رنگ ڈالتے ہیں
اور ایک کام چلاؤ پیوند لگا دیا جاتا ہے

کچھ کیبن یہاں الگ سے بنے ہیں جہاں
انگریز بیٹھا کرتے تھے، بیالیس کے بعد کچھ خاموش،
کچھ بدلے سے
دوسری جنگِ عظیم کے
جادوئی مقناطیس سے کھنچے

Scanned with CamScanner

فوجی آتے تھے، ہو ہو ہنستے ہوئے
کیبنوں میں اب ٹوٹا فرنیچر بھرا ہے
چوری سے تماشائیوں پر یہاں سے نگاہ رکھا کرتے ہیں
کچھ شہدے، کبھی کبھی ہلکے سے کھنکھارتے ہوئے

ٹھنڈے کٹھور سیمنٹ پر اَن گنت بار
ٹپکا ہے ویریہ[26]
اسکولی شاگردوں کا، بے بس ادھیڑوں کا
آخری شو میں اکثر گرا ہے
چاقو باز شرابیوں کا کڑوا بلغم
اور خون کچھ سستا سا کچھ کالا کچھ مفت
کرسیوں کے بیچ آئے دن وہی چیکٹ رومال
وہی کنگھے

یہ وہی پرانا پردہ ہے جس پر
ایک بار دکھائی گئی تھی خاموشی
اور آپ کو اچانک نظر آئی تھی
وحیدہ رحمٰن کے منھ سے نکلتی
زندہ چھپکلی

اس سنیما گھر میں کنواری لڑکیاں اور بیاہی عورتیں
ایک ہی جذبے سے تکتی ہیں ایتابھ جی کا چہرہ

---

[26] ویریہ: منی۔ Sperm۔

اور شریمتی سِلک سِمتا کی مشینی کمر

یہاں کبھی کبھی کچھ مقامی دانشور بھی
چلے آتے ہیں، آپسی کدورت بھول کر
اور انٹرول میں کر لیتے ہیں
آنے والے خطرے کی بھی تھوڑی یاد

دوسرا ہیمنت

کافی ہوم میں گھستے ہی مجھے دکھائی دیا
ہیمنت کوئی تیس سال بعد
وہی چہرہ وہی گھنگھریالے بال
سمجھداری اور فرار سے بھری وہی
شرمیلی ہنسی
کوئی نوجوان لڑکی آہستہ آہستہ اس سے
کچھ کہہ رہی تھی
اوپر نیچے کٹھ پتلی کی طرح سر ہلاتے ہوئے
وہ کہہ رہا تھا اچھا اچھا!
جی ہاں! جی ہاں! ایک دم! بالکل!

یہ کم بخت بالکل نہیں بدلا
بے تکلف جوش سے میں اس کی طرف بڑھا

اس نے مجھے دیکھا اور نہیں بھی دیکھا
پھر اسی طرح سر ہلانے میں مشغول ہو گیا
جیسے ہی میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا

'اس شہر میں کب سے ہو ہیمنت!'
میں جان گیا یہ ہیمنت نہیں ہے
وہ بھی جان گیا کہ وہ ہیمنت نہیں ہے
ایک بناوٹی لیکن شائستہ مسکراہٹ سے اس نے
یہ معاملہ رفع دفع کر دیا

کافی ہاؤسوں میں اکثر اسی طرح
منڈلاتا رہتا ہے ماضی
اور گھومتے رہتے ہیں کچھ کھسیائے ہوئے سے
گنجے پریت
ایک دائمی پیاس چھپائے ہوئے

ہیمنت
یہ کیسے ہو سکتا تھا ہیمنت
تیس سال... تیس سال تو اس نوجوان کی
عمر بھی نہیں ہے، غافل!
یہ اُس ہیمنت کا بیٹا بھی نہیں ہو سکتا
اتنا ہم شکل ہونے پر کون کم عقل ہو گا کہ
اپنے باپ کی نقل بنا پھرے

Scanned with CamScanner

تم جو بھی کوئی ہو، کیا سچ ہو؟
یا بھی ایک دن سپنا ہے،
ہیمنت دوم!

گھر کی بات

اُس لڑکے کو خواب میں دکھتے رہتے ہیں پستان
اس کے ہونٹ ہلتے رہتے ہیں نیند میں
جیسے کچھ چاٹتی رہتی ہے

اس کی ماں سمجھتی ہے
اس کی شادی ہو ہی جانی چاہیے
شادی کی یہی عمر ہے
پھر ذمے داریاں آئیں گی
تو یہ نوجوان
اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا

آ ہی جانی چاہیے ایک دلہن
اس گھر میں
جہاں گھستے ہی دکھائی دیتے ہیں
کچھ برتن بھانڈے

Scanned with CamScanner

خراد کا سامان بکھرا ہوا
ایک مُردار لوٹا
بالٹی لڑھکی ہوئی

جہاں ایک کنڈے پر لٹکی ہے غریبی
جیسے قصائی کے یہاں لٹکا رہتا ہے
اُدھڑے ہوئے بکرے کا دھڑ
جہاں زنگ لگی ترازو پر
دو کلو کے باٹ کی طرح
رکھی ہے بدنصیبی

اور کونے میں کڑی سے لٹکی ہے
ایک بڑی سی چیکٹ پوٹلی
خدا جانے اس میں کیا ہے

دلہن کے لیے اس گھر میں
کرنے کو کام بہت پڑا ہے

آسمانی ناشتہ

بریلی کے ایک گھر میں اتوار کے دن علی الصباح
ایک گرہستن دل لگا کر بنا رہی ہے کوئی ناشتہ

Scanned with CamScanner

نکل رہی ہیں انوکھی خوشبوئیں
آملی ہیں جیسے وہاں کچھ آسمانی چیزیں

اس سے بے خبر شوہر چل دیا ہے اسٹیشن کی طرف
مجھے لینے؛ راستے میں رک کر وہ خرید رہا ہے
کچھ سگریٹ — اسے کیا پتا میں اب سگریٹ نہیں پیتا —
اور کچھ ادھر ادھر کی چیزیں: کنگھی، نیا صابن،
کچھوا چھاپ مچھر اگربتی...
اسے خبر نہیں میں اس گاڑی سے نہیں آرہا
اور کسی بھی گاڑی سے نہیں آرہا
بلکہ بیٹھا ہوں اپنا منحوس چہرہ لیے
دلّی کے بیچوں بیچ اپنے پلنگ کے کنارے پر
آدھی نیند اور آدھی جاگ کے درمیان جھولتا ہوا

ایک عورت بنا رہی ہے ایسا کوئی ناشتہ
پہلے کبھی جو اُس گھر میں نہیں بنا
اور بعد میں کبھی نہیں بنے گا
جو بات آج ہے پھر نہیں آپائے گی
یہ نسخہ ہمیشہ کے لیے کھو جائے گا

میرا فون وہاں پہنچتا ہے
میری آواز سن کر گرہستن بولتی ہے — اس کی آواز میں ایک
سنبھلی ہوئی سی چہک اور ایک ڈھلی ہوئی نفاست ہے —

'اچھا تو آپ آ گئے! یہ آپ کو
اسٹیشن پر نہیں ملے؟'
اور جب میں کہتا ہوں 'دیکھیے میں دلّی ہی میں ہوں،
مجھے اپنا سفر ملتوی کرنا پڑا۔۔۔'
تو سن کر وہ انتظار کرتی ہے جیسے
ابھی کچھ اور سننا باقی ہو
یا میں نے چینی زبان میں کچھ کہا اور اب
کوئی ترجمان اس کا ہندی میں ترجمہ کرے گا

'کہ میں بہت معافی چاہتا ہوں'
سن کر وہ صرف ایک لفظ بولتی ہے: 'اچھا!'

ایک ناشتہ، کھانے کے لیے جسے چاہیے
اچھا دل اور اچھی روح
ایک ناشتہ، کھا کر جسے پُنر جنم کی کامنا جاگ اٹھے
ایک ناشتہ جس کی خوبیوں کا تول
غیر حاضر مہمان کی بدنصیبی سے کچھ زیادہ ہی ہو
یوں ہی ٹھنڈا پڑ جائے گا

اُس ناشتے پر پڑے گی مایوسی کی چھایا
اس پر ڈھک جائے گی بے حسی کی چادر
اڑ جائے گا اس کا رنگ
نکل جائیں گی اس کی خوشبوئیں

Scanned with CamScanner

بدل جائے گا اس کا سواد

ایک حیران اور پریشان مرد گھر لوٹ کر آئے گا
تو ایک خاموش اور خفا عورت اسے چند لفظوں میں حال بتائے گی

ان کی طبیعت پتا نہیں کیا کرنے کی ہوگی
کچھ عجیب سے خیال گزریں گے ان کے دماغ سے
ایسے ہی ہوتی ہیں کچھ چیزیں خراب، ایسے ہی
آتے اور جاتے ہیں کچھ لوگ

کیا ہوگا اُس ناشتے کا؟
مجھے یقین ہے وہ پھکے گا نہیں، دو تین افراد
بے آواز بتوں کی طرح بیٹھے
اسے کھا ہی لیں گے دھیرے دھیرے

یہ ایک ناشتے کی بربادی کی ہی کہانی ہے بس
جو ایک بُرے فیصلے پر شروع ہوتی ہے
اور ایک بُرے فیصلے پر ہوتی ہے ختم

اس کے کچھ دھاگے ایسے ہیں جو لٹکے رہیں گے
اب ہمیشہ اُدھر میں

Scanned with CamScanner

ایک تصویر

وہ کالی سفید ایک تصویر تھی میں جسے
برسوں اپنے ساتھ رکھے رہا
تصویر میں ایک جانی پہچانی عورت ہے: اس کا ایک پیر
پائیدان پر ہے، ایک زمین پر
ساڑھی کے نیچے سے اس کا سانولا ٹخنہ جھانک رہا ہے
اور کچھ پنڈلی بھی
اس کی پیٹھ ہماری طرف ہے، چہرہ کچھ
پیچھے کی طرف مڑنے کی حرکت میں ہے
شاید کہ وہ مسکرائے

بس کی چوتھی کھڑکی میں ایک عورت
پنکھا جھل رہی ہے کچھ بے چینی سے
اور پانچویں میں سے سر باہر نکال کر
ایک آدمی قے کر رہا ہے یا تو،
یا اپنی قسمت پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے

بس کے پیچھے دکھائی دیتے ہیں
درختوں کے چھتر
دو نیم کے، ایک املی کا
پہلوان چھاپ بیڑی کا ایک بورڈ

Scanned with CamScanner

براجمان ہے۔ جس میں شہید چندر شیکھر آزاد جیسا ایک شخص
جنیؤ ڈالے، ننگے بدن پر تاؤ دیتا
بیڑی خریدنے کے لیے للکارتا

پیچھے ہے نیو بھارت ہیر کٹنگ سیلون
جس پر بنے ہیں نیتاجی سبھاش
اپنے گنجے سر کو آزاد ہند فوج کی ٹوپی کے نیچے چھپائے
ایک پورا انسانی تناظر ہے اس تصویر میں
ایک اس سے بھی وسیع تناظر کے ساتھ
چھپے ہوں گے اس میں کچھ روحانی اشارے بھی ضرور
پر تصویر میں اصل اس ننھے ہی کی مہما[27] ہے

تیس سال بعد جا کر وہ پھر دکھائی دی
اور میں نے اس سے کہا، ذرا دیکھو تمھیں تمھاری
ایک بیش قیمت تصویر دکھاتا ہوں
اور وہ دنگ رہ گئی یہ فریم میں جڑی تصویر دیکھ کر

کیا تم نے کبھی اسے دیوار پر لٹکایا تھا؟
میں نے بتایا، ہاں! برسوں... کئی مکان بدلے
کئی بار سامان بندھا اور کھلا
جب تک یہ تصویر دیوار پر آویزاں رہی

---
27 مہما: مدح وثنا۔

اس تصویر میں تمھیں کیا پسند ہے؟ اس نے پوچھا
جیسے پوچھا جاتا ہے کوئی نازک سوال
پہلے تو میں نے کہا، کئی چیزیں...
ایک مفصل ہوا نمبر دو دور کا بس اسٹاپ
پرانے اشتہار اور تختیاں
یہ سب... اور باجی، تمھارا لخنہ
اس تصویر میں تمھارا لخنہ دیکھتے ہی بنتا ہے

یہ سن کر اس نے پیر ساڑھی کے اندر سکیڑ ے
اور کہا، لخنہ! ہے بھگوان!
تم تو آج بھی ویسے ہی کے ویسے دھرے ہو
کسی کی قمیض کے رنگ، کسی کے ٹخنے کو تھامے ہوے
مجھے یاد ہے تم جب چھوٹے تھے تو تم اور بھیا
دو دن تک کمرے میں گھسے آرٹسٹک لمحہ نام کے کسی مضمون پر
بحث میں الجھے رہے تھے

مہان لمحے ہوتے ہیں اور چلے جاتے ہیں
نہ ہمیں ان کی حقیقت دکھائی دیتی ہے اور نہ وہاں چھپا آرٹ
اتفاق سے کسی دن دوپہر کے وقت ایک سیکنڈ کے
ایک سو پچیسویں حصے میں یہ جو ایک تصویر لی گئی تو
اس میں واقع ہوا وہ سب جو کہ ہوا
اور جو وقت کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
پھیلتا اور پھولتا ہی چلا جاتا ہے

نوبت پور میں رنگ منچ کا حال

(منیجر کا بیان)
وجے لکشمی کو ناٹک منڈلی[29] چھوڑے کئی برس ہو گئے
اس کا اپنے سابق شوہر سے جھگڑا پہلے کی طرح چل رہا ہے
تین مقدمے اس نے اُس پر ٹھونک رکھے ہیں، دن اُن لوگوں نے اُدھر سے
لوگ کہتے ہیں یہ جھگڑا ساس بہو کا ہے
جس میں وہ 'بے چارہ' دونوں طرف سے پس رہا ہے
ہاں ناٹک دیکھنے کی اسے جولت اپنی بیوی کی وجہ سے لگی تھی
چھوٹی نہیں ہے: کبھی بھی شو ہوتا ہے تو
شریمان بیچارے دیکھنے چلے آتے ہیں
وجے لکشمی لیکن ایسی گئی کہ مڑ کر بھی نہیں دیکھا
ملنے پر پہچانتی تو ہے اور سب باتیں بھی ہوتی ہیں
پر ناٹک چیز کا نام
بھول کر بھی زبان پر نہیں آتا

اِدھر دو تین نئی لڑکیوں نے آنا شروع کیا ہے
بیوپاری گھرانوں کی لڑکیاں ہیں، زبان ان کی بالکل چوپٹ ہے
محاوروں کا قطعی گیان نہیں، بنیوں والی گھریلو بھاشا بولنے سے بھی
کتراتی ہیں، وہ بھی انھیں ٹھیک سے آتی نہیں
ایکٹنگ تو ٹھیک کر لیتی ہیں، بشرطیکہ بولنا نہ ہو

---
28 رنگ منچ: تھیٹر۔ 29 ناٹک منڈلی: تھیٹر گروپ۔

بولتی ہیں تو کوشش کر کے، اور جذبات ندارد
جذباتی ایکٹنگ کرواؤ تو زبان بند
لیکن یہ غنیمت ہے، ان کے گھر والے ہمیں تنگ
اور انھیں تنبیہ نہیں کرتے
خوداعتمادی بھی ان لڑکیوں میں بے پناہ ہے
ایکٹروں کو سیدھا رکھتی ہیں
ہمارے سر پر ابھی تک کوئی بلا نہیں آئی
لڑکوں کا حال تو وہی پرانا ہے، ان کا جہاں نہیں بدلا
آگے پیچھے گھومتے رہتے ہیں
یہ بلائیں اس سے پریشان نہیں ہوتیں
کام لائق مدھر سمبندھ رکھتی ہیں اور
منڈلی کے اندر ماحول کو بگڑنے نہیں دیتیں
بات یہ ہے لڑکیاں حیثیت میں لڑکوں سے دو درجے اوپر ہیں
آپسی میل ملاپ تو خوب رہتا ہے پر
'یہ شادیاں کبھی نہیں ہوں گی!''

کرن سنگھ؟ اپنا وہ لائٹ مین کرن؟ اسے بھی
ناٹک چھوڑے کوئی دو سال ہو گئے
اپ تو جانتے ہی تھے
ہیرو بننے کی اس کی تمنا کے بارے میں
تمنا دل ہی میں رہ گئی
پرکاش بابو نے ایک روز ریہرسل کے بعد
اس سے کچھ ایسا کہا کہ وہ پھر سے

اپنی خاندانی پان کی دکان پر جا بیٹھا
ایک روز ملا تھا، کہنے لگا، چرنجی بابو،
پان کی دکان سے بڑا تھیٹر کوئی نہیں، یہاں کے اپنے رنگ ہیں

پرکاش بابو تو دلّی جا بسے اور اب لوک ناٹک کا
تیل بیچ رہے ہیں
یہاں تو جدیدیت کے اوتار تھے، رنگ کرم پر سے
صدیوں کا جما میل کھرچ کر اس کو نئی آبھا[30] کے ساتھ
سامنے لانے کی بات کرتے تھے اور اسی غرض سے
کالج میں انگریزی کے لیکچرر کی پکی نوکری چھوڑ کر رنگ منچ پر کود ے تھے
پر کیا ہوا؟ آبھا لال نام کی نک چڑھی ایکٹریس کو
یہاں سے بمبئی ضرور بھجوا دیا
حالانکہ سچ یہ ہے کہ آبھا لال جیسی بے صلاحیت اداکارہ
نوبت پور کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی
پر ہمیں اتنی خوشی ضرور ہے کہ اپنے یہاں کی ایک لڑکی
پورے ہندوستان کی چھاتی پر مونگ دل رہی ہے

زبانی تاریخ

کچھ ہونا تھا ستر کی دہائی میں جو نہیں ہوا
اسی کی دہائی میں چلنے لگیں الٹی سیدھی ہوائیں

---

30 آبھا: چمک، دلکشی۔

اور نوے کی دہائی میں جو نہیں ہونا تھا ہو ہی گیا

اس طرح صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی
رخصت ہو چلی ایک پوری ہی صدی

اب یہ تحقیق کا موضوع ہے

اور چونکہ ہم بیسویں صدی کے کچھ نمائندہ نمونے ہیں
تو گیلکسی چینل کی زبانی تاریخ کے پروجیکٹ کے تحت
ایک سوالنامہ اور ایک مائیک لے کر آرہے ہیں
اکیسویں پیڑھی کے یہ محقق جنھیں
اکیسویں کے الف اور صدی کی یے کا پتا نہیں

یہ ہم سے کیا پوچھ سکیں گے
انھیں ہم کیا سمجھا سکیں گے

سوا اس کے کہ میں صاف حجامت بنا کر
ذرا تن کر کرسی پر بیٹھوں
اور میری بیوی بھی اس موقعے پر
بالوں میں کنگھی کر لے

دوسری طرف

کہیں بھی داخل ہوتے ہی
میں باہر جانے کا راستہ ڈھونڈنے لگتا ہوں

میری یہی کامیابی ہے کہ
مجھے ایسی بہت سی جگہوں سے باہر نکلنا آتا ہے
جہاں داخل ہونا میرے لیے نہیں ممکن

کہ میں تیرہ زبانوں میں نمستے
اور تیئیس میں الوداع کہنا جانتا ہوں

کوئی بولنے سے زیادہ ہکلاتا ہو
چلنے سے زیادہ لنگڑاتا ہو
دیکھنے سے زیادہ نگاہیں پھیرتا ہو
جان لو میرے ہی قبیلے سے ہے

میری بیوی، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے،
الگ قبیلے کی ہے
اس سے ملتے ہی آپ اس کے
مرید ہو جائیں گے

Scanned with CamScanner

دیکھنا ایک روز یہ باتونی چڑیل
ہنستے ہنستے میرا خون پی جائے گی

ادھیڑ پریم

(لائیو فرام اندھیری)
ایک پریم کی جو بھاگ جانا مانگتا ہے
نہ واپس آنا
جو نہ اِدھر سے نکلنے کو کرتا ہے
نہ اُدھر سے
وہ پریم ہے بھی کہ نہیں
اپنے کو پتا نہیں چلتا اس عمر میں

یہ صحیح ہے کہ عمر کچھ ہوتا نہیں ہے
یہ چیز کیا ہے، ہم نے کبھی مانا ہی نہیں
پر ایک اس میں مطلب ہے
تھوڑی تھوڑی دور چل کر ستانا ٹھیک رہتا ہے
گھر پہنچنے میں چالیس منٹ نہیں
سوا گھنٹہ لگ جاتا ہے
پیٹھ درد کرتی ہے، گھٹنا کمپلینٹ کرتا ہے
اِن لوگ کا کمر جو ضرورت پڑنے پر
لچکتا تھا مرضی مافِق

Scanned with CamScanner

اب بن بتائے جھکتا ہے
کیوں پارٹنر؟

کنجڑوں کا گیت

ہم ایک ہی طرح کے سپنے دیکھیں گے
اس کی ٹوکری میں گاجر مٹر اور ٹماٹر ہوں گے
میرے سر پر آلو پیاز اور ادرک
ہرا دھنیا اور ہری مرچ الگ پوٹلی میں
یا گیلے ٹاٹ کے نیچے
لیچڑ خریداروں کے لیے، کیونکہ لیچڑ خریدار ہی
اچھے خریدار ہوتے ہیں، اچھے انسان
بچوں کی فکر کرنے والے

کیونکہ وہی ہم سے بات کرتے ہیں
ضد کرتے ہیں، حجت کرتے ہیں، جھگڑے پر اتر آتے ہیں
ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا جانتے ہیں
چلتے چلتے ناراضی دکھاتے ہوئے
کچھ مری مری باتیں کرتے ہیں جن کے پیچھے
چھپی ہوتی ہے اپنائیت اور گیان

اگلے روز وہ پھر ہم سے الجھنے آجاتے ہیں

Scanned with CamScanner

وہ جھینکتے ہیں، ہم چلاتے ہیں، دوسرے گاہک جھنجھلاتے ہیں

یہاں روز کا قصہ ہے
آخر میں بچی رہتی ہے تھوڑی سی نرم دلی

وہ ہمیں ہمارے نام اور عادتوں سے جانتے ہیں
کوئی راستے میں ملتی ہیں تو پوچھتی ہیں: رام کلی
کیسی ہو؟ ایسے بن ٹھن کے کہاں جا رہی ہو؟
بٹیا کا نام، آرادھنا؟ بڑا اچھا نام رکھا ہے
کوئی بابو ملیں تو بولتے ہیں: اور بھئی کیلاش
دکھائی نہیں دیے کئی دن سے
گھر پر سب ٹھیک تو ہے؟
گھر پر یوں تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے
پر سب کچھ ٹھیک ہے

ہم سے سبزی خریدنے والے بھی بھانت بھانت کے ہیں
سمجھو سو میں سے دس تو ہم سے بھی ہلکے
دس برابر کے اور باقی بڑے کھاتے پیتے آپ جیسے امیر
ہم سب کو برابر مانتے ہیں: سب کی سنتے ہیں تو
سب کو سنا بھی دیتے ہیں

ہم کم تول سکتے ہیں پر ہم تولتے نہیں
کیوں؟ کیونکہ صاحب، کم تولنے والوں کا

بچارہ جاتا ہے شام کو
ڈھیر سارا سامان

پوربی دِشا

ایک دن اس دنیا سے
اردو بولنے والوں کا صفایا ہو جائے گا
رہ جائے گی ہماری پیاری ہندی بھاشا
دفنا دیں گے پھر ہم اپنی یہ کلھاڑی

ایک دن ختم ہو جائیں گی
پچھم کی طرف منہ کرنے والی قومیں
ہر طرف ہوگا پورب کی ریت کا بول بالا

ایک دن پچھمی دِشا ہی ختم ہو جائے گی
اکیلی بچ جائے گی بس ہماری پوربی دِشا

31 پوربی دِشا: مشرقی سمت۔ پچھمی دِشا: مغربی سمت۔

Scanned with CamScanner

سرجری

ایک ناستک[32] جو ادھیڑ بھی ہے اور شاعر دل بھی
ابھی سرجری کے بعد اسپتال میں پڑا ہے
اسے ابھی اسپتال کے خرچ کا اندازہ نہیں
اس کی بیوی نے کر ڈالے ہیں کئی دورگامی فیصلے
تکلیف اور خمار کے درمیان پڑا ہوا
سوچتا ہے وہ ڈاکٹر تلوار کی وجہ سے نہیں زندہ ہے
اسے زندہ رکھے ہوئے ہے ایک بنفشے کا پھول

ناک سے لگی نلکی ہٹی دیکھ کر اُدھر سے گزرتی نرس کہتی ہے
ارے اسے کیوں نکال دیا
ایک اور نرس آ کر نلکی کو واپس جوڑ جاتی ہے
بولتی ہے دوبارہ ایسا نہ کرنا
برآمدے میں اسٹول پر بیٹھی بیٹی دوڑ کر آتی ہے: کیا ہوا پاپا
اور اس کا سر سہلاتی ہے

تجھے کیا بتاؤں ملک پر مجرم گروہ چھا گئے ہیں چھوٹی
اور امید کی دہلیز ہے ایک عمر دور

اَور سیاروں پر زندگی ہوتی تو پتا نہیں کیسی ہوتی بسر

---

32 ناستِک: دہریہ۔

ستاروں کی دنیا خود سے رہتی ہے انجان
انت میں کائنات کا بھی کچھ نہیں بچے گا
وہ کالے سوراخ بھی ختم ہو جائیں گے بس رہے گی ایک بد بد
جیسے کہ دھرتی پر کبھی تھی سائیں سائیں

کیا معلوم میری گھڑی کب سے بگڑی پڑی ہے
اگر کسی طرح چلتی بھی ہے تو غلط وقت بتاتی ہے
ایک عمر آتی ہے جب سے کا اندازہ دوسرے لوگوں کی چال ڈھال سے
چہرے مہرے دیکھ کر، ان کی باتیں سن کر ہونے لگتا ہے
گھڑی سے اور دھوپ چھاؤں سے نہیں اپنے ہی شریر سے باتیں کرتے ہوئے
نرناری جاننے لگتے ہیں اپنا وقت

کتنی چیزیں ہیں جو دکھائی دیتی ہیں پر ہیں نہیں
اُن تاروں کی طرح جو کبھی کے غائب ہو چکے ہیں
پر ان کی جھلملاہٹ پہنچتی ہے آج تک
سنہ 1989 عیسوی دھرتی پر کیا کر گیا
پر فی الحال اُدھر دھول ہی دھول دکھائی دیتی ہے روشنی نہیں
خیال کتنے دن بعد چمکنے لگتے ہیں کھو جانے کے بعد؟
اور غائب ہو چکے نظام کیا کواڑ بند کر کے
اور غائب ہو چکی پرجاتیوں کی طرح
غائب ہونے کے کاروبار میں لگ جاتے ہیں؟

اپنی اماں سے پوچھو اب آگے کا کیا پلان ہے

Scanned with CamScanner

یہاں سے کب مجھے چھڑا کر لے جائے گی

ارے تمھیں پتا ہے میں پرسوں جیسے مر ہی گیا تھا
انھوں نے مجھ سے میرے سارے کپڑے اتروا لیے
جب میں اپنا بنیان اور انڈر ویر اتار رہا تھا
تو لگتا تھا مجھے اپنے بچوں سے الگ کیا جا رہا ہے
اب پتا نہیں میں کہاں جا پڑوں گا
نرک[33] تو کوئی جگہ ہے نہیں، اور یہ جو محبوب وطن ہے اپنا
ایسے ہی بھڑ کا کرے گا میرے بنا

❊❊

---

[33] نرک: دوزخ۔

Scanned with CamScanner

رالف رسل کی خودنوشت سوانح کی پہلی جلد کا اردو ترجمہ جو نندہ یابندہ کے عنوان سے آج کے شماروں میں قسط وار اور بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اس جلد میں ان کے بچپن سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک کے حالات بیان کیے گئے تھے۔ دوسری جلد میں یہ کہانی آگے بڑھتی ہے اور اگلے تیرہ برس کی روداد سناتی ہے۔ اس جلد میں نہ صرف رالف رسل کے اردو سے تعلق کے مستحکم ہونے کا عمل سامنے آتا ہے بلکہ اس کا ایک اور اہم پہلو اس زمانے کی بائیں بازو کی سیاست کا احوال بھی ہے۔ جیسا کہ رالف رسل کا کہنا تھا، اردو اور کمیونزم دونوں کو ان کی بلوغت کے بعد کی زندگی میں ہمیشہ بنیادی اہمیت حاصل رہی۔ پہلی جلد کی طرح اس جلد کا ترجمہ بھی ارجمند آرا نے کیا ہے۔ پہلی قسط میں اس جلد کے پیش لفظ اور پہلے چھ ابواب کا ترجمہ شامل ہے۔

Scanned with CamScanner

کچھ کھویا، کچھ پایا

رالف رسل کی خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ

1945 سے 1958 تک

(LOSSES, GAINS)

Part II

of the autobiography of Ralph Russell

1945-1958

مصنف:

رالف رسل

(بہ تعاون میرین مولٹینو)

مترجم:

ارجمند آرا

Scanned with CamScanner

وہ سوچتے ہیں میں ہار گیا، میرا خیال ہے میں جیت گیا

— مایا اینجیلو

(They think I lost, I think I won. — Maya Angelou)

Scanned with CamScanner

پیش لفظ

یہ کتاب میری اس خودنوشت کا دوسرا حصہ ہے جو غالباً تین حصوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلا حصہ جوئندہ یابندہ (Findings, Keepings) 1918 سے 1945 تک کے دور کو محیط ہے۔ وسیع تر سیاسی سیاق میں کہا جاسکتا ہے کہ اس میں پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے سے شروع ہوکر دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے تک کے حالات شامل ہیں۔ نجی زندگی کے اعتبار سے یہ میری عمر کے ستائیس برسوں کا احاطہ کرتی ہے۔ زیرِ نظر جلد میں 1945 سے 1958 تک کا زمانہ شامل کیا گیا ہے۔ جس میں کہانی میری عمر کے چالیس برسوں کو طے کر لیتی ہے۔ تیسرے حصے میں، جس کے بارے میں مجھے امید ہے کہ آئندہ دو ایک برسوں میں شائع ہو جائے گا، 1960، 1970 اور 1980 کے عشروں پر محیط ہوگا۔

اس جلد میں تیرہ سال کے جس عرصے کو سمیٹا گیا ہے وہ نسبتاً مختصر ہے، لیکن کئی وجوہ ہیں جن کی بنا پر یہ سود مند معلوم ہوا کہ اس کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔ برطانیہ اور ہندستان میں، یعنی ان دو ممالک میں جہاں میری عمر کا بیشتر حصہ گزرا، یہ زمانہ دوررس اور نتیجہ خیز سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ ہر جگہ کے کمیونسٹوں کے نزدیک یہ زمانہ گہرے اور سنجیدہ احتسابِ نو کا متقاضی تھا — میرے لیے یہ احتساب 1956 کے اہم موڑ سے خاصا پہلے شروع ہو گیا تھا۔ ذاتی طور پر میرے لیے یہ زمانہ وہ ہے جس نے میرے مستقبل کا ڈھرا طے کر دیا۔ اس میں میں نے وہ سب کچھ پایا جو اردو کی تعلیم و تعلم کے باعث بعد میں میرا پیشہ بن گیا۔ نجی سطح پر، اسی عرصے میں کئی چیزوں کی بنیادیں بھی پڑیں — میں نے شادی کی، کنبہ پروری شروع کی اور عمر بھر کی چند ایسی رفاقتیں پائیں اور رابطے پیدا کیے جنھوں نے میری زندگی کو بہت ثروت مند کیا۔

میری زندگی کے تین پہلو ہیں جو نہ سلجھنے والے انداز میں ایک دوسرے میں پیوست رہے ہیں — اُن بنیادی اقدار سے میری وابستگی جنھوں نے مجھے کمیونسٹ بنایا، اردو کا مطالعہ، اور سچی انسانیت کی بنیادی خوبی کے طور پر محبت کے جذبے کا عرفان۔ ان کے باہمی تعامل ہی سے میری زندگی کی تعمیر ہوئی ہے، اور میں نے کوشش کی ہے کہ ان برسوں کی کہانی کو کچھ اس طرح سے پیش کروں کہ یہ تعامل روشن نظر آئے۔

Scanned with CamScanner

اگر چہ اس جلد کو آزادانہ طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے لیکن فطری طور پر اس کا بہترین مطلب تب اخذ کیا جا سکے گا جب اسے ایک مسلسل کہانی کی صورت میں پڑھا جائے۔ اگر آپ اپنے مطالعے کی شروعات ابتدا سے کرنا چاہتے ہیں تو جو آئندہ یا بندہ کی جلد ناشر سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جن لوگوں نے اس کو نہیں پڑھا ہے ان کے استفادے کے لیے، اور شاید ان کے لیے بھی جو پڑھ چکے ہیں، میں نے پہلے باب میں اپنی ابتدائی زندگی کے اہم واقعات کا خلاصہ اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

ان لوگوں میں جن سے میری واقفیت اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سبب یا اردو کے مطالعے کے دوران ہوئی، بہت سے لوگ اپنے اپنے شعبوں کے نامی گرامی لوگ ہیں لیکن اپنے شعبے کے باہر انھیں کوئی بمشکل ہی جانتا ہے۔ ان قارئین کے لیے جو برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ سے واقف ہیں، یہ وضاحت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہیری پولٹ (Harry Pollitt) یا پام دت (Palme Dutt) کون تھے۔ اسی طرح سے جو لوگ تھوڑا بہت بھی اردو ادب، اور ہندستان کی سیاسی تاریخ سے واقف ہیں ان سے کرشن چندر یا ذاکر حسین کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بہر صورت، دوسرے قارئین کے لیے ان کے تعارف کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے ہر ایک کا تعارف کرا کے ہر قسم کے قاری کی ضرورت کا خیال رکھا ہے۔ اشاریہ اہم اشخاص اور کلیدی موضوعات کو محیط ہے اور جہاں ضروری سمجھا وہاں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اس کہانی کو محیط وقت کے گزرنے کے بعد ان لوگوں پر کیا گزری۔ اس کے علاوہ میں نے حسب ضرورت یادداشتیں یا نوٹس بھی قلم بند کیے ہیں۔ یہ سب تمام قارئین کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوں گے، لیکن چونکہ یہ سوانح ایک کمیونسٹ کی سوانح ہے، اور اس کے قارئین میں کمیونسٹ، سابق کمیونسٹ اور مارکس اور لینن کے نظریے سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی شامل ہوں گے، یوں عین ممکن ہے کہ وہ میرے اخذ شدہ کچھ نتائج کے نظریاتی پس منظر کو جاننا چاہتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے لیے میں نے کتاب کے آخر میں حاشیے شامل کیے ہیں، جن میں سے چند خاصے طویل ہیں۔ میں نے ان پر عنوانات بھی قائم کر دیے ہیں تا کہ قارئین طے کر سکیں کہ وہ انھیں پڑھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ان لوگوں کی دلچسپی کے لیے جو ان موضوعات کو مزید تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں جن کا احاطہ میں نے اردو ادب اور اردو بولنے والوں کے باب میں کیا ہے، میں نے اپنی ویب سائٹ سے اٹھا کر ایک اقتباس شامل کیا ہے، جس کی نوعیت باقاعدہ کتابیات سے بڑھ کر معلوماتی ہے۔ آخر میں اپنی اس سوانح کے تیسرے اور غیر شائع شدہ حصے کا ایک اجمالی خاکہ بھی شامل کر رہا ہوں۔

اس جلد میں کتابیات شامل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو، اسلام اور جنوبی ایشیائی مسلمانوں پر میری کوئی خاص تحریر 1958 سے پہلے شائع نہیں ہوئی۔ لیکن میری بعد کی تحریروں میں مذکورہ موضوعات کا

احاطہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ کو ان سے دلچسپی ہے تو مطالعے کے لیے آپ میری ویب سائٹ www.ralphrussell.co.uk سے رجوع کر سکتے ہیں۔

کتاب کے سرورق سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ میں نے یہ کتاب 'میرین مولٹینو کے ساتھ' لکھی ہے۔ یہ الفاظ در حقیقت مجھے پہلی جلد پر بھی لکھنے چاہیے تھے۔ لکھنے میں میری ہچکچاہٹ کا سبب یہ تھا کہ میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ جن کتابوں پر ''مصنف الف، بہ تعاون ب'' تحریر ہوتا ہے، ان میں دراصل ب ہی نے بیشتر حصہ لکھا ہوتا ہے۔ یہاں یہ معاملہ نہیں ہے۔ تحریر میری اپنی ہے، اور میرین کا کام اس کی تدوین کرنا تھا۔ لیکن ان کی از حد دلچسپی کے باعث ہی یہ ممکن ہو سکا کہ میں کہانی کو اس طرح سے بیان کروں کہ وہ قارئین کے ایک بڑے حلقے کے لیے سودمند ہو سکے۔ اس کے سبب میرین کا رول بدل گیا اور اب جو یہ کتاب آپ کے سامنے ہے اس کو ہماری باہم مساعی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کو میرین نے ایک موقعے پر ایک جملے میں کچھ اس طرح سمیٹا: ''ایسا لگتا ہے کہ یہ خود نوشت بھی ہے اور سوانح بھی۔'' اس جلد کا بیشتر مواد ان بظاہر باہم غیر متعلق تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے جو میں نے اُس وقت، بالکل مختلف قارئین کے لیے لکھی تھیں۔ اگر میرین نشان دہی نہ کرتیں تو مجھے اکثر اوقات پتا ہی نہ چلتا کہ آج کے ان قارئین کے لیے قابل فہم بنانے کے لیے اس مواد میں کس طرح کی تبدیلی کی ضرورت ہے، جن میں سے اکثر اُس دور میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا اس پر انھوں نے مجھے زیادہ واضح فکر کے ساتھ سوچنے کی ترغیب دی اور مشورے دیے کہ میں نے جس طرح کی زندگی منتخب کی اس کو بہتر طریقے سے بیان کرنے کے کیا کیا طریقے ممکن ہیں۔ آخر میں انھوں نے مواد کو از سرِ نو ترتیب دیا جس کے سبب یہ کہانی قابل مطالعہ بن سکی۔

1

نجی اور سیاسی زندگی — 1933 سے 1946 تک

اگست 1945۔ کراچی سے لندن کی جانب اڑان بھرنے والے کھچا کھچ بھرے ڈکوٹا ایر کرافٹ میں مجھے نشست ملی۔ فوجی ٹکڑیاں دونوں جانب آمنے سامنے منھ کر کے بیٹھی تھیں اور ہمارے سفری تھیلوں کا انبار بیچوں بیچ لگا ہوا تھا۔ میرے تھیلے کے ساتھ کیلوں کی ایک بڑی ٹوکری بھی تھی جو میں نے تل ابیب کے سفری قیام کے دوران خریدی تھی۔ جنگ سے پہلے کیلے برطانیہ میں خوب ملتے تھے لیکن جنگ چھڑتے ہی ان کی سپلائی بند ہوگئی تھی، اور میں جانتا تھا کہ برطانیہ میں اب ایسے بہت سے چھوٹے بچے ہیں جنھوں نے کیلے کبھی نہیں دیکھے۔

جہاز نے رودبار انگلستان پار کیا۔ نیچے پھیلے ہوئے سبز میدانوں کا نظارہ سامنے تھا؛ ہندستان کے تڑختے ہوئے میدانوں کے مقابلے میں یہ حیرت انگیز حد تک سرسبز نظر آرہے تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ بلیک (Blake) نے انگلینڈ کو درست ہی ''سرسبز اور دلکش سرزمین'' (green and pleasant land) کہا ہے۔ ہمارا جہاز نیچے اترا، اور اپنے تھیلے اور کیلوں کی ٹوکری لیے میں انگلینڈ پہنچ گیا۔

جنگ ختم ہوچکی تھی۔ میں اب ستائیس برس کا تھا اور گذشتہ پانچ سال سے فوج میں تھا جہاں اس کی قطعی گنجائش نہیں کہ میں خود اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرسکوں کہ مجھے کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اب سب کچھ بدلنے والا تھا۔ واپس لوٹنے والے دوسرے لوگ 'گھر' کے بارے میں باتیں کر رہے تھے لیکن مجھے ان کی طرح ایسا کوئی خیال نہیں آتا تھا۔ میرے پیچھے امن کے دنوں کی ایسی کوئی

بالغانہ زندگی نہیں تھی — نہ کوئی گھر بار، نہ بیوی بچے، اور نہ کوئی منتخبہ کیریر۔ ہندستان میں ساڑھے تین سال کا عرصہ گزارنے کے بعد میرا مرکزِ ثقل بھی بدل چکا تھا۔

میرے نزدیک انگلینڈ واپس آنے کا مطلب تھا اپنے دوستوں، کمیونسٹ دوستوں، کے ساتھ اپنے رابطے پھر سے استوار کرنا۔ میں اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں، 1934 میں کمیونسٹ بن چکا تھا اور اس کے بعد کے تمام عرصے میں کمیونسٹ اعتقادات ہی میری زندگی میں مرکزی اہمیت کے حامل رہے تھے۔ میرا سیاسی شعور شدید قسم کے ایک ایسے روحانی بحران کا نتیجہ تھا جس سے میں چودہ برس کی عمر میں دوچار ہوا تھا۔ اس بحران کا محرک یہ احساس تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے ایک واضح اخلاقی ضابطے کی رہنمائی کے بغیر میرے لیے جینا دشوار ہے۔ لیکن یہ ذاتی بحران دراصل ایک وسیع تر سیاسی بحران کا بھی جزو تھا — ہزارہا لوگ زندگی کے مقصد کے بارے میں، اور اس بارے میں کہ ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کس طرح سے کی جائے، اسی قسم کے بنیادی سوال اٹھا رہے تھے۔ اس ذہنی دباؤ نے ہمارے اطراف میں پھیلی قابلِ نفرین عدم مساوات کو مزید واضح کر دیا تھا۔ جرمنی میں ہٹلر اقتدار میں آ چکا تھا اور فاشزم کا جوار اٹھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ مجھے ان لوگوں سے اشتراک کرنا چاہیے جو میری ہی طرح حالات سے آگاہ ہیں اور کچھ کر گزرنے کی کوششیں کر رہے ہیں، اور یوں میں اپنے بڑے بھائی ریکس (Rex) کے ساتھ وڈفرڈ (Woodford) میں واقع کمیونسٹ پارٹی کی مقامی شاخ میں شامل ہو گیا۔

میں اس وقت لندن کے شمال مشرق میں واقع ایسکس (Essex) کے ایک چھوٹے سے سرکاری اسکول چگویل (Chigwell) میں وظیفہ یافتہ طالب علم تھا۔ گو کہ میرے ساتھی طلبہ میں سے اکثر کا تعلق دولت مند دقیانوسی گھرانوں سے تھا — میرا معاملہ ایسا نہ تھا کیونکہ میرے والد منشی گیری کی (clerical) ملازمت میں تھے — تاہم میں نے ان کے ساتھ بخوبی نباہ لیا۔ ہمارے اطراف کی دنیا میں کیا کچھ واقع ہو رہا ہے، ہمیں اس کا کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ اب پارٹی میں اپنے دوستوں کے ذریعے، اور نئی طرح کی چیزیں پڑھ کر میرے سامنے دنیا کا ایک نیا ہی منظر کھل گیا، اور اس تجربے نے مجھ میں زبردست جوش بھر دیا۔ میں پہلی بار لوگوں کے ایک ایسے گروپ میں شامل ہوا تھا جو بالکل اسی

Scanned with CamScanner

طرح محسوس کرتے تھے جیسے میں محسوس کرتا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے بڑی تحریک ملتی تھی کہ برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہم لوگ، مردوں اور عورتوں کی ایک ایسی بین الاقوامی سپاہ کا محض ایک یونٹ ہیں جو تمام ممالک میں متحد ہو کر، جنس، رنگ، قومیت اور طبقاتی فرق کو بھول کر، عدل وانصاف پر قائم دنیا کی تعمیر کے لیے کام کر رہی ہے۔ میں خود کو ہمیشہ توانائی اور جوش سے معمور محسوس کرتا تھا۔ اپنی جھجک پر قابو پا کر، میں سڑکوں پر کھڑے ہو کر پارٹی کا روزنامہ ڈیلی ورکر بیچنے لگا۔ میں عوامی جلسوں سے خطاب کرنے لگا اور گھر گھر جا کر پرچار کرنے لگا۔ مجھے اس بات سے بھی بڑی تحریک ملتی تھی کہ ہماری مقامی شاخ میں شامل سب کامریڈ ایسے بالغ نوجوان ہیں جنھیں زندگی کا تجربہ میرے مقابلے میں کافی زیادہ تھا لیکن مجھے ان کے برابر کا تسلیم کیا جاتا تھا۔ انھی سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ پارٹی میں شامل تمام لوگ مکمل طور پر ایک دوسرے کے برابر ہیں، اور یہ بھی سیکھا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ناقدانہ طرزِ فکر اپنائیں اور اختلافِ رائے کی صورت میں ایک دوسرے سے اس وقت تک بحث کریں جب تک کہ اس موقف پر کوئی فیصلہ ناگزیر نہ ہو جائے، اور پھر اتفاقِ رائے کے بعد متحد ہو کر اس موقف کے لیے کام کرنا شروع کر دیں۔

جلد ہی وہ وقت آ گیا جب اسکول کے اربابِ اختیار کے ساتھ میرا تصادم ہو گیا جو کمیونسٹ خیالات کی تو بات ہی چھوڑیے، کشادہ خیالی تک کو تخریبی فعل مانتے تھے۔ میں نے اسکول کے لڑکوں میں سیاسی پمفلٹ فروخت کرنا شروع کیا تھا جس سے اسکول کے اربابِ اختیار خوفزدہ ہو گئے، لیکن ان کے معاندانہ رویے نے میری اشتمالی وابستگی کو توانا ہی کیا اور آخر میں ہیڈ ماسٹر مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کو رضامند ہو گیا۔ لاطینی اور یونانی ادب کا میں اس کا سب سے چہیتا شاگرد تھا (یہی دو مضامین تھے جن کو اسکول میں سب پر فوقیت حاصل تھی)۔ میں خوش اخلاق اور نرم مزاج تھا اور اپنے استادوں کے ساتھ میری ہمیشہ اچھی نبھتی تھی۔ انھیں میرے بھٹکے ہوئے سیاسی جوش پر افسوس تو تھا لیکن وہ اسے عموماً نظر انداز کر دیتے تھے۔

اکتوبر 1937 میں جب میں کلاسکس پڑھنے کے لیے وظیفہ لے کر کیمبرج میں داخل ہوا تو سیاسی سرگرمی میرے لیے مزید تحریک کا باعث بنی۔ میں نے نصابی کتب سے صرف اتنا ہی پڑھا جتنا پاس ہونے کے لیے ضروری تھا اور خود کو پوری طرح سے پارٹی کی طلبہ شاخ کے کاموں کے لیے وقف

Scanned with CamScanner

کردیا۔ فسطائیت اور جنگ کا خطرہ جیسے جیسے بڑھتا جاتا تھا، ہماری مصروفیتیں روز افزوں ہوتی جاتی تھیں۔ ہم پڑھتے تھے، بحثیں کرتے تھے اور طلبہ کو منظم کرنے کا کام کرتے تھے۔ اس وقت کے کیمبرج طلبہ پر ہم خاصا اثر رکھتے تھے۔ جلد ہی مجھے طلبہ میں قائدانہ حیثیت حاصل ہوگئی اور میرے جوش وخروش کے سبب لوگ محبت میں مجھے جارجی دمیتروف کی تقلید میں جارجی کہہ کر پکارنے لگے۔ جارجی دمیتروف (Georgi Dimitrov) وہ کمیونسٹ لیڈر تھا جس نے رائش سٹاگ (جرمن پارلیمنٹ Reichstag) میں آتش زنی کے مقدمے میں اپنا دفاع بڑی بہادری کے ساتھ خود کیا تھا۔ ہم جن مسائل سے نبرد آزما تھے ان کی اہمیت کے احساس نے اس برادرانہ تعلق کو مزید گہرا کردیا جو ہمارے مشترکہ موقف کے سبب پیدا ہوگیا تھا۔

وہ قارئین جن کا اشتراکی نظریات سے ذاتی طور پر کوئی قریبی تعلق نہیں رہا ہے، یا جو لوگ ان کے رابطے میں کافی بعد میں آئے، اس دور کے ذکر سے یہ جان سکیں گے کہ 1930 اور 1940 کے عشروں میں کمیونسٹ ہونے کا تجربہ کس قسم کا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی ہمیشہ سے ہی وفادار کارکنوں پر مشتمل ایک نسبتاً چھوٹی جماعت کے روپ میں دیکھی گئی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ ہم پارٹی کے مقاصد کے لیے وسیع پیمانے پر حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے، جس سے پارٹی کا حلقۂ اثر بھی بڑھے گا، لیکن ہم اسے لیبر پارٹی کی طرح ایک کھلی رکنیت والی پارٹی نہیں بنانا چاہتے تھے جس کے اراکین کی اس کے ساتھ وابستگی پارٹی کا کارڈ رکھنے اور رکنیت کی بقایا رقمیں ادا کرنے تک (وہ بھی اگر کوئی آکر وصول کرلے جائے تو) محدود تھی، لیکن جو بوقتِ ضرورت بھی سیاسی کاموں میں سرگرمی نہیں دکھاتے تھے۔ ہمارے نزدیک پارٹی ممبر ہونے کا مطلب تھا کہ ہم سچے دل سے اپنے مقاصد کے لیے خود کو وقف کردیں۔ میں، اور میری عمر کے ہزاروں لوگ جو دنیا کے تمام ممالک میں پھیلے ہوئے تھے، خود کو ایک دوسرے کے ساتھ اس مضبوط ڈور کے ساتھ بندھا ہوا محسوس کرتے تھے جو ہمیں تمام انسانوں کے ساتھ جوڑتی ہے — یہ ڈور ایک ایسی دنیا بنانے کی آرزو کی تھی جس میں جنگ، غریبی اور غیر انسانی استحصال کا خاتمہ ہوجائے۔ اس طرزِ فکر کی وجہ سے ہمارے اندر صحیح سمت کے مل جانے کا ایسا شدید احساس پیدا ہوا جس کا تقابل ہم دوسرے لوگوں کے اس تجربے سے بس تھوڑا بہت ہی کرسکتے ہیں جو انھیں روحانی یا مذہبی عقیدت سے حاصل ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

لیکن دوسرے معنوں میں اس مماثلت کی تلاش گمراہ کن ہے، کیونکہ اپنے موقف کے سبب ہم خود کو مذہبی شعار کی جکڑ بندیوں سے آزاد محسوس کرتے تھے۔ مارکسزم کسی مذہب کا نام نہ تھا بلکہ یہ تو دانشورانہ آلات کا ایک مجموعہ تھا۔ مارکس نے جس طرح یورپ کی تاریخ کا غیر معمولی بصیرت افروز تجزیہ کر کے ان تضادات و مسائل کو نشان زد کیا جو سرمایہ دارانہ سماجوں کا مقدر بن چکے تھے، اس نے ہم میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ تاریخ اب ہمارے ساتھ ہے۔ انقلاب کے بارے میں پہلے سے کچھ بھی طے نہیں کیا جاسکتا—انقلاب کے لیے حالات یقیناً سازگار ہو سکتے ہیں، لیکن ان حالات کو پہچاننا اور ان کے سبب پیدا ہونے والے مواقع کا فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہوگا۔ ایسے میں کمیونسٹ کے طور پر ہم جو بھی اقدام کرتے یا نہیں کرتے ہیں وہ بنیادی اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اپنے چاروں طرف بدلتی ہوئی دنیا کے مستقل تجزیے اور موزوں قدم اٹھانے کی اپنی ذمے داری کا ہمیں شدید احساس تھا۔ اس لیے جب ہم کوئی موقف طے کر لیتے تھے تو اس کے حصول لے لیے اپنی اجتماعی قوت لگا دینے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔

کیمبرج کے زمانے سے متعلق ایک اہم واقعہ میرے محبت میں گرفتار ہونے کا بھی ہے—یہ محبت مجھے کسی ساتھی طالبہ سے نہیں بلکہ یارک شائر کے ایک گاؤں کی رہنے والی عورت سے ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کی تعطیلات کے زمانے میں اپنے اخراجات ادا کرنے کے لیے میں مزدور عورتوں کے ساتھ کھیت میں آلو چننے کا کام کرتا تھا۔ وہیں مجھے میری (Marie) سے محبت ہوگئی۔ وہ شادی شدہ تھی لیکن اس کا شوہر ٹی بی کا مریض تھا جو اس وقت شفاخانے میں علاج کی غرض سے داخل تھا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ مجھے توقع تھی کہ اس کے انتقال کے بعد میری مجھ سے شادی کرے گی، اور کچھ عرصے تک میری کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ لیکن اپنے سیاسی کام کے لیے میں جس طرح سے وقف تھا اس سے میری ڈر گئی—وہ کسی ایسے شخص سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی جو اس کے مقابلے میں اپنی پارٹی کے تئیں زیادہ وفادار ہو۔ کچھ ہی دن کے بعد اس نے کسی دوسرے شخص سے دوستی کر لی۔

کیمبرج میں میرا آخری سال شروع ہونے کے ساتھ ہی جنگ کا اعلان ہوگیا، اور جیسے ہی میں گریجویٹ ہوا، فوج میں بھرتی لیے میرا بلاوا آگیا۔ جون 1940 میں برما پر جاپان کے حملے کے بعد

Scanned with CamScanner

مجھے جنوری 1942 میں ہندستان بھیج دیا گیا— یہ وہ تجربہ ہے جس نے میری زندگی کی ایک سمت طے کردی۔ بحیثیت کمیونسٹ میں نے کولونیل لوگوں کی آزادی کی تحریکوں کی ہمیشہ حمایت کی تھی، اور میں کیمبرج میں چند ایسے ہندستانی طلبہ کو جانتا تھا جن سے میں نے ہندستان کے مسائل کو مزید تفصیلات کے ساتھ سمجھا تھا۔ اب ہندستان پہنچ کر میں نے خود اپنی آنکھوں سے برطانوی فوجی افسروں کے خوف آگیں اور ناگوار خاطر رویوں کو دیکھا، اور بڑھتی ہوئی بے اطمینانی اور تناؤ کا مشاہدہ کیا، حالانکہ یہ مشاہدہ ایک فوجی یونٹ میں رہ کر، دور سے بالواسطہ کیا گیا تھا۔ میں چونکہ اپنے اطراف کے لوگوں کے متعلق جاننے میں غیر معمولی دلچسپی لیتا تھا، اس لیے میں اردو سیکھنے میں مشغول ہوگیا جو اس وقت ہندستانی افواج کی زبان تھی۔

ہماری کمپنی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی تھی۔ یہ آسام کے ایک دوردراز علاقے میں تعینات تھی جہاں برما کی سرحد کے قریب ایک شاہراہ بنائی جا رہی تھی— وہ سڑک جس کو آگے چل کر انگریزوں کے اس کام آنا تھا کہ وہ برما کو جاپانیوں کے قبضے سے واپس لے سکیں۔ جونیئر افسر کے طور پر میں اپنے یونٹ کے سو سپاہیوں کے دستے کا انچارج تھا (ہندستان کی فوجی اصطلاح میں Sepoy سب سے نچلے درجے کے فوجی کو کہتے ہیں)۔ یہ سب نئے رنگروٹ تھے جو زیادہ تر غریب کسان اور مزدور طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور فوج میں روزی کی مجبوری اور گزر بسر کے لیے شامل ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق دکنی ہندستان سے تھا اور میری ہی طرح اردو ان کی بھی زبان نہ تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ہندستان کے لوگ ایک دوسرے کی زبانیں بہ آسانی سیکھ لیتے ہیں۔ ٹرک سے سفر کرنے کے دوران میرے پاس جو فرصت کا وقت ہوتا تھا، یا اپنی باری کے انتظار کے لمحوں میں جو وقت ملتا تھا، میں اس میں سپاہیوں سے بات چیت کرتا تھا اور ان کی فوج میں شامل ہونے سے پہلے کی زندگی کے بارے میں جانکاری حاصل کرتا تھا۔ ایک انگریز افسر کا ان کے معاملات سے دلچسپی رکھنا ان کے لیے اتنی انہونی بات تھی کہ شروع میں ان کی بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا رویہ اختیار کریں۔ لیکن جب وہ مجھ پر اعتماد کرنا سیکھ گئے تو ہمارے درمیان ایک ایسا خاص ربط قائم ہوگیا جو باہر کی زندگی سے منقطع لوگ اپنے تجربات میں ایک دوسرے کو شریک کر کے قائم کرتے ہیں۔ ان میں سے چند لوگوں کے ساتھ ربط اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ میں نے اپنے سیاسی نظریات سے ان لوگوں کو آگاہ کیا اور ان کو

Scanned with CamScanner

اس پر آمادہ کیا کہ برطانوی حکومت کے خلاف جاری جدوجہدِ آزادی میں ہندستان کو درپیش مسائل پر گفتگو کریں۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب کرنے کے سبب میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوسکتا ہوں۔ جنگ کے زمانے میں کسی انگریز افسر کا ہندستان کی قومی تحریک کے لیے اپنے ہمدردی کے جذبات کو ہندستانیوں پر عیاں کرنے کا مطلب بلاشبہ ایک تخریبی عمل سمجھا جاتا۔ اپنے سپاہیوں سے ملنے جلنے کو بھی یقیناً شک کی نظر سے دیکھا جاتا، لیکن ہم لوگ جن حالات میں کام کرتے تھے ان کے سبب میں سپاہیوں کے ساتھ اپنی بڑھتی ہوئی قربت کے بارے میں محتاط رہنا سیکھ گیا تھا۔ ہم سڑک سے دور تھے اور بیشتر اوقات چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہ کر کام کرتے تھے۔ ہمارے یونٹ میں جو چند انگریز افسر شامل تھے وہ دو چار لفظوں سے زیادہ اردو نہ جانتے تھے۔ وہ احکامات انگریزی زبان میں دیتے اور سارجنٹ کے ہم پلہ ہندستانی فوجی ان کا ترجمہ کرتے تھے۔

اپنے یونٹ کے سپاہیوں کے ساتھ بڑھتی ہوئی قربت یوں تو ذاتی طور پر بھی میرے لیے سودمند تھی، لیکن میں اس کو اپنی سیاسی سرگرمی کا اہم حصہ سمجھتا تھا — اور یہی واحد کام تھا جو اُن حالات میں کرنا ممکن تھا۔ اپنی چھٹیوں کے دوران میں کلکتہ اور بمبئی اس غرض سے گیا کہ ہندستان کی کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکنوں سے رابطہ قائم کرسکوں۔ اس کام کے لیے میں نے ان لوگوں کو ذریعہ بنایا جن سے میں کیمبرج میں واقف ہوا تھا۔ میں نے اپنی چھٹیاں ان کے ہمراہ گزاریں اور واپسی میں اپنے ساتھ پارٹی کے اخبار پیپلز وار (People's War) اور اس کے متبادل دکنی زبانوں کے اخباروں کی کاپیاں لے کر آیا۔ سپاہیوں کے جس چھوٹے سے گروپ کے ساتھ میری قربت بڑھ گئی تھی انھوں نے یہ اخبار کمال دلچسپی سے پڑھے، اور ہم نے جنگ کے بارے میں، اور عالمی پیمانے پر جاری انصاف کے لیے عوام کی جدوجہد کے متعلق ان مضامین پر گفتگو کی جو ان اخباروں میں شائع ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان لوگوں نے اب اپنے اپنے لسانی گروہ کے سپاہیوں کے ساتھ اسی انداز میں بات چیت شروع کردی۔ مجھے بڑی امید تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ان میں سے کچھ سپاہی اپنے گھروں کو سیاسی کارکن کے طور پر لوٹیں گے۔

جنگ کے خاتمے پر میں خود کیا کروں گا، اس کے بارے میں میں نے ابھی سوچنا شروع نہیں

Scanned with CamScanner

کیا تھا۔لیکن مجھے معلوم تھا کہ لام ٹوٹنے میں ابھی شاید کئی ماہ کا عرصہ لگے گا۔اپنی باری کے انتظار میں بہت سے افسر اپنے اپنے برطانوی فوجی یونٹوں میں برطانیہ واپس لوٹ رہے تھے،لیکن میں نے طے کیا کہ میں دو مہینے کی چھٹی لے کر برطانیہ جاؤں گا اور پھر اپنے ہندستانی فوجی یونٹ میں واپس آؤں گا تاکہ جب لام توڑا جائے تو میں ہندستان میں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوسکوں۔ جب میں کیمبرج میں تھا تو میں نے پارٹی کا کل وقتی کارکن بننے کے امکان پر غور کیا تھا۔میں چاہتا اب بھی یہی تھا لیکن اس منصوبے کو کسی بھی طرح ہندستان سے منسلک کردینا چاہتا تھا۔میرا شمار ایسے معدودے چند برطانوی کمیونسٹوں میں کیا جاسکتا تھا جو ہندستان کے کامریڈوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی پوزیشن میں تھے— میں اردو بول سکتا تھا،سماج کی ہر سطح کے لوگوں کے ساتھ،ان کے سادہ ترین ماحول میں رہنے اور کام کرنے میں مجھے کوئی پریشانی نہ تھی،اور میں ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کو درپیش بہت سے مسائل خوب سمجھتا تھا۔شاید میں برطانوی اور ہندستانی پارٹیوں کے درمیان رابطے کا کام کرسکتا تھا؟

❊

گولڈرس گرین اسٹیشن (Golders Green Station) پر اتر کر میں اسٹیشن کے باہر کھڑی ایک بس میں سوار ہوگیا اور میں نے ایک پینی کا ٹکٹ مانگا۔کنڈکٹر نے بتایا،''اب ٹکٹ تین پینی میں آتا ہے۔''لوٹنے پر یہ میرا پہلا سبق تھا کہ میری غیر موجودگی میں چیزیں کس طرح بدل گئی ہیں۔

میں کیمبرج کے زمانے کے اپنے جگری دوست کرس فری مین (Chris Freeman) کے گھر کی طرف چل دیا۔ہم دونوں ہمیشہ ایک جان دو قالب کی طرح محسوس کرتے تھے اور ہر معاملے پر ایک دوسرے سے کھل کر بات کرتے تھے۔آخری خبر جو اس کے بارے میں مجھے ملی،یہ تھی کہ اس کا تقرر جرمنی میں ہوگیا تھا۔لیکن مجھے امید تھی کہ وہ بھی واپس آچکا ہوگا۔اگر وہ لوٹا نہ ہو تو بھی لندن میں اپنے قیام کے دوران میں اس کے گھر کو اپنا ٹھکانہ بنا سکتا تھا۔اس کی بیوی پیگوٹی (Peggotty) ہماری خصوصی قربت کو کشادہ دلی سے قبول کرتی تھی؛وہ مجھے اپنا مربی تسلیم کرتی تھی کیونکہ میں نے ہی ان دونوں کو ایسے وقت میں شادی کے لیے آمادہ کیا تھا جب وہ خود بھی اس بارے میں واضح طور سے کچھ طے نہیں کر پا رہے تھے۔

میں یہ جان کر بددل ہو گیا کہ کرس ابھی تک جرمنی ہی میں ہے اور امکان ہے کہ قابض فوجوں کے جز کے طور پر وہ ابھی وہیں رہے گا۔ تھوڑا عرصہ پہلے ہی وہ چھٹیاں گزار کر واپس لوٹا تھا (پیگوٹی اب حاملہ تھی) اور اس کی کوئی توقع نہیں تھی کہ وہ ماضی قریب میں جلدی واپس آئے گا۔ میں اس صورتِ حال میں صرف یہی کر سکتا تھا کہ اس کو خط لکھوں اور توقع ظاہر کروں کہ مناسب وقت پر اسے چھٹی ملے گی۔

اب میں نے دوسرے پرانے دوستوں کی تلاش شروع کی۔ جنگ نے ہم سب کو منتشر کر دیا تھا اور ان میں سے بہت سے ابھی تک فوج ہی میں تھے۔ ان میں سے کئی لوگ دہشت انگیز تجربات سے دوچار ہوئے تھے۔ ہم، جو ملک سے باہر تھے، اپنی اپنی طرح کی جنگوں سے برسرِ پیکار رہے تھے لیکن جو لوگ برطانیہ ہی میں رہ گئے تھے ان کا سابقہ ایک الگ ہی طرح کی جنگ سے پڑا تھا، جس کے بارے میں مجھے یا تو خطوں سے علم ہوا تھا یا پھر کبھی کبھار ملنے والے اخباروں سے۔ میں جنگ کے جس قسم کے زیادہ واضح اثرات دیکھنے کی توقع کر رہا تھا وہ فی الحقیقت اتنے واضح نہیں تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ لندن پر وسیع پیمانے پر بمباری ہوئی تھی، لیکن میں جن علاقوں سے گزرا وہ اس کی زد میں نہ آئے تھے، اس لیے میں نے اس بمباری کا کوئی اثر نہیں دیکھا۔ لندن کا ایسٹ اینڈ (East End) علاقہ اس بمباری سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ جنگ کے زمانے میں سخت کفایت شعاری (wartime austerity) کے جو اصول نافذ کیے گئے تھے وہ ابھی تک لاگو تھے — کپڑوں کا ملنا مشکل تھا، کوئی سامانِ آسائش نہ ملتا تھا (اعلیٰ طبقات ان محرومیوں سے متاثر نہ تھے، وہ اپنی ضرورت کی اشیا کسی نہ کسی طور فراہم کر لیتے تھے)، کتابیں چھوٹے چھاپے (type) میں اور تنگ حاشیے کی چھاپی جاتی تھیں تاکہ کاغذ کی بچت ہو۔ لیکن شمال مشرقی ہندستان کے دور دراز علاقوں میں میں نے جس قسم کے فوجی حالات میں گزری تھی اس کی وجہ سے مجھے یہاں کی دقتوں کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔

برما کی جنگ کے دوران فوجی زندگی کے محر... بھرے حالات سے مجھے ایک الگ ہی قسم کی میراث ملی تھی — مجھے جلد کی ایک عجیب وغریب بیماری لگ گئی تھی اور میری ٹانگوں میں ایسے زخم ہو گئے تھے جو ٹھیک نہ ہوتے تھے۔ ہندستان میں قیام کے آخری چند مہینے میں نے اسپتالوں میں گزارے،

Scanned with CamScanner

یہاں تک کہ فوجی اسپتال کے ڈاکٹروں نے بھی ہاتھ اٹھا لیے اور کہا کہ علاج کے لیے لندن لوٹ جاؤں۔ ان زخموں میں زیادہ تکلیف تو نہ تھی لیکن پٹیاں بدلنے کا عمل تھکانے والا تھا۔ مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک یہ مرض ٹھیک نہیں ہو جاتا، میری ہندستان واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے لندن واپس لوٹنے کے بعد ہندستان کے ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق میں لندن کے ٹراپیکل امراض کے اسپتال گیا۔ وہ بھی مرض کی شناخت نہ کر سکے اور یہ کہہ کر مجھے واپس بھیج دیا گیا کہ جلد کے بہتر ہونے کا انتظار کروں۔

اس دوران میں یہ چاہتا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی میں سینئر لوگوں سے ملاقات کر کے اپنے مستقبل کا منصوبہ طے کرلوں۔ اس لیے میں پارٹی کے ہیڈکوارٹر، کوونٹ گارڈن (Covent Garden) جا پہنچا۔ حالانکہ گذشتہ گیارہ برس سے میں کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس کے آفس آیا تھا، لیکن مجھے کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں ہوئی — آخر تو ہم سب کامریڈ ہی تھے، مرتبے میں سب کے سب یکساں۔ پارٹی کے لیے کل وقتی کارکن کے طور پر کام کرنے کا خیال میرے لیے جوش انگیز تھا۔ اس بات کا مجھے بدیہی طور پر احساس تھا کہ پارٹی کے کل وقتی کارکنوں اور لیڈروں میں نظریاتی وفاداری، فہم وفراست اور اعلیٰ درجے کی وابستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور ان کی صف میں شامل ہونا میرے لیے فخر کا باعث ہوگا۔ یہ بات درست ہے کہ ماضی میں لیڈروں نے ایسی پالیسیاں تجویز کی تھیں جن کی میں نے مخالفت کی، اور ان کے کاموں — یا بے عملی — کا بھی میں نکتہ چیں تھا، لیکن اس کی وجہ سے میرے ذہن میں پارٹی کی مجموعی تصویر پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ پارٹی میں چند لوگ جن سے میں نجی طور پر واقف تھا، وہ تھے جن کا پارٹی کی طلبہ شاخوں سے اس زمانے سے ربط تھا جب میں کیمبرج برانچ چلا رہا تھا۔ یہ تھے جیک کوہین (Jack Cohen) اور جیمز کلگ مان (James Klugman)۔ جیک، جو کنگ اسٹریٹ میں رہتا تھا، طلبہ کی تنظیم کاری کرتا تھا، اور جیمز کلگمان طلبہ کی بین الاقوامی تنظیم کا ایک اہم لیڈر تھا۔ میں دونوں کو پسند کرتا تھا اور ان کا معترف تھا۔ جیمز سے میں خصوصی طور پر متاثر تھا کیونکہ بین الاقوامی تحریک میں اہم درجے پر ہونے کے باوجود وہ اپنے اس تجربے کی اہمیت نہیں جتاتا تھا۔

پارٹی کے دوسرے اہم اور سینئر رہنماؤں کے ساتھ میرا کوئی براہِ راست تعلق نہ تھا۔ البتہ میں

Scanned with CamScanner

نے ان کی بیشتر تحریریں پڑھ رکھی تھیں۔ میں نے پارٹی کے جنرل سکریٹری ہیری پولٹ (Harry Pollitt) اور نیشنل ایگزیکٹو کے دوسرے اراکین کی تقریریں پارٹی کانگریسوں میں سنی تھیں؛ اور ان میں سے ایک لیڈر جان گولان (John Gollan) کو کیمبرج میں ایک میٹنگ سے، جو ہم نے منعقد کی تھی، خطاب کرنے کے لیے بھی مدعو کیا تھا۔ لیکن کمیونسٹ عقائد اور اصولوں کے لیے ان کی وفاداری کو میں قابل اعتنا نہ سمجھتا تھا، اور ان کے بارے میں مجھے جتنی باتیں معلوم ہوئی تھیں وہ سب میرے ذہن میں پہلے سے بنی تصویر پر پوری اترتی تھیں۔ پولٹ جو 1929 میں اتفاقِ رائے سے پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے تھے، غریب مزدور طبقے کا کلاسک پس منظر رکھتے تھے۔ انھوں نے لنکا شائر کی کپڑا ملوں کے ایک گاؤں میں پرورش پائی تھی۔ ان کی ماں پارچہ بافی کا کام کرتی تھیں اور باپ ایک لوہار کی دکان میں ضرب لگانے کا کام کرتے تھے۔ ہیری کو بارہ برس کی عمر میں کام پر جانا پڑا تو ان کی باضابطہ تعلیم ختم ہوگئی۔ وہ ایک موثر ٹریڈ یونینسٹ بن گئے اور ٹریڈ یونین تحریک میں بہت بلندیوں کو پہنچ جاتے اگر انھوں نے کمیونزم سے اپنی وفاداریاں ختم کرلی ہوتیں۔ لیکن ہیری نے ایسا کیا نہیں۔ رجنی پام دت میں بھی، جن سے ملاقات کر کے میں اپنے منصوبے پر بات کرنا چاہتا تھا، اسی قسم کے وفاداری دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ پارٹی کے کولونیل ڈپارٹمنٹ کے سربراہ تھے اور ہندستان کے معاملات کے ماہر بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں دت کی نیک نامی سے مرعوب تھا۔ ان کے باپ ہندستانی تھے اور ماں سویڈش۔ پہلی جنگِ عظیم 1914-1918 کے دوران وہ آکسفرڈ کے ایک ہونہار طالبِ علم تھے جس نے اپنے فائنل امتحان میں بے مثال چودہ الفا گریڈ حاصل کیے۔ وہ اپنی اعلیٰ ترین اکاڈمک کامیابیاں جاری رکھ سکتے تھے لیکن اس کے بجائے انھوں نے بھی کمیونسٹ مقاصد کے لیے خود کو وقف کردیا۔ ہندستان کی قومی جدوجہد میں، اور اس جدوجہد میں ہندستانی کمیونسٹوں نے جو رول ادا کیا اس میں بھی، دت کا تعاون نمایاں ہے۔ 1940 میں شائع ہونے والی ان کی کتاب انڈیا ٹوڈے (India Today) برطانوی حکومت اور قومی آزادی کے لیے پنپنے والی تحریکوں کا نہایت عمدہ تجزیہ ہے جسے برطانوی اور ہندستانی کمیونسٹ یکساں طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ 1942 میں ہندستان جاتے وقت پانی کے جہاز پر میں اس کتاب کو پڑھ چکا تھا اور ہندستان کے مسائل کو سمجھنے میں اسے میں نے بے حد معاون پایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دت کی کتاب

Scanned with CamScanner

پڑھ کر، اس کے زیرِ اثر ہی بہت سے برطانوی کمیونسٹوں نے ہندستان کی ٹریڈ یونین تحریک کے قیام میں سرگرم حصہ لیا۔[1]

میں کنگ اسٹریٹ آفس پہنچا تو مجھے مائیکل کیرٹ (Michael Carritt) کے پاس بھیجا گیا جو کولونیل ڈپارٹمنٹ میں دت کا معاون تھا۔ 1920 اور 1930 کی دہائی میں مائیکل دس برسوں تک خود بھی ہندستان میں رہا تھا، اور وہاں انگریزوں کے طرزِ حکومت کو دیکھنے کے سبب وہ کمیونسٹ بنا۔ اسی لیے وہ اس سیاق میں بہت سی باتیں جانتا تھا۔ مائیکل نے مجھے بتایا کہ خوبیِ قسمت سے ہندستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک بزرگ رہنما، ڈانگے، اب لندن میں مقیم ہیں۔ وہ ہندستان کی انقلابی ٹریڈ یونین تحریک کے بانی تھے، اور اب برطانوی پارٹی میں اپنی پارٹی کے 'سفیر' جیسی حیثیت میں مقیم تھے۔ یوں مائیکل نے پام دت اور ڈانگے دونوں کے ساتھ میری ملاقات کا اہتمام کیا۔

ان دونوں نے میرے منصوبے کو سنا، اور یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ انھوں نے اسے بلا تامل قبول کر لیا۔ یہ سب آناً فاناً اور بغیر کسی الجھاوے کے طے پا گیا۔ میرا مستقبل طے ہو چکا تھا، اور وہ بھی اس طرح کہ اس سے بہتر کا میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان خاص لوگوں کی صف میں شامل ہونے والا تھا جو اس موقف کے کل وقتی کارکن تھے — وہ بھی ہندستان میں۔

---

[1] ان میں سب سے معروف نام بین براڈلی (Ben Bradley) کا ہے جس پر بدنامِ زمانہ میرٹھ سازش کیس میں اپنے کمیونسٹ ساتھیوں کے ساتھ مقدمہ چلا۔ یہ مقدمہ 1924 اور 1933 کے درمیان چلتا رہا اور اس میں اس کو دس سال کی کالے پانی کی سزا ہوئی۔ اپیل میں ان سب کی سزاؤں میں کافی تخفیف کی گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

2

گھر واپسی؟ محتاط روابط

میرے لیے وہ مقام جسے لوگ 'گھر' سے تعبیر کرتے ہیں، ہوم آن اسپالڈنگ مور (Holme on Spalding Moor) گاؤں تھا جو ایسٹ یارک شائر کی سپاٹ اور نیچی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ بچپن کے کچھ ابتدائی برس میں نے یہاں گزارے تھے، اور بعد میں بھی اکثر یہاں آتا رہا تھا۔ میرے والدین یہیں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے اور میرا بھائی ریکس اور اس کی بیوی فراؤڈ جنگ شروع ہونے کے بعد یہیں آکر بس گئے تھے۔ ریکس کے فوج میں بھرتی کے بلاوے سے پہلے وہ یہاں کھیت مزدوری کرتے تھے۔ یہیں میں اپنی گرمیوں کی تعطیلات کھیت سے آلو چننے کا کام کر کے گزارتا تھا تا کہ اپنا خرچ ادا کر سکوں۔

میرے اپنے گھر والوں سے آخری ملاقات کے بعد سے اب تک بہت سے واقعات ان پر گزر چکے تھے۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور میرا چھوٹا بھائی ولفریڈ (Wilfred) جنگ کے خاتمے سے صرف چھ ماہ پہلے فرانس میں مار گرا لیا گیا تھا۔ میرا سب سے بڑا بھائی نوئیل (Noel) ایئر فورس میں کناڈا میں تعینات رہ چکا تھا۔ وہ اب لندن واپس آچکا تھا لیکن فی الحال میرا اس سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سیاسی طور پر ہمارے نظریات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ ریکس کے ساتھ میری سب سے زیادہ قربت تھی۔ وہ اب بھی بحری فوج میں تھا لیکن فراؤڈ اپنی ایک برس کی بیٹی کلیٹا (Kleta) کے ساتھ ہوم ہی میں تھی۔

Scanned with CamScanner

اب چونکہ لندن میں رکنے کو کچھ اور مشغلہ نہ تھا اس لیے میں ریکس سے ملنے پلی متھ (Plymouth) کے لیے نکل کھڑا ہوا جہاں اس کا یونٹ مقیم تھا۔ اس کے بعد میرا ارادہ ہوم (Holme) جانے کا تھا۔ جنگ کے بعد کے ان دنوں ٹرین سے سفر کرنا اپنے آپ میں ایک تجربہ تھا۔ بمباری کی وجہ سے ہونے والا انخلا گوکہ اب رک چکا تھا تاہم ریلیں اب بھی کھچا کھچ بھری ملتی تھیں۔ مسلح افواج کے ہزاروں لوگ جہاں تہاں بھیجے جاتے تھے، یا وہ میری طرح، چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے اور مفت سفر کیا کرتے تھے۔ لگتا تھا گویا شہریوں کی بھی آدھی آبادی بکھری ہوئی پرانی زندگی کے ٹکڑوں کو سمیٹنے کے لیے اور نئے ٹکڑوں کی تلاش میں محوِ سفر ہو۔ ریل میں داخل ہونے کی گنجائش نکالنے کے لیے بڑی ہمت درکار تھی، عموماً کوریڈور میں کھڑے ہونا پڑتا تھا جہاں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ جلد ہی میں نے سیکھ لیا کہ اگر میں ریل کے اگلے سرے پر پہنچ جاؤں تو پھر عموماً دھکا مکی کر کے ریل میں گھس سکتا تھا۔

چار برس کی میری غیر حاضری میں ہوم ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ یہ اب بھی بنیادی طور پر زرعی گاؤں تھا، لیکن اتنا بڑا ضرور تھا کہ اس میں ایک اسٹیشن تھا اور سیلبی اور یارک کے قصبوں سے جوڑنے والی بس سروس بھی مہیا تھی۔ یہاں کی دونوں شاہراہوں کے ساتھ ساتھ گھروں کا سلسلہ چلتا چلا گیا تھا۔ یہاں چند شراب خانے، چند دکانیں، ایک چرچ اور ایک ایلیمنٹری اسکول تھا جہاں میں نے ابتدائی چند برس کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس سے پرے وہ کھیت تھے جہاں میں مزدور عورتوں کے ایک گروہ کے ساتھ کام کرتا تھا اور جہاں میں اپنی محبوبہ میری سے ملا تھا۔ مجھے ابھی تک یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں اس سے اب بھی محبت کرتا ہوں، لیکن وہ شادی کر کے کہیں اور جا بسی تھی، اور اب اس کے بچے بھی تھے۔ میں جانتا تھا اب اس سے رابطہ قائم کرنا مناسب نہ ہوگا۔

میں نے اپنا مرکز اولڈ روڈ (Old Road) پر واقع اپنی ماں کے مکان کو بنایا جو گاؤں کے مرکز کے قریب تھا۔ ماں کے ساتھ میری کوئی قربت نہیں تھی اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ انھوں نے بھی ہم لڑکوں سے کبھی کوئی خصوصی دلچسپی رکھی ہو۔ سب سے چھوٹا ولفریڈ البتہ اس سے مستثنیٰ تھا، جس کو اب وہ کھو چکی تھیں۔ میں ہندستان سے ان کو فرض شناسی کے ساتھ خط لکھتا تھا، لیکن زیادہ نہیں، اور اس کی بھی کوئی توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ اس بات کو سمجھیں گی کہ میں کس جذبے سے ایسا کرتا ہوں۔ میرے

Scanned with CamScanner

طرزِ فکر کے مطابق، صرف میرے کامریڈ ہی تھے جن سے میں قربت محسوس کرتا تھا، ہمارے مشترکہ عقائد اتفاقی رشتے داری کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط رشتے کے حامل تھے۔ ماں کا نام ملی (Milly) تھا اور ہم اکثر نام لے کر ہی ان کے بارے میں بات کرتے تھے۔ گھر چلانے کے معاملے میں وہ بڑی بے پروا قسم کی عورت تھیں، اس لیے ہم نے اپنا بچپن جس مکان میں گزارا وہاں گھریلو ماحول جیسی کوئی شے کبھی نہیں رہی۔

اب ملی کے پاس واپس لوٹا تو جلد ہی میں ان کی اپنی بات کو دہرانے کی عادت سے چڑنے لگا — ان کو عادت تھی کہ وہ کوئی ایک بات کہتیں، اور فوراً ہی دوبارہ کہتیں، بالکل انھی الفاظ میں۔ گھر میں بے ترتیبی جو وہ پھیلاتیں، اس سے بھی مجھے جھلاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں نے ڈائری لکھنی شروع کردی — ''حسبِ معمول اس جگہ پر بے بسی کے احساس سے مغلوب ہوں۔ وہ برتن دھونے کا کمرہ صاف کرتی رہتی ہیں۔ کوئی بمشکل ہی یہاں سے گزر سکتا ہے، پڑھنے کے لیے بیٹھنے کی جگہ پانے کی بات تو جانے ہی دیں۔''

فراوڈ کا گھر کہیں زیادہ آرام دہ تھا۔ یہ گاؤں سے باہر دو کلومیٹر کی دوری پر بنی البیریز کاٹجز (Allberies Cotteges) میں، ایک دوسرے سے جزوی طور پر الگ دو کٹیاؤں پر مشتمل تھا جو سڑک سے ہٹ کر خاصی سنسان جگہ پر بنائی گئی تھیں۔ میری سائیکل ابھی تک ہوم ہی میں تھی، اور یوں میں ہر روز سائیکل سے فراوڈ کے گھر تک جاتا تھا۔ اس کا سیاسی نقطۂ نظر ریکس کے اور میرے نظریے جیسا تھا، اس لیے باتیں کرنے کو ہمارے پاس بہت مواد تھا۔ جنگ کے دوران بھی ہم ایک دوسرے کو اکثر خط لکھتے تھے — وہ میرے لیے ایسا ہوم بیس (home base) تھی جو دوسروں کی خبریں مجھ تک اور میری خبریں ان تک پہنچانے کا کام کرتی تھی۔

میرے والد کے انتقال کے بعد ملی نے اپنی چھوٹی بہن، غیر شادی شدہ آنٹی ٹاٹس (Tats) کو اپنے ساتھ گھر میں رہنے کو بلا لیا تھا۔ جب ہم چھوٹے تھے تو آنٹی ٹاٹس ہماری دیکھ بھال کرتی تھیں، اور سچ مچ ہمارا بہت خیال رکھتی تھیں، اس لیے مجھے ماں کے مقابلے میں ان سے زیادہ انسیت تھی۔ لیکن یہ چونکہ بنیادی طور پر ملی کا گھر تھا اس لیے وہ ٹاٹس کو یہ بات بھولنے نہیں دیتی تھیں کہ اس گھر کی اصل انچارج کون ہے۔ ان جھلاہٹ بھرے احساسات سے چھٹکارا پانے کے لیے میں نے

اپنی کتابیں چھانٹنے کے شغل میں پناہ لی، جو میں فوج میں جانے سے قبل اولڈ روڈ پر چھوڑ گیا تھا۔ ایک بار پھر سے یہ دیکھنے کا موقع ملنے پر میں خوش تھا کہ ان کتابوں میں کیا ہے، لیکن گھر کے ماحول کے بارے میں کچھ کہنا ہی بیکار ہے، جو سکون سے پڑھنے کے لیے بالکل ناموزوں تھا۔

میری جھلاہٹ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ میری ماں ایک ذی فہم عورت ہیں، لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی دانش کا کوئی استعمال ہی نہیں کرتیں۔ ایک زمانے میں ان کے پاس ایک ورک ہاؤس کی منتظمہ کی ذمے دارانہ ملازمت تھی، جہاں میرے والد منتظم کی حیثیت سے اس وقت تک ملازم تھے جب تک کہ کسی مالی بدعنوانی کے الزام میں، جس پر ہمارے سامنے کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی، انھیں ملازمت سے علیحدہ نہیں کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ماں کو بھی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے، اور اس ذمے داری اور حیثیت کے زیاں کے احساس سے وہ کبھی باہر نہ آ سکیں۔ وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتیں کہ ہمارے اطراف میں جو لوگ رہتے ہیں ہم واقعتاً ان سے اعلیٰ طبقے کے ہیں۔ ان کے اس خیال کا پُر زور حامی نوئیل بھی تھا۔ ہم میں سب سے بڑا ہونے کے سبب پرانے اچھے دن اسے یاد تھے۔

میں اپنے کاموں میں مشغول تھا اور مجھے ایسا خیال کبھی نہیں آیا کہ اپنی ماں کے نقطۂ نظر سے چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ گذشتہ دو برسوں میں وہ اپنے شوہر اور ولفریڈ کو کھو چکی تھیں، جو ہم لڑکوں میں واحد تھا جس سے وہ میرے خیال میں سچ مچ بہت محبت کرتی تھیں۔ میرے والد کے گزر جانے کے بعد وہ پریشانیوں میں گھر گئی تھیں کیونکہ گاؤں کے حالات میں گھر چلانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ مجھے انھوں نے ساڑھے تین سال سے نہیں دیکھا تھا۔ کیا ان کے لیے اس کا کوئی مطلب تھا کہ میں یہاں آ چکا ہوں؟ اگر تھا تو ان کے کسی رویے سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

میں یہاں سے بچ کر بیورلی (Beverley) کے قریبی قصبے میں دوستوں سے ملنے چلا گیا— گرٹی (Gertie) جو میری کی بڑی بہن تھی، اور چار سال پہلے گرٹی اور اس کے اہل خانہ سے میری اس وقت جان پہچان ہوئی تھی جب میرا فوجی یونٹ بیورلی میں متعین تھا۔ میں ملاقات کے لیے پہنچا تو اس گھر میں گرم جوشی سے میرا استقبال کیا گیا۔ یہ ایک سادہ لوح مزدور طبقے کا خاندان تھا جس میں کسی طرح کی نمود و نمائش نہ تھی اور ان کے ساتھ خوشگوار وقت گزرتا تھا۔ ان میں کوئی خاص سیاسی شعور نہ تھا،

Scanned with CamScanner

اور پارٹی کا اخبار خریدنے کی جانب انھیں راغب کر کے میں نے اس کا مداوا کرنا چاہا۔ انھوں نے اخبار خریدنا شروع کیا اور اسے پسند بھی کیا۔ آخری بار میں جب ان سے ملا تھا تو گرٹی کی بیٹی باربرا ایک بچی تھی۔ اب وہ سولہ برس کی تھی، زندہ دل اور پُرکشش، اور اس نے یہ اشارہ بھی دے دیا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ فوج کے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی عورتوں کی قربت سے برسوں تک محروم رہا تھا، اس لیے چومنے چمٹنے کے رشتے سے میں بہت خوش تھا، لیکن کمٹ منٹ کا کوئی خیال دل میں لائے بغیر — کیونکہ میں ہندستان واپسی کے خیالات میں محو تھا۔

گاؤں کی زندگی مجھے بوجھ لگنے لگی اور میں لندن لوٹ گیا۔ اب گرٹی اور باربرا مجھے خط لکھتی تھیں۔ باربرا کے پرجوش خطوں سے مجھے یہ اندازہ تھا کہ وہ میری واپسی کے لیے پرامید تھی:

اگر تم ابھی ہمارے کچن میں ہوتے تو اسٹیفن کو کسی احمق کی طرح کودتے پھاندتے دیکھتے، رونالڈ کو کامکس پڑھنے کی کوشش کرتے اور 'شراپ اور اسٹیفن' چیخ کر کہتے ہوئے سنتے۔ اور دیکھو میری مام اور ڈیڈ پکچر دیکھنے جانے کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ تم تصور کر سکتے ہو کہ کتنی خاموشی اور سکون ہے۔ اوہ، مزید یہ کہ معاملہ نمٹانے کو سارے کپڑے یہاں کچن میں لٹکے ہوئے ہیں۔ آج رات ہم سب لوگ غسل کریں گے، سوائے میری مام کے۔ سو دیکھو، تم کس چیز سے محروم ہو رہے ہو۔ [یہ غسل تانبے کے ٹب میں لیا جاتا تھا جو آگ کے سامنے آتشدان والے قالین پر رکھا ہوتا تھا۔]

میرا مصلحانہ جوش گرٹی کے نجی معاملات تک جا پہنچا — اس نے مجھے لکھا کہ وہ پریشان ہے کیونکہ اس کی ماہواری کی تاریخ نکل چکی ہے۔ اپنے طبقے کی دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی شاید مانع حمل طریقوں کے استعمال کو غلط سمجھتی تھی — حمل سے بچنے کی امید وہ اس سے رکھتی تھیں کہ سیکس کم کیا جائے اور ان کا پارٹنر بروقت 'باہر کھینچ لے'۔ اگر یہ احتیاطی تدبیر کام نہیں آتی تو پھر مشکل میں پھنسنا لازمی ہے۔ اسقاط غیر قانونی تھا اور اسی وجہ سے خطرناک بھی، کیونکہ یہ اکثر غیر صحت بخش حالات میں کیا جاتا تھا۔ میں اس بات سے متاثر ہوا کہ گرٹی اپنے راز میں مجھے شریک کر رہی ہے اور میں فوری طور پر اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ جب میں اپنے بھائی نوئیل سے ملا جو فزیوتھیراپسٹ تھا اور تھوڑا سا علم دواؤں کا بھی رکھتا تھا، تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اس سلسلے میں گرٹی کی کوئی مدد کر سکتا ہے کہ اسقاط

Scanned with CamScanner

کرانے کے لیے وہ کیا کرے۔ میرا یہ پوچھنا اسے اچھا تو نہیں لگا لیکن مجھے اس نے گرٹی کے لیے کچھ ہدایات دیں۔ اس وقت تک گرٹی کا حیض جاری ہو گیا تھا، لیکن چونکہ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ پھر سے اس مصیبت میں نہ پڑ جائے اس لیے میں نے اس کو لکھا کہ وہ ضبطِ تولید کے لیے کچھ کرے، اور شیفیلڈ (Sheffield) کے ایک کلینک کا پتا بھی لکھ کر بھیج دیا۔ اس نے جواب دیا کہ جانا شاید ممکن نہ ہوگا کیونکہ اس کے شوہر کو یہ پسند نہیں۔ اس نے لکھا، ''لیکن، دیکھا جائے گا۔''

لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ گاؤں میں لوگ کیسے رہتے ہیں۔ گرٹی جب اپنی بہنوں سے ملنے ہوم گئی تو واپسی پر ان کے بارے میں اس نے مجھے لکھا:

> انھوں نے میرا استقبال ان لفظوں سے کیا، ''اوہ، تم شیفیلڈ کے کلینک جا رہی ہو، اور چودہ دن اوپر ہو چکے ہیں، اور تم حد سے زیادہ پریشان ہو۔'' میں جانتی ہوں یہ بالکل رالف کا انداز ہے، لیکن میں چاہتی تھی کہ میرے رشتے داروں کو میرے معاملات کا علم نہ ہو۔

مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے ان سے اس بارے میں بات کی ہو، لیکن ضرور کی ہوگی؛ اور مجھے اس سلسلے میں زیادہ محتاط ہونا چاہیے تھا۔

اسپتال اور فوج سے جواب ملنے کے انتظار کے خالی وقت میں میں اپنے سیاسی روابط کی تلاش میں مشغول ہو گیا۔ برطانیہ سے میری غیر حاضری کے دوران یہاں زبردست تبدیلیاں واقع ہوتی رہی تھیں۔ جنگ کا ایک اثر یہ پڑا تھا کہ شہریوں کے تئیں ذمے داری کے معاملے میں حکومت کے رویے میں ایک بڑی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ سب اس بات کو مانتے تھے کہ جینے کے بنیادی معیارات کو یقینی بنانے کے لیے حکومت کو اب زیادہ سرگرمی سے کام کرنا ہوگا۔ یہ احساس سبھی پارٹیوں کو تھا — یہ جنگ کے دور کی اتحادی حکومت تھی جس نے 1944 کا تعلیمی ایکٹ متعارف کرایا تھا اور وہ منصوبہ تیار کیا تھا جسے آج نیشنل ہیلتھ سروس کہتے ہیں۔ لیبر پارٹی کی نو منتخبہ حکومت کو ایک پلیٹ فارم مہیا ہو گیا تھا اور اس نے کلیدی صنعتوں کو قومیانے کا عمل اور بمباری میں متاثر ہونے والے مکانوں کو بنوانے وغیرہ کا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ سب خوش آئند تبدیلیاں تھیں لیکن ہم کمیونسٹوں پر یہ بات پوری طرح عیاں تھی (گو بدقسمتی سے لیبر پارٹی کے حامیوں کو اس کا احساس نہیں تھا) کہ لیبر حکومت ایسا کوئی قدم نہیں

Scanned with CamScanner

اٹھائے گی جس سے موجودہ سماجی نظام کو کسی طرح کا خطرہ پیدا ہو۔

اشتراکیت کے لیے بھی ماحول جنگ سے پہلے کے ماحول کے مقابلے میں زیادہ سازگار ہو گیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مغربی اتحادیوں کے اپنے وعدے کے مطابق دوسرا محاذِ جنگ کھولنے کے لیے تیار ہونے سے پہلے سوویت یونین نے تن تنہا جس طرح جرمن حملوں کا مقابلہ کیا تھا اس کو دیکھ کر بہت سے لوگ سوویت یونین کے معترف ہو گئے تھے۔ جو لوگ بھی ہفتہ وار رپورٹیں پڑھتے تھے کہ اسٹالن گراڈ یا لینن گراڈ کا دفاع کس قدر بہادری کے ساتھ کیا جا رہا ہے، وہ اس میں کوئی شبہ نہ کر سکتے تھے کہ سوویت لوگ جانتے ہیں کہ ان کے پاس حفاظت کے قابل چیزیں ہیں۔ یہ سمجھنے کے لیے صرف اتنا ہی کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ آج کی صورتِ حال کا مقابلہ پہلی جنگِ عظیم سے کرتے جس میں فوجیوں کے جتھے کے جتھے محاذ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مغربی پریس کی پیش کردہ اس تصویر پر اعتراض کرنے شروع کر دیے کہ سوویت نظام میں ہر آدمی پریشانیوں کا شکار ہے۔ اب اس کی مثبت کامیابیوں کے بارے میں جاننے کا زیادہ کشادہ رویہ صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

بین الاقوامی سطح پر یہ وقت پیہم تغیر کا تھا جس میں معاملات بہت سی سمتوں میں جاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں قائم ہونے والے اتحاد سے، جس کی علامت 1943 میں چرچل، روزویلٹ اور اسٹالن کے مابین منعقدہ تہران کانفرنس تھی، یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب مغربی اتحادیوں اور سوویت یونین کے درمیان بہتر رشتوں کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ بڑے پیمانے پر لوگ یہ یقین کرنے لگے تھے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد مغربی قوتوں کا کمیونزم کے تئیں رویہ نسبتاً کم معاندانہ ہو جائے گا، بلکہ یہ بھی سوچا جا رہا تھا کہ امن کے دور میں بھی یہ اتحاد باقی رہے گا۔ اس نظریے کی پرزور حمایت امریکی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری ارل براوڈر (Earl Browder) نے اپنے ایک کتابچے تہران اور اس کے بعد (Tehran and After) میں کی تھی۔ کمیونسٹ حلقوں میں اس کتاب پر خوب بحث ہوئی تھی۔ میں نے خود اس کو ہندستان میں پڑھا تھا، اور اس کی پیش گوئی کا بڑا پر جوش حامی تھا۔ لیکن کچھ متضاد اشارے بھی مل رہے تھے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دوسرے محاذ کے اجرا میں برطانیہ اور امریکہ کی جانب سے تاخیر کا مقصد دراصل جنگ کا سارا بوجھ سوویت یونین پر ڈالنا تھا تاکہ اس سے وہ کمزور پڑ جائے — اور ہمیں بعد میں پتا بھی

چلا کہ چرچل نے 1943 میں ایک نجی گفتگو میں یہ بات کہی تھی کہ اب سوویت یونین ہی بڑا دشمن ہے۔ 1944 کے آتے آتے برطانوی اور امریکی حکومتوں نے اس قسم کے ہر احساس سے بچنا شروع کر دیا تھا کہ نازی جارحیت سے محفوظ رہنے کے لیے ہم نے روسیوں پر انحصار کیا تھا۔ اور اب، جبکہ جرمن خطرہ ماضی کی بات ہو چکا تھا، مغربی حکومتوں کے رہنما صاف صاف کہنے لگے تھے کہ دراصل سوویت یونین ہی بڑا دشمن ہے، جیسا کہ وہ ہر زمانے میں رہا ہے۔

مغرب کی کمیونسٹ پارٹیاں اس صورتِ حال پر اپنا ردِعمل طے نہ کر پانے کی وجہ سے افراتفری کا شکار تھیں۔ تہران میٹنگ کے دوران اسٹالن کے لیے چرچل اور روزویلٹ کو یہ یقین دلانا ضروری تھا کہ سوویت یونین دوسرے ممالک میں انقلاب لانے کی کوشش شروع کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں رکھتا، اور اسی لیے اس نے کومنٹرن (Commintern) کو منسوخ کر دیا تھا۔ کومنٹرن وہ ادارہ تھا جہاں تمام کمیونسٹ پارٹیاں بین الاقوامی معاملات پر مشترکہ لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے ملتی تھیں۔ اب جبکہ اس کی رہنمائی حاصل نہیں رہی تھی، ہر ایک قومی کمیونسٹ پارٹی الگ الگ طرح سے اپنا ردِعمل ظاہر کر رہی تھی۔ براؤڈر کی لیڈرشپ میں امریکہ کی کمیونسٹ پارٹی نے خود کو تحلیل کر لینے کا انتہا پسندانہ قدم یہ دلیل دے کر اٹھایا کہ مغربی اتحادیوں کی بڑھتی ہوئی باہمی قربت نے ایک ایسی پارٹی کے وجود کو جو اشتراکی انقلاب میں یقین رکھتی ہے، غیر ضروری بنا دیا ہے۔ فرانسیسی کمیونسٹ لیڈر ڈکلاس (Duclos) نے اپنا ردِعمل ایک مضمون شائع کرا کے ظاہر کیا جس میں اس نے براؤڈر کے موقف پر (جو بعد میں Browder's line کہلایا) سخت گرفت کی اور کہا کہ آج کمیونسٹ جس نئی صورتِ حال سے دوچار ہیں اس کے مقابلے کے لیے کمیونسٹ تحریک کے لیے تیار رہنا لازم ہے کیونکہ اس نئی صورتِ حال میں بہت ممکن ہے کہ اشتراکی ریاست اور سرمایہ دار قوتوں کے درمیان تصادم والے 1939 سے پہلے کے حالات عود کر آئیں، بلکہ زیادہ شد و مد کے ساتھ سامنے آئیں۔ برطانوی پارٹی کی لیڈرشپ — پارٹی کے بہت سے اراکین اس پر فکر مند بھی تھے — براؤڈر کے موقف کی ہمدرد محسوس ہوتی تھی۔ ہیری پولٹ نے اپنے کتابچے امن کیسے جیتیں (How to Win the Peace) میں جنگ کے بعد اس اتحاد میں شامل رہنے پر زور دیا جس کو وہ 'ترقی پسند دقیانوسیوں' (Progressive Torries) سے تعبیر کرتا تھا۔

Scanned with CamScanner

سیاسی ماحول کی رجائیت سے متجاوز اس صورتِ حال کا ایک اثر یہ ہوا کہ برطانوی کمیونسٹ پارٹی نے 'عوامی' پارٹی بننے کی جانب قدم بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ میں اس فیصلے کا پوری طرح مخالف تھا۔ جنگ کے زمانے میں سوویت یونین کے لیے پیدا ہونے والے مثبت رجحان کے باوجود ایسے لوگوں کی تعداد اب بھی نسبتاً خاصی کم تھی جو اس سے خفیف سی بھی ہمدردی رکھتے تھے، اور یہ بات مجھے واضح طور پر معلوم تھی کہ برطانیہ کے حالات میں ہم پارٹی کے لیے ماس ممبر شپ پانے میں اس طرح کامیاب نہیں ہو سکتے جس طرح 1930 کی دہائی میں فرانسیسی پارٹی نے حاصل کی تھی۔ ماس پارٹی بننے کی جانب بڑھنے کا مطلب تھا کہ پارٹی ایسے لوگوں کو بھی رکن کے طور پر بھرتی کر لے جن کو ہمارے مقاصد کا بہت ہی معمولی سا اندازہ ہو، اور اس کا نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ پارٹی کے، بس زیادہ سے زیادہ، مرکزی حصے ہی کے لوگ اصل میں کمیونسٹ رہ جاتے۔

میں ہندستان میں ایک ایسے ہی پارٹی رکن سے ملا تھا جو مجھے ایسے لوگوں کی ایک مثال نظر آرہا تھا جن کو اب ہم نئے حالات میں رکنیت دینے والے تھے۔ وہ شخص ایک NCO تھا (میرا خیال ہے، سارجنٹ)، جس کا یونٹ وقتی طور پر ہمارے یونٹ کے قریب مقیم تھا۔ میں نے اس برطانوی NCO سے ایک کمیونسٹ ساتھی کے طور پر خود کو متعارف کرایا تھا، اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ ہندستانیوں اور ہندستانی معاملات کے تئیں اس کا رویہ سرپرستانہ تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ اکثر برطانوی لوگ اس سے اختلاف کریں گے کہ ہندستان کو آزاد کر دیا جائے لیکن میرا خیال ہے کہ ہندستانیوں کو خود حکومت کرنے کا ایک موقع دیا جانا چاہیے، اور اگر وہ ٹھیک طرح سے حکومت نہیں کر پاتے تو انگریز تو کبھی بھی واپس آ سکتے ہیں۔ وہ شخص اس بنیادی کمیونسٹ اصول سے بڑے مزے میں لاعلم معلوم ہوتا تھا جس کے مطابق تمام ممالک کے کمیونسٹ اشتراکیت لانے کی عالمی جدوجہد میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں، اور جو کولونیل لوگوں کے آزادی پر غیر مشروط حق کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کو کبھی کوئی ایسا خیال نہیں آیا کہ کسی ہندستانی سے اس بارے میں بات کرے، حالانکہ اس کے برابر والے یونٹ میں کیرالہ کا ایک ہندستانی کمیونسٹ بھی تھا جس کو اچھی خاصی انگریزی آتی تھی اور جس سے بات کر کے وہ ہندستان کے حالات کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا تھا۔

اس سلسلے میں ان کمیونسٹوں کے ساتھ اپنی اولیں بات چیت مجھے واضح طور پر یاد ہے جو جنگ

کے زمانے میں برطانیہ سے باہر نہیں گئے تھے۔ میری درخواست پر میرے سابق کیمبرج کے ساتھی فریڈی (Freddie) اور جان وکرس (John Vickers) مجھے ایک بزرگ اور معزز کمیونسٹ اسکول ٹیچر، سی جی ٹی جائلز (CGT Giles) کے پاس ملاقات کی غرض سے لے گئے۔ وہ گھر پر نہیں تھے لیکن ان کی بیوی بیٹسی (Betsy) سے ملاقات کے دوران پارٹی کی رکنیت کے سوال پر گفتگو ہوئی۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ بیٹسی، فریڈی اور جان، تینوں 'ماس پارٹی' کے تصور سے متفق ہیں۔ ان کو اس بات کی مثال دینے کے لیے کہ اس سے کس طرح کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں، میں نے انھیں اس NCO کا واقعہ سنایا جس سے میں ہندستان میں ملا تھا۔ بیٹسی نے کہا کہ اس قسم کے آدمی کو پارٹی میں شامل کرنا کوئی غلط بات نہ تھی — ایسا کر کے کم از کم اتنی امید تو کی جا سکتی تھی کہ وقت کے ساتھ اس میں کمیونزم کی ایک بہتر سمجھ پیدا ہو جائے گی۔ دوسرے لوگ اتنی شدت سے اس خیال سے متفق تو نہیں تھے لیکن انھوں نے اس کی کوئی سخت مخالفت بھی نہیں کی۔ میری دلیل یہ نہیں تھی کہ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھا جائے — ظاہر ہے کہ جس خیال نے بھی اسے خود کو کمیونسٹ کہنے پر آمادہ کیا تھا وہ ضرور کوئی ایسا خیال تھا جس کی قدر کی جانی چاہیے، اور یہ خیال کمیونسٹ ہونے کے لوازم کو پوری طرح سمجھنے کی بنیاد فراہم کر سکتا تھا۔ لیکن اس سے یہ سوچنے کا جواز فراہم نہیں ہوتا کہ پارٹی میں محض اس کی شمولیت سے ہی اس میں کمیونسٹ مقاصد کی فہم پیدا ہو جائے گی۔

ایک اور معاملے پر بات کرتے ہوئے بیٹسی اور دوسرے لوگوں نے دو رسالوں کے بیچ جاری ایک قضیے کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ان دونوں رسالوں پر عملاً ہر لحاظ سے پارٹی ہی کا کنٹرول تھا۔ متحدہ اشتراکی اور اشتمالی طلبہ تنظیم (United Communist & Socialist Student Organisation) کے رسالے اسٹوڈنٹ فارورڈ (*Student Forward*) نے ایک دوسرے مجلّے ماڈرن کوارٹرلی (*Modern Quarterly*) سے ایک مضمون سرقہ کر کے چھاپ دیا تھا۔ ماڈرن کوارٹرلی میں عموماً آرٹس اور سائنسی موضوعات پر مارکسی لوگوں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ ماڈرن کوارٹرلی کے کمیونسٹ اربابِ اختیار نے ردِعمل میں اسٹوڈنٹ فارورڈ کے اربابِ اختیار کو قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ میں حیران تھا — قانونی چارہ جوئی، وہ بھی کمیونسٹوں کے درمیان؟ معاملے کو پارٹی کے اندر ہی بات چیت کے ذریعے کیوں

Scanned with CamScanner

نہیں سلجھایا گیا؟ لیکن کوئی بھی اس کے لیے فکر مند نظر نہ آتا تھا کہ اس بارے میں کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں ان لوگوں سے فاصلہ محسوس کر رہا ہوں جن کو میں بہت سی باتوں میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لگا کہ میری غیر موجودگی میں رویوں میں بڑی آہستہ روی سے تبدیلی آتی چلی گئی تھی، یہ تبدیلی واضح اور اصولی کمیونسٹ طرز عمل کی جگہ بورژوا طرز عمل کے روپ میں آرہی تھی۔ لیکن میں بھی تو بدل گیا تھا: میں نے ساڑھے تین برس ایک مختلف معاشرے میں بسر کیے تھے، اور اس نے بھی میری فکر کی تربیت کی تھی۔ ان لوگوں کے لیے ہندستان کی آزادی اور مختلف ممالک کے کمیونسٹوں کے درمیان باہمی تنظیم کے سوال بڑے دوراز کار اصولی سوال تھے ــــ وہ ان کو تسلیم تو کر سکتے تھے لیکن ان سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے، جبکہ میرے لیے یہ سوال کلیتاً مرکزی اہمیت کے سوال تھے۔

بہر حال، میں ہندستان واپس جارہا تھا، اور اس کا مجھے کچھ جواز نظر نہ آتا تھا کہ برطانوی پارٹی میں جو کچھ ہو رہا ہے میں اس میں سنجیدگی سے خود کو شامل کروں۔

اس تمام عرصے میں ہندستان میں جیسے جیسے انگریزوں سے آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی، ہلچل پیدا کرنے والے واقعات پیش آرہے تھے۔ کیمبرج کے زمانے کے ایک دوست پیٹر چیپل (Peter Chapple) کی وساطت سے میں لیڈز (Leeds) میں ہندستانی طلبہ کے ایک گروپ سے ملا جو اس بات سے بہت خوش تھا کہ ان کی ایک ایسے برطانوی کمیونسٹ سے ملاقات ہوئی جو ان سے ہندستان کے تازہ ترین حالات پر گفتگو کر سکتا تھا۔ ان میں ایک جس کے ساتھ میں نے قربت محسوس کی، راشد تھا۔ وہ بنگالی مسلمان تھا۔ ترقی پسند بنگالیوں میں، جن میں بیشتر ہندو تھے، کسی مسلمان کا پایا جانا اپنے آپ میں ایک نادر بات تھی۔ وہ انگلینڈ میں بینکنگ اور فنانس کی تعلیم کے لیے یہ سوچ کر آیا تھا کہ واپسی پر کسی بینک میں نوکری کرے گا، لیکن وہ خود کو کمیونسٹ سمجھتا تھا اور یہاں آنے بعد اس کا یہ کمٹ منٹ زیادہ مضبوط ہی ہوا تھا۔ وہ ایک پُر جوش انسان تھا، اور یہ بات صاف تھی کہ وہ میری قدر کرتا تھا اور میرے قریب آنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی گرمجوشی کا جواب بخوشی گرمجوشی کے ساتھ دیا۔

Scanned with CamScanner

جہاں لوٹ کر جانے کی میں توقع کرر ہا تھا اس زندگی کی یاد تب تب تازہ ہو جاتی تھی جب مجھے ہندستانی ڈاک ٹکٹ لگا، زردی مائل نیلا ایروگرام ملتا، جو اکثر کسی ایسے شخص کی تحریر میں ہوتا جس نے زندگی میں اس سے پہلے شاید ہی قلم پکڑا ہو۔ ان میں سے ایک نے رومن حروف میں خط لکھا تھا، جیسا کہ ہندستانی افواج میں چلن تھا۔ ایک اور نے اپنی مادری زبان میں لکھا تھا، اور مجھے انگلینڈ میں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا تھا جو اس کا ترجمہ کر سکے۔ ان میں صرف سری نواسن ہی تھا جو انگریزی لکھ پڑھ سکتا تھا۔ میں جن حالات سے یہاں گزر رہا تھا، میں نے کوشش کی کہ اس کو ان سے باخبر رکھوں۔ سری نواسن نے جواب میں لکھا تھا:

> تم نے مجھے آج کے انگلینڈ اور وہاں کی معاشی اور سیاسی زندگی کا ایک خاکہ بھیجا ہے، جس میں تم نے عورتوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے، خاص کر جنگ کے دوران ان کے تعاون کا اور اس کردار کا جو وہ اب بھی ادا کر رہی ہیں۔ یہاں لڑکوں کو میں نے اس کا ترجمہ کر کے سنایا ہے۔ ان کو اس میں دلچسپی ہے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد ہمارے یونٹ کو بھی بکھر جانا تھا۔ سری نواسن نے مجھے سب کے بارے میں لکھا کہ کون کب اور کہاں گیا تھا۔ لیکن:

> تمھارا تھیلا اور دوسرا سامان ابھی اسٹور ہی میں ہے۔۔۔۔ یہ سوچ کر ہمارا دل خوش ہو جاتا ہے کہ تم ایک نہ ایک دن پھر سے ہمارے ساتھ ہو گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہاں قیام کے دوران ہم اور دوسرے لوگ تمھارے زیادہ نزدیک آسکیں گے۔ ہم اس دن کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔

میں بھی شدت سے اس دن کا منتظر تھا۔

Scanned with CamScanner

3

پارٹی لیڈروں سے اختلاف

حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ برطانیہ کے سیاسی مسائل میں خود کو الجھاؤں، لیکن برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی ایک پالیسی کا معاملہ ایسا تھا کہ میں اس سے خود کو علیحدہ نہ کرسکا، کیونکہ اس کا تعلق ہندستانی کامریڈوں سے برطانوی پارٹی کے روابط سے تھا۔

ہندستان میں میرے قیام کے آخری چند مہینوں میں سیاسی واقعات بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگ کے سبب برطانیہ کے معاشی حالات بے حد خراب ہو گئے تھے، ایسے میں ایک باغی کالونی پر قابض رہنے پر آنے والے اخراجات استطاعت سے باہر ہوتے جارہے تھے۔ جون 1945 میں برٹش وائسرائے ویول (Wavell) نے ان ہندستانی کانگریسی لیڈروں کی رہائی کا حکم دیا جو گذشتہ تین برسوں سے قید میں تھے، اور انھیں مشاورت کے لیے بلایا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندستان کا کیا کیا جائے۔ یہ بات ذرا بھی واضح نہیں تھی کہ برطانوی حکومت ہندستانیوں کو اقتدار منتقل کرنے (آزادی دینے) کے معاملے میں کتنی سنجیدہ ہے، لیکن جس حد تک بھی سنجیدہ تھی اس کا تعلق ہندستانی لیڈروں کے جائز مطالبات کو تسلیم کرنے سے نہیں بلکہ روز افزوں مشکل ہوتی ہوئی صورتِ حال سے برطانیہ کو نجات دلانے سے تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ شرائط پر متفق ہونے میں ناکام رہے، اور ویول نے معاملہ آگے بڑھانے سے انکار کر دیا۔

میں نے برٹش کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ڈیلی ورکر کی کاپیاں حاصل کرنے انتظام کر

Scanned with CamScanner

رکھا تھا۔اس میں ان واقعات کی رپورٹنگ کا سر پرستانہ لہجہ دیکھ کر مجھے بڑا صدمہ پہنچا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ برطانوی حکومت کے موقف کی محض بازگشت ہی تھی اور اس میں بھی مذاکرات کی ناکامی کا سارا الزام ہندستانیوں پر ڈال دیا گیا تھا۔لہجہ کچھ اس طرح کا تھا، ''کیسی افسوسناک بات ہے کہ ہندستانی آپس میں بھی متفق نہیں ہو سکتے! ایک ہم انگریز ہیں کہ انھیں آزادی دینے کے لیے قدم بڑھانے کو بے تاب ہیں، لیکن ان کی آپسی نا چاقی ہمیں روکے ہوے ہے۔'' جس بات نے مجھے مزید برافروختہ کیا وہ یہ تھی کہ اس رپورٹ کے لکھنے والے نے یہ جاننے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کہ ہندستانی کمیونسٹ اس سلسلے میں کیا سوچتے ہیں۔ ہندستانی پارٹی ویول کے موقف کو انگریزوں کے 'بانٹو اور حکومت کرو' کے ہتھکنڈے کی ایک کلاسک مثال کے طور پر دیکھ رہی تھی، جس کا استعمال نا اتفاقی پیدا کرنے کے لیے کیا گیا تاکہ اس کی نمائش ساری دنیا کے سامنے کی جا سکے۔ اسی لیے پارٹی نے کانگریس اور مسلم لیگ پر سخت نکتہ چینی کی کہ وہ اس ہتھکنڈے کو ناکام بنانے کے لیے متحد کیوں نہ ہو سکے، لیکن اس کا بنیادی نشانہ برطانوی اربابِ اختیار ہی تھے۔ جب میں ہندستان چھوڑنے والا تھا تو میری ملاقات ایک کمیونسٹ ساتھی پیٹر وِٹیکر (Peter Whittaker) سے ہوئی، وہ بھی شدت سے ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ جب ہم برطانیہ واپس لوٹیں گے تو ہم دونوں ہی پارٹی لیڈرشپ کے سامنے اپنے اعتراضات رکھیں گے۔

اس لیے جب میں پہلی بار پارٹی ہیڈکوارٹر گیا تو میں نے مائیکل کیرٹ سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے خیال میں برٹش پارٹی کے جس رویے کا ڈیلی ورکر میں اظہار ہوا ہے وہ پوری طرح غلط ہے، اور ایسا دوبارہ نہ ہو اس کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے۔ کمیونزم کا یہ بنیادی اصول ہے کہ حاکم ملک کے کمیونسٹ، آزادی کی جنگ میں مظلوم لوگوں کا ساتھ دیں — برطانوی کمیونسٹوں کا یہ کام ہرگز نہیں ہے کہ وہ ہندستان کی آزادی کی تحریک کو نصیحتیں کرنی شروع کر دیں یا یہ سمجھائیں کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ میں نے جو کچھ کہا مائیکل نے ان میں سے بیشتر باتوں سے اتفاق کیا اور کہا کہ دیکھوں گا کہ اس معاملے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔

اس ملاقات کے بعد مجھے ہوم واپس لوٹنا تھا اس لیے میں نے معاملہ اس کے اور پیٹر کے درمیان چھوڑ دیا، جو حال ہی میں ہندستان سے لوٹ آیا تھا۔ پیٹر مجھے ڈاک کے ذریعے حالات سے

Scanned with CamScanner

آگاہ کرتا رہا۔ اس نے لکھا کہ مائیکل نے پام دت سے بات کی ہے اور یہ مشورہ دیا ہے کہ پیٹر کو اور مجھے پارٹی کی کولونیل کمیٹی کے سامنے اپنے خیالات رکھنے کے لیے مدعو کیا جائے، جس کے سربراہ دت تھے۔ پیٹر نے لکھا کہ وہ خود اس میٹنگ میں شریک نہ ہو سکے گا — ممکن ہے اس کے پاس اس کی کوئی معقول وجہ ہو لیکن میرا اپنا خیال یہ تھا کہ وہ کسی بھی قسم کے تصادم سے بچنا چاہتا تھا۔ تو اب مجھے اکیلے ہی جانا تھا، جس کے لیے میں نے ایک بار پھر لندن کا سفر کیا۔

دت کسی وجہ سے اس میٹنگ میں نہ آ سکے، لیکن ہندستانی کمیونسٹ لیڈر ڈانگے موجود تھے۔ جمی شیلڈس (Jimmy Shields) نے بھی میٹنگ میں شرکت کی۔ جمی وہ شخص تھا جس کے بارے میں میں سترہ برس کی عمر سے جانتا تھا، کیونکہ وہ 1935 میں منعقد ہونے والی کمیونسٹ انٹرنیشنل (کومنٹرن) کی ساتویں عالمی کانگریس میں برطانوی پارٹی کے وفد میں شامل تھا، اور میں نے اس کانگریس کی تمام رپورٹیں انتہائی دلچسپی سے پڑھی تھیں۔ اس طرح میں ان لوگوں کے روبرو تھا جن کا میں معترف تھا اور جانتا تھا کہ بڑے تجربہ کار ہیں۔ میں نے تیز لہجے میں بات کی، کیونکہ میں ہمیشہ یہ مانتا تھا کہ شدید اختلافات کی صورت میں ایک کمیونسٹ کو اسی طرح بات کرنی چاہیے، اور اپنے اناڑی پن میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سب اسی طرح کرتے ہوں گے۔ مجھے یاد ہے میں نے ان سے کہا تھا کہ جیسے نتائج ڈیلی ورکر کے اداریے میں اخذ کیے گئے ہیں، برطانوی آمریت پسندوں کی منشا یہی تھی کہ لوگ ایسا ہی طرز فکر اپنائیں، اور یہ کہ برٹش کمیونسٹ پارٹی (کی مچھلی) نے چارہ 'کانٹے، ڈور اور اس سے بندھے وزن' سمیت نگل لیا ہے۔ میرے اس جملے پر مائیکل کیرٹ نے ہنس کر احتجاج کیا، لیکن میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ باقی لوگ خاموش اور شرمندہ سے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاملے پر ڈھنگ سے بحث نہیں ہو سکی۔ مجھے تاثر ملا کہ برطانوی اور ہندستانی، دونوں ہی کمیونسٹ پارٹیوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ ویول مذاکرات کے بارے میں ان دونوں کے موقف میں اختلاف ہے۔ مجھے اس وقت صدمہ پہنچا جب میٹنگ کے خاتمے کے قریب جمی شیلڈس نے برطانوی محنت کش طبقے کی نظروں میں گاندھی کی اہمیت کے بارے میں ڈانگے سے مختلف رائے ظاہر کرتے ہوئے غصے کے ساتھ بات کی۔

میٹنگ ختم ہونے کے بعد ڈانگے نے مجھ سے کہا کہ مجھے اتنے تیز لہجے میں بات نہیں کرنی

چاہیے تھی۔ ’’ہندستانی پارٹی میں اس طرح بات کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے، لیکن برٹش پارٹی میں مناسب نہیں۔‘‘ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس لہجے میں بات کر کے مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا کیونکہ اس سے برطانوی کمیونسٹ پریشان اور ناراض ہو گئے ہیں۔ غالباً میں نے جواب دیا تھا کہ یہ کم بخت باتیں ان کے لیے پریشانی کا باعث نہ ہونی چاہییں۔

اگلے کئی ہفتوں تک مائیکل کے اور میرے درمیان بھرپور خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ پارٹی میں اندرونی طور پر میرے موقف کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے اس سے باخبر رکھنا چاہتا تھا— ’تو تم دیکھو گے کہ ہم لوگ ایسے بے وقوف بھی نہیں ہیں جیسے تم سمجھتے ہو۔‘ پھر اس نے لکھا:

> دقت یہ ہے کہ میں تمھاری پچانوے فی صد نکتہ چینی سے متفق ہوں، لیکن باقی کا پانچ فی صد، تمھارا کہنے کا انداز اور تمھارے رویہ، میرے لیے پریشان کن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ بات مذموم ہے کیونکہ اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک ایسے موقف کا دفاع کر رہا ہوں جو پچانوے فی صد ناقابل دفاع ہے اور جس کے خلاف میں خود ایک طویل عرصے سے نبرد آزما رہا ہوں۔۔۔۔ جب میں سی پی آئی (ہندستانی کمیونسٹ پارٹی) کے ساتھ کام کرتا تھا اور جب حالات اور بھی زیادہ مشکل تھے، میں بھی اکثر ہندستان کو آزادی دلانے میں رات دن ایک نہ کر پانے میں اپنی ناکامی کے سبب گہری ندامت اور مجرم ضمیری محسوس کرتا تھا۔

کوئی دو ہفتوں کے بعد اس نے اقرار کیا کہ میں تنہا ہی ان کے لیے وبال نہیں بنا ہوا تھا— موہن کمار منگلم کا بھی ایک طویل خط اسے ملا تھا جس میں اس نے گویا میرے اعتراضات اور الزام تقریباً لفظ بہ لفظ دہرائے تھے۔ موہن ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر تھا جو کیمبرج کے زمانے میں میرا دوست رہا تھا۔ اب مجھے برطانوی پارٹی کے دوسرے اراکین سے جو حال ہی میں ہندستان سے لوٹے تھے، یہ سننے کو بھی ملنے لگا کہ انھوں نے بھی اسی قسم کی تشویش کا اظہار پارٹی میں، اپنے اپنے انداز کی شدت سے کیا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے، اور ناجائز بھی، کہ پارٹی کی افسر شاہی نے اس کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اتنی ہی ناجائز بات یہ تھی کہ انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے

Scanned with CamScanner

رہنما ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے یہ سب کرا رہے ہیں۔

اس سے میں سخت آزردہ ہوا۔ اوّل تو یہ کہ لیڈر شپ نے یہ فرض کر کے کہ نکتہ چینی کرنے والے کسی اور کے کہنے سے ایسا کر رہے ہیں، اپنے اراکین کی توہین کیوں کی جبکہ ان میں سے کچھ اراکین تو خاصے تجربہ کار اور پرانے تھے؟ میں نے جا کر اپنے اعتراضات رکھے تو اس وجہ سے کہ بحیثیت کمیونسٹ میں ایسا کرنا اپنا عین فرض سمجھتا تھا، اور یہ یقین نہ کرنے کا میرے پاس کوئی سبب نہیں کہ دوسرے لوگوں نے بھی اسی جذبے کے تحت تنقید کی ہوگی۔ اور دوسری بات یہ کہ پارٹی ہیڈکوارٹرز میں مجھے کسی نے بھی یہ کیوں نہیں بتایا کہ دوسرے لوگ بھی یہی سوال لے کر آرہے ہیں؟ بات صاف تھی — وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خیالات جان سکے۔ اور اگر ہم اس بات کو درست مان بھی لیں کہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے رہنما واپس آنے والے برطانوی کمیونسٹوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ اس قسم کی نکتہ چینی کریں، تو اس میں کون سی قیامت آگئی؟ انھیں چاہیے تھا کہ وہ ایسے اقدام کو خوش آمدید کہیں جو ایک سیاسی صورتِ حال کے مرکزی نکتے سے شدید انحراف کی غلطی کو درست کرنے کے لیے کیا جارہا تھا اور جس سے برطانوی اور ہندستانی دونوں کمیونسٹ پارٹیوں کا یکساں تعلق تھا۔

مائیکل نے بڑی مہربانی کی کہ اس نے مجھے لکھا، ''اس میں دو رائے نہیں کہ تمھاری تنقید نے مجھ پر اور دوسرے لوگوں پر شدید اثر ڈالا ہے۔'' لیکن مجھے سب سے بڑا صدمہ دت کے بارے میں اپنی رائے کو بدلنے سے پہنچا۔ ڈیلی ورکر کے اداریوں میں جو موقف اختیار کیا گیا اس کے لیے غالباً دت ہی ذمے دار تھے، اور ان پر کوئی اعتراض نہ کرنے کے لیے تو یقیناً تھے۔ میں جتنا زیادہ کولونیل کمیٹی کی اس میٹنگ اور اس خاموش گھبراہٹ کے بارے میں سوچتا تھا جس کے ساتھ میرے حملوں کا جواب دیا گیا اتنا ہی میری تشویش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ حالانکہ دت اس میٹنگ میں موجود نہیں تھے جس میں میں نے اپنے خیالات رکھے، لیکن بہر حال عموماً وہی اس کمیٹی کی صدارت کرتے تھے، چنانچہ اس کے اراکین میں 'اتھارٹی کو چیلنج مت کرو' والی ذہنیت کے لیے بڑی حد تک انھی کو ذمے دار ماننا چاہیے۔ جب راشد نے ان حالات کے بارے میں سنا تو ان نے مجھے لکھا کہ میرا خیال ہے کہ تم جتنا سوچ رہے ہو اس سے کہیں زیادہ اثر تم نے ڈالا ہے۔ میری رائے پر جس طرح کا ردعمل ظاہر کیا گیا تھا

Scanned with CamScanner

اس پر وہ بھی انتہائی مشتعل تھا۔ اس نے لکھا، ''ہمارا کیس کچھ یوں ہے گویا اولمپیا کے خداؤں کے بنائے ہوئے قوانین پر اعتراض کی ہمیں ممانعت ہے، اور ہمارا کام صرف خاموشی کے ساتھ، بلا عذر، ان پر عمل کرنا ہے۔''

یہ یقیناً وہ پارٹی نہیں تھی جس سے میں وابستہ ہوا تھا۔ ابتدا ہی سے، جب سے مجھے کمیونزم کا تجربہ ہے، مجھے یہ سکھایا گیا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی میں کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا ہے۔ In the communist party there is no rank and file. یہ فقرہ برٹش پارٹی کے ابتدائی اعلان نامے میں موجود ہے۔ ہر رکن کو دوسرے کے برابر حقوق حاصل ہیں، اور جو کچھ ہم سوچتے ہیں اس پر کھلی بحث کرنے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم سب یکساں طور پر ذمے دار ہیں۔ تمام کمیونسٹوں کا ایک دوسرے کو' کامریڈ' کہہ کر مخاطب کرنے کا رواج اسی کا غماز ہے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پارٹی جس شے کی تبلیغ کرتی ہے اس پر ماضی میں عمل کرتی ہو تو کرتی ہو لیکن اب نہیں کرتی۔ کامریڈشپ میں حفظِ مراتب کی بنیادیں پڑ چکی تھیں، اور اسی لیے، جارج آرویل کے الفاظ میں قدرے تبدیلی کرتے ہوئے، ''سب کے سب کامریڈ تھے، لیکن ان میں سے کچھ، دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کامریڈ تھے۔'' میں نچلے درجے کا کامریڈ تھا، جبکہ پارٹی کے لیڈر اعلیٰ ترین درجے کے کامریڈ، جن کے سامنے نچلے درجے کے کامریڈوں کو عاجزی اور ادب سے پیش آنا چاہیے۔

اکتوبر کے ختم ہوتے ہوتے میری چھٹیاں ختم ہونے کی تاریخ گزر گئی لیکن لگتا تھا کہ فوج مجھے بھول چکی ہے۔ توقع کے خلاف بڑھ جانے والی ان چھٹیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور برٹش پارٹی کی سرگرمیوں سے مزید واقفیت حاصل کی۔ جنگ کے بعد پارٹی کانگریس کی پہلی بیٹھک نومبر میں ہونے والی تھی۔ پالیسی کے معاملات میں کانگریس باضابطہ طور پر حکم کا درجہ رکھتی تھی، اور ایک سیشن کے سوا باقی تمام اجلاسوں میں پارٹی کا ہر رکن شریک ہوسکتا تھا۔ میں نے طے کیا کہ میں شرکت کروں گا — یہ ایک اچھا موقع تھا یہ جاننے کا کہ جنگ کے بعد جن بدلے ہوئے حالات سے ہم لوگ دوچار ہیں ان سے پارٹی کس طرح موافقت پیدا کر رہی ہے۔

اسی دوران، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ، کرس کو چھٹی مل گئی۔ ہم نے تقریباً چار برس سے ایک

Scanned with CamScanner

دوسرے کو نہیں دیکھا تھا، لیکن جب ملے تو فوراً ہی گھل مل گئے، اور ہم نے کھل کر ہر اس مسئلے پر بات کی جس سے ہمارا تعلق تھا، خواہ وہ نجی ہو یا سیاسی۔ اس کا تقرر جرمنی میں ہوا تھا اور وہاں اسے انٹیلی جنس کے لیے کام کرنا تھا کیونکہ وہ جرمن زبان جانتا تھا۔ (کیا ہی غیر معمولی بات ہے! ورنہ فوج میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ جرمن جاننے والے شخص کا تقرر ایسی جگہ کر دیا جاتا ہے جہاں جاپانی زبان جاننے والے کی ضرورت ہو، اور جاپانی جاننے والے کو ایسی جگہ بھیج دیتے ہیں جہاں ضرورت جرمن جاننے والے کی ہو۔) اس تقرر نے اسے ایک ایسے مرکز میں پہنچا دیا تھا جہاں یورپ کی سب سے اہم سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ جنگ کے زمانے کی اتحادی قوتیں جنھوں نے جرمنی میں داخل ہو کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا، اس بات پر متفق تھیں کہ شکست خوردہ ممالک سے تمام فسطائی عناصر کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ نیورمبرگ (Nuremberg) میں بڑے نازی لیڈروں پر مقدمے شروع ہو چکے تھے۔ لیکن بہت سے لوگوں کو بھروسا نہیں تھا کہ مغربی اتحادی نازیوں کی بیخ کنی (denazification) مکمل طور پر کریں گے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ 1933 اور 1939 کے درمیان برطانیہ اور فرانس کے حکمراں ہٹلر سے ہمدردی رکھتے تھے، اور جرمنی کے خلاف جنگ کرنے پر تبھی آمادہ ہوئے تھے جب وہ مجبور ہو گئے۔ اس کے برخلاف، روسی اس امر کو یقینی بنانے پر کمربستہ تھے کہ فسطائیت عود نہ کر آئے — انھوں نے تین سال تک تن تنہا جنگ کا زبردست دباؤ برداشت کیا تھا، اور اب تک سب سے زیادہ نقصان بھی اٹھایا تھا، اسی لیے وہ عزم کیے ہوئے تھے کہ فسطائیت کو دوبارہ نہ آنے دیں گے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ برطانوی فوج کے بہت سے لوگ جو اس بات سے واقف تھے، سوچتے تھے کہ کاش برطانوی اور امریکی فوجوں سے پہلے روسی فوجیں برلن میں داخل ہو جائیں، اور جب ایسا ہوا تو وہ خوش بھی ہوئے۔

ظاہر ہے کہ کرس اس بارے میں تفصیل سے بات نہ کر سکتا تھا کہ اسے وہاں کس قسم کا کام دیا گیا تھا، لیکن نازیوں کی بیخ کنی میں وہ بھی پورا یقین رکھتا تھا، اور اگر اس کے ذمے کیے گئے کام اسے تکلیف دہ لگتے تو بھی اسے معلوم تھا کہ ان کو کرنا لازمی ہے۔

ہم نے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے معاملات پر، اور کولونیل کمیٹی کے تعلق سے میرا فریب نظر دور ہونے کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ ایسی اور بھی علامتیں تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ پارٹی لیڈرشپ تنقید برداشت کرنے یا اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے کا بوتا نہ رکھتی تھی۔ مثال کے طور پر،

Scanned with CamScanner

1939 سے 1941 تک انھوں نے جو موقف اختیار کیا تھا، جس میں ہمیں جنگ کی مخالفت کرنے کی ہدایت دی گئی تھی، وہ اب اس پر نظر ثانی کے لیے کوئی قدم اٹھاتے نظر نہ آتے تھے۔ ہماری نسل کے دوسرے کمیونسٹوں کی طرح ہم بھی یہ مانتے تھے کہ متحدہ سیاسی اقدامات کے لیے پارٹی میں ایک حد تک ضابطے کا مرکزی نظام ضروری ہے، اور اسی وجہ سے ہم نے اُس وقت اس فیصلے کو تسلیم کرلیا تھا، لیکن اس نے ہمیں ایک ازحد مشکل صورتِ حال سے دوچار کیا تھا۔ 1930 کی پوری دہائی میں کمیونسٹ تمام یورپ میں فسطائیت کے خلاف جنگ میں آگے آگے رہے تھے، اور انھوں نے اپنی اپنی حکومتوں پر زور ڈالا تھا کہ وہ نازی جرمنی کے خلاف واضح موقف اختیار کریں — اب ہم جنگ سے پیچھے کیونکر ہٹیں؟ خوبیِ قسمت سے 1941 میں پارٹی کی پالیسی عین اس وقت تبدیل ہوگئی جب جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کردیا۔ اس کے بعد کمیونسٹوں نے سرگرمی سے جنگ کی حمایت کی، لیکن ہم شدت سے یہ محسوس کرتے تھے کہ پارٹی لیڈرشپ کو چاہیے کہ وہ جنگ کی مخالفت کرنے کی پہلی غلطی تسلیم کرنے کو تیار رہے۔ پیچھے مڑکر دیکھنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پالیسی میں تبدیلی کی اصل وجہ سوویت یونین کی حفاظت کے سلسلے میں کیا گیا اسٹالن کا محاسبہ تھا — جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر سوویت یونین پر حملہ ہوا تو وہ مغرب کی حمایت پر اعتبار نہیں کرسکتا، جرمنی کے خطرے کو حاشیے ہی پر رکھنے کے لیے اس نے ہٹلر کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ بھی کیا۔ ہر جگہ کی کمیونسٹ پارٹیاں سوویت یونین کی حفاظت کرنے کی اہمیت سے متفق تھیں، جو گذشتہ دو دہائیوں سے دنیا کا واحد سوشلسٹ ملک تھا۔ لیکن جنگ کو سامراجی قوتوں کی آپس کی ایسی جنگ قرار دینا جس میں کمیونسٹ کسی کی بھی حمایت نہ کرسکتے تھے، ہمارے اس موقف سے یکسر مخالف بات تھی جس کے لیے ہم گذشتہ پانچ برسوں سے برسرِ پیکار رہے تھے۔ کسی بھی پارٹی لیڈر نے اپنے پرانے موقف کی وضاحت نہیں کی تھی، یا کبھی یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ اس عرصے میں ہم نے جنگ مخالف رویہ اپنا کر غلطی کی تھی۔ کرس کا اور میرا خیال یہ تھا کہ پارٹی کی ساکھ بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ یہ بنیادی اصول ہے کہ کمیونسٹوں کو اپنی تنقید خود کرنے کی عادت ہونی چاہیے، حالات پر مسلسل نظر ثانی کرتے رہنا چاہیے تاکہ دیکھ سکیں کہ صحیح سمت میں بڑھ رہے ہیں یا نہیں، اپنی سرگرمیوں کی اپنے تجربات کی روشنی میں ازسرنو جانچ کرنی چاہیے، اور جہاں جہاں غلطی ہوئی ہو اس کا کھل کر اعتراف کرنا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

کرس خصوصاً اس بات سے تشویش میں تھا کہ مغربی ممالک کی کمیونسٹوں کے لیے بڑھتی ہوئی عداوت کو پارٹی کے لیڈر سنجیدگی سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد جب وہ جرمنی واپس لوٹا تو اس نے وہاں سے لکھا:

1944 ہی میں مجھے یہ بات صاف نظر آنے لگی تھی کہ جرمن فاشزم کی شکست اپنے جلو میں ایک نئی صورتِ حال لے کر آئے گی جس میں امریکہ، برطانیہ اور سوویت روس کے مابین تضادات بہت زیادہ گہرے ہو جائیں گے۔ لیکن اس بنیادی امکان کو 1944 میں زیرِ بحث لانے کو (برٹش پارٹی میں) بعضوں نے بدعت قرار دیا تھا اور بعضوں کا خیال یہ تھا کہ یہ بات سچ ہو سکتی ہے لیکن اس پر کسی صورت میں گفتگو نہ کرنی چاہیے کیونکہ اس سے صرف انتشار ہی پھیلے گا۔

ہم جیسے لوگ جو برسوں سے پارٹی کے رابطے میں نہ تھے، اپنی لیڈر شپ کو ان مسائل کا سامنا کرنے کو آمادہ کرنے کے لیے کیا کر سکتے تھے؟ کرس نے اس بارے میں لکھا:

واپسی کے سفر کے دوران جہاز پر اور پھر ٹرین میں، میں ان تمام مسائل پر خوب غور کرتا رہا جن پر ہم نے گفتگو کی تھی، اور مستقبل کے لیے قابلِ عمل نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ تمھارا یہ خیال کہ تم ایک سال کا عرصہ ہندستان میں گزارو گے، اور میری یہ خواہش کہ میں کچھ وقت ملک سے باہر گزاروں — اس کے متعلق میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم واپس لوٹ آئیں اور جتنی جلدی ممکن ہو، ہمیں اپنے یہاں کے کام میں مدد شروع کر دینی چاہیے۔

لیکن میں اپنا ذہن بنا چکا تھا۔

پارٹی کانگریس جو نومبر کے آخری ہفتے میں منعقد ہوئی، میرے لیے ایک چشم کشا اور پریشان کن تجربہ ثابت ہوئی۔ میں تمام اجلاسوں کی اہم باتیں بطور یادداشت قلم بند کرتا رہا، اور بعد میں میں نے ایک طویل خط کرس کے نام لکھنا شروع کیا جس میں اس کی روداد اختصار کے ساتھ لکھنا چاہتا تھا — یہ خط کبھی پورا نہ ہو سکا، نہ بھیجا گیا، اس کا سبب شاید یہ تھا کہ میں پارٹی کے لیڈروں کے رویے اور طرزِ عمل

سے جس قدر گہرے صدمے سے دوچار ہوا تھا، اس کا سامنا کرنا مجھے بے حد مشکل نظر آرہا تھا۔ گذشتہ پالیسیوں کے احتساب کے لیے کسی قسم کی آمادگی دکھائی نہیں دی تھی — بلکہ اس کا الٹ ہی ہوتا نظر آیا تھا۔ کانگریس میں شرکت کرنے والے عام اراکین کا تاثر یہ تھا کہ لیڈرشپ نے طے کرلیا ہے کہ یہ دکھائیں کہ کوئی بات احتساب کے لائق ہے ہی نہیں۔ اور جب انھیں ایسے بہت سے اراکین کا سامنا کرنا پڑا جو کسی بھی صورت خاموش ہونے کو تیار نہ تھے، اور جنھوں نے براہِ راست ایگزیکٹو کمیٹی کے سامنے چیلنج رکھے، تو اس کا ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے ان کو یوں نظرانداز کرنے کی کوشش کی گویا تنقید کوئی سنجیدہ معاملہ ہی نہ ہو۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے ایک رکن بل رسٹ (Bill Rust) نے کہا کہ تنقید کی اہمیت کی ایگزیکٹو کمیٹی یقیناً معترف ہے لیکن وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف پہلے ہی کرچکی ہے (جو اس نے نہیں کیا تھا) اور اب ہر شخص کو چاہیے کہ وہ ماضی کا دکھڑا رونا بند کرے اور مستقبل کی طرف دیکھے۔

جس معاملے پر سب سے زیادہ نکتہ چینی ہوئی وہ کمیونزم کے تئیں مغربی ممالک کے سخت پڑتے ہوئے رویے کا سامنا کرنے میں ہماری لیڈرشپ کی ناکامی کا تھا۔ وہاں موجود بہت سے اراکین پارٹی لیڈروں کے 'براؤڈر لائن' قبول کرنے، اور اسی طرز پر برطانیہ میں پیش آمدہ واقعات کی غلط توضیح کرنے پر سخت معترض تھے۔ ہیری پولٹ نے ان کی تنقید کو قبول کرنے سے یکسر انکار کردیا۔ اس نے توجہ دلائی کہ امریکہ کی کمیونسٹ پارٹی کے دباؤ کے باوجود برطانوی پارٹی نے براؤڈر کی کتاب چھاپنے سے انکار کیا ہے۔ معترضین نے پوچھا کہ تب ہیری پولٹ نے اپنے کتابچے امن کیسے جیتیں میں جنگ کے بعد بھی 'ترقی پسند قدامت پرستوں' کے ساتھ اتحاد قائم رکھنے کی بات کیوں کی ہے؟ اس نے جواب دیا، اس لیے کہ ہم نے برطانوی عوام کے موڈ کا غلط اندازہ کیا تھا — لیکن اس کا مطلب براؤڈر کا موقف اختیار کرنا نہیں ہے۔ اور جب پوچھا گیا کہ اگر برطانوی پارٹی براؤڈر سے اختلاف رائے رکھتی تھی تو پارٹی نے اس کا اعلان کیوں نہیں کیا؟ جواب ملا کہ بڑے اختلافات کا اعلان کرکے پارٹی مشکلوں میں گھری اپنی ایک ساتھی پارٹی کو مزید پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہاں جمع ہونے والے مندوبین سے پولٹ نے مزید کہا، ''اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ دوسری کمیونسٹ پارٹیوں سے ہمارا جب اختلاف ہوگا تو ہم آپ کو اس کی ہوا لگنے دیں گے تو آپ کی یہ فکر ہی الٹی ہے۔''

میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان لوگوں پر پتھر پھینکوں جنھوں نے براؤڈر لائن اختیار کی تھی۔

لیکن کوئی بھی شخص امن کیسے جیتیں اور اس وقت کے ایسے ہی تحکمانہ بیانات کو اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں پڑھ سکتا کہ وہ کافی حد تک براوڈر کے خیالات کو قبول کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ پولٹ نے جس طرح بڑے اڑیل پن کے ساتھ اس قسم کے اثرات کا انکار کیا تھا اس سے مجھ پر بڑا منفی اثر پڑا، اور تنقید اور خود احتسابی کے باب میں اس خالص غیر کمیونسٹ رویے پر میں سخت برگشتہ خاطر تھا۔

میں یہ مانتا تھا کہ ہمارا کام جس نوعیت کا ہے اس میں خود احتسابی کی عادت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ صرف تھیوری میں ہی نہیں، میں نے یہ بات پارٹی کی ان دو برانچوں میں کام کر کے عملی طور پر بھی سیکھی تھی جہاں میں نے اپنا ابتدائی کمیونسٹ تجربہ حاصل کیا، یعنی وُڈفرڈ اور کیمبرج کے طالب علم کے طور پر۔ ان دونوں ہی گروپوں میں ہم اپنی غلطیوں کا کھلا اعتراف کھلے دل سے کرتے تھے اور ان سے سبق حاصل کرنے کے کیا طریقے اپنانے چاہییں اس پر بھی کھلی بحث کرتے تھے۔ یہ دیکھنا کہ ہماری پارٹی کا ہردل عزیز رہنما، جس کا میں کئی اعتبار سے بہت معترف تھا، ایسا کرنے میں ناکام ہے ایک ایسا صدمہ تھا جو میرے لیے بہت ناخوشگوار تھا۔

دت اور پولٹ کے ساتھ پریشان کن مڈبھیڑ کے بعد ہندستانی لیڈر ڈانگے کے ساتھ میری جان پہچان بڑھتی گئی۔ کولونیل کمیٹی کے سامنے میری حاضری کے بعد میں ہندستانی طالب علموں کی ہمراہی میں عموماً، لیکن کبھی کبھی اکیلا بھی، ڈانگے سے اکثر ملنے لگا تھا۔ وہ میرے ساتھ نجی دوستوں جیسا سلوک کرتے تھے اور جتنی صاف گوئی سے مجھ سے بات کرتے اس سے میں متحیر بھی ہوتا تھا اور خوش بھی۔ ایک دن جب ہم مشرقی یورپ میں پیش آنے والے واقعات کے درست تجزیے میں ہمارے رہنماؤں کی ناکامی پر بات کر رہے تھے، میری تحریک کے بغیر ڈانگے نے مختلف کمیونسٹ رہنماؤں کے بارے میں مجھے اپنی رائے سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں دمیتروف اور اس جیسے دوسرے کمیونسٹ لیڈر جو کچھ کہتے ہیں یا کہنا چاہیں گے میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے؛ صرف اسٹالن اور ٹیٹو ہی ایسے رہنما ہیں جن کے خیالات کو اس معاملے میں سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے۔ دمیتروف جیسی حیثیت والے لوگوں کے بارے میں اس طرح کی بے ادبی کی باتیں کمیونسٹ حلقوں میں پہلے کبھی نہ سنی گئی تھیں، اور اس صاف گوئی سے بلاشبہ میں نے خوشی محسوس کی۔

Scanned with CamScanner

ڈانگے سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستان کے سوال پر برطانوی پارٹی اور ہندستانی پارٹی کے متضاد موقف کے بارے میں کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ مسلم لیگ کے لیڈر، جو ایک طاقتور پارٹی تھی، جناح نے گذشتہ چند برسوں سے مسلمانوں کے لیے ایک طرح سے علیحدہ آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی دنوں میں اس کا تصور بڑا مبہم سا تھا، لیکن بعد میں یہی ''پاکستان'' (لغوی طور پر، 'پاک لوگوں کی زمین') کا مطالبہ کہلایا۔ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا خیال تھا کہ اس مطالبے کی حمایت کی جانی چاہیے۔ ہندستان کی مختلف قومیتوں کی قومی بیداری میں عمومی طور پر اضافہ ہوا تھا، اور ہندستانی کمیونسٹ پارٹی یہ مانتی تھی کہ تحریک آزادی کے رہنما اگر علاقائی مطالبوں اور امنگوں پر مناسب دھیان دیں تو نہ صرف یہ کہ کل ہند تحریک میں ان کو شامل کیا جا سکے گا بلکہ اس سے تحریک کی قوت میں اضافہ بھی ہوگا۔ ہندستانی کمیونسٹ پاکستان کے اس مطالبے کو اسی علاقائی قوم پرستی کے ایک 'مسخ شدہ' اظہار کے روپ میں دیکھتے تھے، اور یہ محسوس کرتے تھے کہ اس کا مناسب جواب یہ ہوگا کہ اس مطالبے کے بین السطور میں پوشیدہ جذبے کے ساتھ ہمدردی رکھی جائے، اور اس 'بگاڑ' کو درست کر کے اسے مذہبی کے بجائے ایک مناسب 'قومی' اظہار بنانے کی توقع رکھی جائے۔ اسی وجہ سے وہ پاکستان کے مطالبے کے حامی تھے — یہ حمایت بلاشبہ اس امید کے ساتھ تھی کہ تحریک اپنے فروغ کے ساتھ ان کی خواہش کے مطابق ترقی پسندانہ نہج اختیار کر لے گی۔ اس درمیان برطانوی پارٹی نے دت کی قیادت میں، جو ہندستان کے معاملات کے سرکردہ تجزیہ کار تھے، بہت مختلف موقف اختیار کیا جس میں جناح اور مسلم لیگ کے رجعت پسندانہ رول کو خصوصی طور پر نشان زد کیا گیا تھا۔

ڈانگے نے مجھے بتایا کہ 'سیاسی کمیٹی' کی ایک میٹنگ منعقد ہونے والی ہے جس میں اس مسئلے پر ان کی رپورٹ سنی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان پیدا ہونے والی متضاد رائے پر کم از کم اب سنجیدگی سے غور کیا جائے گا — سیاسی کمیٹی، سوویت کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو (جس کو سوویت مخالف صحافی 'ہمہ طاقتور پولٹ بیورو' کہتے تھے) کی برطانوی مترادف تھی۔ لیکن میٹنگ کے بعد جب میں ڈانگے سے ملا تو ان کی باتیں سن کر پارٹی کے رہنماؤں پر میرے اعتماد کو مزید زک پہنچی۔ صاف بات یہ تھی کہ ڈانگے نے جیسے ہی اپنی رپورٹ مکمل کی، پولٹ نے بحث کا آغاز اس جملے سے کیا، ''مجھ سے ہمیشہ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ میں بے خبر ہوں، جو میں ہوں، لیکن مجھے آج کی تاریخ

تک یہ بات معلوم نہ تھی کہ ہندستانی پارٹی نے پاکستان کی حمایت کی ہے۔''

بعد میں اس واقعے پر میں جتنا زیادہ غور کرتا گیا مجھے عبرت کے لیے اتنا ہی زیادہ مواد فراہم ہوتا گیا۔ سامراج کے خلاف عالمی پیمانے پر جاری جنگ میں روس اور چین کے ساتھ ساتھ ہندستان کا بھی کلیدی رول تھا۔ برطانوی پارٹی کی طے شدہ حکمتِ عملی یہ تھی کہ برطانوی مزدور طبقہ کولونیل لوگوں کی اپنی اپنی حکومتوں کا تختہ پلٹنے کی جدوجہد میں ان کے ساتھ ایک متحدہ محاذ بنائے، اور اس کے لیے لازمی تھا کہ برطانوی اور ہندستانی کمیونسٹ پارٹیوں کے مابین ممکنہ قریب ترین رشتے استوار ہوں۔ اور یہاں یہ پولٹ صاحب تھے، برطانوی پارٹی کے رہنما، جو یہ تک نہیں جانتے تھے کہ ہندستانی پارٹی پچھلے تین سال سے ایک ایسے مسئلے کی حامی ہے جو ہندستان کی سیاست میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کس قسم کے کمیونسٹ تھے؟ اور دت صاحب، جو تب سے برطانوی پارٹی کے لیڈر ہیں جب سے اس کی بنیاد پڑی، اور ہندستانی معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے کیوں یہ ذمے داری نہیں لی کہ وہ برطانوی پارٹی کی لیڈرشپ کو اس سے آگاہ کریں کہ ہندستانی کامریڈوں کا اس معاملے میں کیا نظریہ ہے؟ اور ذرا اس پر بھی غور کریں، کہ ڈانگے خود کس طرح کے کمیونسٹ تھے؟ وہ گذشتہ دو برس سے بھی زیادہ عرصے سے برطانیہ میں مقیم تھے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ موقف کے اس انحراف سے لاعلم رہے ہوں؟ اور اگر انھیں معلوم تھا تو یہ کیونکر ممکن ہوا کہ انھوں نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا؟ ہیری پولٹ کے مذکورہ بیان کے بارے میں واحد غیر معمولی بات جو ڈانگے کو محسوس ہوئی یہ تھی کہ انھیں پولٹ کی صاف گوئی پسند آئی تھی۔

مجھ میں ڈانگے کی دلچسپی، اور صاف گوئی کی ان کی خواہش سے میں خوشی محسوس کرتا تھا، لیکن اب ان کے بارے میں خاصے ابہام کا شکار ہوتا جارہا تھا۔ ان میں کئی ایسی باتیں تھیں جو مجھے ناگوار محسوس ہوتی تھیں۔ ایک تو یہ تھی کہ ان کے اطراف میں ہندستانی طالب علموں کا جو جمگھٹا لگا رہتا تھا، اس کے خوشامدانہ رویوں کو وہ بڑھاوا دیتے تھے۔ دوسرا یہ رویہ تھا کہ بمبئی کے انڈرورلڈ کے بدمعاشوں کے ساتھ اپنے قریبی تعلق پر وہ فخر ظاہر کرتے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کہانیوں پر، یا ان باتوں پر کتنا یقین کروں جو دوسرے لوگ مجھے ڈانگے کے بارے میں بتاتے تھے، لیکن یہ طے ہے کہ ان باتوں نے مجھے بے چین کردیا۔ لیکن میرے لیے ان تمام باتوں سے زیادہ وحشت خیز ہندستان

Scanned with CamScanner

کے مزدور طبقے کے تئیں ان کا مذاق اڑانے والا اور سنکی پن کا رویہ تھا۔ جب ہم کافی پینے کے لیے کسی ریستوراں میں جاتے تو وہ اس کی قیمت ادا کرنے پر مصر ہوتے اور اکثر یہ جملہ کہتے، ''پریشان نہ ہو، یہ قیمت ہندستانی مزدور طبقہ ادا کر رہا ہے۔'' اور جہاں تک مجھے معلوم تھا، یہ بات درست تھی۔ اس پر میرا ردعمل یہ تھا: (الف) ایسا نہیں ہونا چاہیے، اور (ب) اس سے بھی زیادہ یہ ضروری ہے کہ اس بارے میں گھٹیا مذاق نہ کیا جائے۔

اب مجھے اس پر تعجب ہونے لگا کہ انگلینڈ میں اپنے قیام کے دوران آخر وہ کیا کر رہے ہیں۔ مثلاً، اپنے اس علم اور تجربے کی بنیاد پر وہ ہندستان کے بارے میں وسیع پیمانے پر ایسی چیزیں لکھ سکتے تھے جن کا مقابلہ یہاں کا کوئی کمیونسٹ لیڈر نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن انھوں نے یہ کام نہیں کیا۔ کل ملا کر چند وقتی قسم کے پمفلٹ ہی انھوں نے اس دوران لکھے۔ وہ اپنا وقت اور توانائی کس طرح صرف کرتے تھے، اس بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔

دت، پولٹ اور اب ڈانگے... اس انجام کا اب مجھے سامنا کرنا ہی پڑا جو میرے لیے جتنا وحشت خیز تھا اتنا ہی ناقابل فرار بھی تھا — وہ یہ کہ کمیونسٹ رہنما جن سے میرا واسطہ پڑا، ایسے قابل تعریف اور مثالی کمیونسٹ نہیں تھے جیسا میں تصور کرتا تھا۔ آج کے قاری کو میرے لیے یہ بات سمجھانا مشکل ہے کہ پارٹی کے لیڈروں کا میری ذہنی تصویر پر پورا نہ اترنا میرے نزدیک اتنی تکلیف دہ بات کیوں تھی۔ کئی نسلوں سے مغربی جمہوری ممالک کے لوگوں کا رویہ اپنے سیاسی رہنماؤں اور کمیونسٹ ممالک کے رہنماؤں کے بارے میں کلبی (cynical) رہا ہے۔ یہ خبر کوئی نئی نہیں ہے کہ سیاست دانوں کے مقاصد ہمیشہ بے لوث نہیں ہوتے اور ان کے رویے اکثر اپنے اعلان شدہ سیاسی عقائد سے صریح تضاد رکھتے ہیں۔ میں اور میرے کمیونسٹ ساتھی روایتی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کے بارے میں، اس نظریے سے متفق تھے لیکن کمیونسٹ لیڈروں سے ہم نے اس کی کبھی توقع نہیں کی تھی۔ ہم کمیونسٹ اس وجہ سے تھے کیونکہ ہم دنیا کو ایک بہتر مقام بنانے کی کوششوں پر یقین رکھتے تھے — ہماری قدریں اور اصول میرے لیے ہمیشہ بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ وفادار کارکنوں کی پارٹی میں، جہاں اصول لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں، میرا عقیدہ یہ تھا کہ پارٹی کے رہنماؤں کو اصولوں کا کاربند سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

اب مجھے کسی نہ کسی طرح اپنی اس دریافت کے مقابل اپنے اس خیال سے مفاہمت کرنی تھی کہ ان لیڈروں میں کچھ باتیں ایسی موجود تھیں جن کا میں ان کی شخصیت میں اب بھی معترف تھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھیں جس طرح میں نے ان کو اب تک سمجھا تھا۔ چونکہ یہی حقیقت تھی اس لیے جتنی جلد مجھ پر عیاں ہو جاتی اتنا ہی بہتر تھا۔ کچھ بھی ہو، بہر حال یہ ایک بے حد پریشان کن تجربہ تھا۔

Scanned with CamScanner

4

پھر سے فوج میں

جنوری 1946 کی شروعات میں فوج نے مجھے ایک میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونے کو بلایا۔ بالآخر فیصلہ تو ہوا، لیکن اس طرح نہیں جس طرح میری خواہش تھی۔ بورڈ نے بتایا کہ اس کے ماہرین کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ ہندستان واپس جانے کے بعد میری حالت زیادہ خراب ہو گی یا نہیں، اس لیے انھوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ مجھے 'ٹراپیکل سروس کے لیے غیر موزوں' کے زمرے میں ڈال دیں۔ اب مجھے برطانوی فوج کے اپنے بنیادی یونٹ یارک شائر میں بلائے جانے کا انتظار کرنا تھا اور پھر اپنے یونٹ کا لام توڑے جانے تک وہیں رہنا تھا۔

مطلب یہ ہوا کہ اب میں ہندستان واپس نہیں جا رہا تھا۔ مستقبل کا میرا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب تک میں اس کی کسی حد تک توقع کرتا رہا تھا، تاہم مجھے اپنی سوچ کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بڑی کوششیں کرنی تھیں۔ جنگ ختم ہو چکی تھی، فوج کو اب میری ضرورت نہ تھی، لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی انتظار میں گھلنا تھا، کون جانے کتنے مہینوں تک؛ پھر سے اسی صورتِ حال سے سابقہ تھا جہاں صرف یہی انتظار ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا بتائے کہ اب کیا کریں۔

آئندہ ہدایات کے انتظار میں میں ہوم واپس لوٹ گیا۔

میں ملی اور ٹاٹس کے ساتھ اولڈ روڈ پر ٹھہرا لیکن اپنے وقت کا بیشتر حصہ فراوڈ کے ساتھ گزارنے کے

Scanned with CamScanner

لیے میں ہر روز سائیکل سے البیریز کالج چلا جاتا تھا۔ شدت کی سردی پڑ رہی تھی جبکہ دیہی کاٹج بڑی مشکل سے گرم ہوتی ہیں۔ میرے لیے جتنا ممکن تھا میں اتنی مدد کرتا، جلانے کے لیے آرے سے لکڑیاں چیرتا، اور شام کو کلیما کے سونے کے بعد فراوڈ کے لیے اکثر کسی ایسی کتاب سے بلند خوانی کرتا جو ان دنوں میرے مطالعے میں ہوتی۔ اگر کسی دن برف باری یا پھر زوروں کی بارش ہو رہی ہوتی تو میں رات فراوڈ ہی کے ہی گھر گزارتا تھا۔

میں نے ڈائری پھر سے لکھنی شروع کر دی تھی، لیکن لکھنے کو کچھ زیادہ نہ تھا۔ سب سے اہم واقعہ جو ان دنوں میں ہوا وہ فراوڈ کی پڑوسن کے ساتھ پیش آنے والا ایک ڈراما تھا۔ اس کا ایک کرایہ دار باب (Bob) تھا جو ہر روز رات گئے پی کر لوٹتا تھا اور ہر شخص کی نیند خراب کرتا تھا۔ وہ اس سے بری طرح اکتا چکی تھی اور اس نے اس معاملے کو نمٹانے کی ٹھان لی تھی۔ اس لیے وہ ایک دن اپنے کتے جیس (Jess) کو ساتھ لیے ملی کے پاس آ گئی۔ وہ رات وہ ملی کے ہاں گزارنا چاہتی تھی۔ اس نے ملی کو بتایا کہ اپنی کاٹج کا تالا لگا کر اس نے چابی فراوڈ کو اس ہدایت کے ساتھ دے دی ہے کہ باب کو گھر میں نہیں گھسنے دینا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم آج فراوڈ کے ساتھ رہ کر پیش آنے والی صورت حال سے نمٹنے میں اس کی مدد کرو۔ میں سائیکل سے فراوڈ کے ہاں جا پہنچا اور رات میں تقریباً دس بجے تک فراوڈ کو کتاب پڑھ کر سناتا رہا۔ اس کے بعد ہم نے روشنیاں بجھا دیں اور انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر گئے بعد باب آ گیا، اور یہ کہتے ہوئے دروازہ پیٹنے لگا، ''میڈم! وہ چلی گئی ہے۔ باہر بہت سردی ہے۔ مجھے اندر آنے دیں۔'' ہم نے ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اسے گھر میں نہیں آنے دیا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے ہم سو گئے۔ صبح کو فراوڈ نے بتایا کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ واپس آ گیا تھا اور کاٹج کا صدر دروازہ زبردستی کھول کر سیڑھیوں کے نیچے سو گیا تھا۔ مجھے کچھ بھی سنائی نہ دیا تھا، حالانکہ میں اچھی طرح نہیں سو پایا تھا۔ اس صبح، بعد میں جب میں دودھ لینے کے لیے گیا تو وہ مجھے واپسی میں ملا۔ اپنے ساتھ کیے گئے سلوک پر وہ بہت چوٹ کھایا ہوا تھا۔ کہنے لگا، ''کتنی شرم کی بات ہے، ہاں، کتنی شرم کی بات!''

ایک اور قسم کی ہلکی سی سنسنی اس وقت پیدا ہوئی جب میں نے لیڈز کے اپنے ہندستانی دوست راشد کو مدعو کیا۔ (راشد کا املا عموماً Rashid لکھا جاتا ہے لیکن وہ ہمیشہ Raschid لکھتا تھا)۔ ہوم

میں کسی نے بھی سانولی رنگت کے لوگوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب میں اسے ساتھ لے کر اسٹیشن سے واپس لوٹا تو اسے دیکھنے کے لیے ہر کوئی اپنے اپنے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ ایک بچہ اپنی ماں کو بلانے کے لیے دوڑ پڑا۔ میں اس بات سے ذرا ہراساں تھا کہ میرے گھر والے کس طرح کا ردعمل ظاہر کریں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ فراؤڈ ٹھیک ہی رہے گی، لیکن کلیفا، جو صرف ڈیڑھ برس کی تھی، کسی مصلحت کوشی کی ضرورت کو کیونکر محسوس کرسکتی تھی؟ لیکن اس کا ردعمل میرے اندیشے سے کم پریشان کن تھا۔ راشد کے حق میں ملی نے از حد نرم 'مہذب' سلوک روا رکھا، اور ہماری چائے کے لیے انڈوں اور بیکن (سؤر کی پشت یا پٹھوں کے گوشت) کا خصوصی اہتمام کیا، ان کو یہ اندازہ نہ تھا مسلمان اسے ناپسند کرتے ہیں۔ تاہم یہ کوئی مسئلہ نہیں بنا کیونکہ راشد کوئی پرہیزگار مسلمان نہیں تھا۔

اس کی آمد میرے لیے ایک خوشگوار وقفے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہاں میں ہر اس شخص سے خود کو دور محسوس کرتا تھا جس کے ساتھ میری دلچسپیاں مشترک تھیں، کیونکہ صرف خط و کتابت ہی پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ پیگوٹی سے معلوم ہوا کہ کرس کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو لندن اسکول آف اکنامکس میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے فوج سے سبکدوش ہو سکتا ہے، لیکن لگتا یہ ہے کہ کرس ابھی وہیں رہ کر معمول کے مطابق نمبر آنے پر اپنی موقوفی کا انتظار کرنا بہتر سمجھ رہا ہے۔ پیگوٹی اب چھ ماہ کی حاملہ تھی اور مجھے یہ لگ رہا تھا کہ کرس باپ کی حیثیت سے نازل ہونے والی ذمے داریوں سے گریز کر رہا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بچنا ہی چاہتا ہو۔ یہ بات کہنے کے لیے میں اسے خط لکھا، اور اپنی بات میں نے پرزور طریقے سے کہی، جیسا کہ ہم لوگ ہمیشہ کرتے تھے۔ اس نے جواباً لکھا:

> ڈیر جارج، تمھارا خط پا کر بڑی خوشی ہوئی جس نے مجھ تک پہنچنے میں اتفاقاً آٹھ دن کا وقت لیا۔ اس پر 31 دسمبر 1945 کی مہر لگی ہے۔ دوسرے خط جو اسی تاریخ کو انگلینڈ سے بھیجے گئے، تین جنوری کو مل گئے تھے۔ یوں ایسا لگتا ہے کہ جو لوگ ہمارے خط پڑھتے ہیں، انھیں ہمارے خط سمجھنے میں خصوصی دشواری ہوتی ہے۔

اس کے بعد بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اس نے اس نے مجھے یوں نشانہ بنایا:

> ہو سکتا ہے کہ میں ایک خودغرض گھامڑ ہوں، لیکن اتنا نہیں، جتنا تم حرامی مجھے ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو—

Scanned with CamScanner

اور اس کے بعد وہ مدلل انداز میں میرے اتہام کو رد کرتا گیا۔ اس خط کو میں نے سنبھال کر رکھا۔ اس میں ہماری قربت کا اس سے کہیں زیادہ بھرپور اظہار ہے جو کسی شائستہ خط سے ظاہر ہو سکتی تھی۔

انھی دنوں مجھے شدید قسم کی سردی ہو گئی اور میں نے بستر پکڑ لیا۔ بغیر نہائے دھوئے اور بنا داڑھی بنائے میں کئی دن تک بستر میں پڑا رہا۔ نزلہ بہت شدید تھا لیکن میں خوش تھا کہ لاحاصل انتظار میں مکھیاں مارنے اور ملی کی گفتگو کے بے کیف اثرات سے نجات ملی۔ میں نے خود کو مطالعے میں غرق کر لیا — اے ایل مورٹن (A L Morton) کی انگلینڈ کی عوامی تاریخ (A People's History of England) اور الف لیلہ (The Arabian Nights) کے لین (Lane) کے ایڈیشن (جس کے وضاحتی حواشی میرے خیال میں نہایت عمدہ تھے) سے لے کر لاطینی ادیب پیٹرونیس (Petronius) کی کتاب Satiricon کے ترجمے تک، سب کو حرف بہ حرف پڑھ ڈالا۔ آخر الذکر کتاب ایک رومن ضیافت کی بڑی زندہ تصویر ہے (جو کہیں کہیں عریاں بھی ہے)۔ میں نے ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے مجلّے .People's War کے پچھلے شمارے بھی دیکھے جو میں ہندستان سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، اور طے کیا کہ ان میں شامل تمام مضامین کا اشاریہ تیار کروں گا۔ میں نے اس کے اردو قالب قومی جنگ کو بھی پڑھنے کی کوشش کی — اردو رسمِ خط میں نے ہندستان میں اپنے قیام کے دوران سیکھ لیا تھا — اور یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ اردو پڑھنا مجھے زیادہ مشکل نہیں لگا۔ میں نے طے کیا کہ اردو پڑھنے اور لکھنے کو مستقل طور پر تب تک وقت دوں گا جب تک آسانی کے ساتھ پڑھنا لکھنا نہ سیکھ لوں۔ میں نے ہندستان کی ان انقلابی تحریکوں کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کے بارے میں بھی غور کرنا شروع کر دیا جو بالآخر کمیونسٹ پارٹی کے روپ میں متحد ہو گئیں۔

جنوری کے آخر میں فوج سے وہ خط آ پہنچا جس کا طویل مدت سے انتظار تھا۔ مجھے بیورلی میں ایسٹ یارک شائر رجمنٹ ڈپو میں تین دن کے اندر حاضر ہونا تھا۔

ماں کے لیے یہ خبر ناگہانی تھی — وہ بولا گئی اور معذرت کرنے لگی کہ میرے قیام کے دوران یہاں بہت بدنظمی اور افراتفری رہی۔ میں نے چاہا کہ میں ایمانداری سے اس کا جواب دوں لیکن خود کو اس کے لیے تیار نہ کر سکا، اس لیے میں نے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کھانا عمدہ تھا، اور ہم لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ عموماً خوشگوار اور اچھا وقت گزارا، اور پڑھنے لکھنے کے لیے بھی

Scanned with CamScanner

مناسب جگہ اور موقعے حاصل رہے۔ ملی نے کہا، "ہاں ٹھیک ہے، یہی سب سے ضروری بھی تھا۔"

ایک سرد صبح کو ساڑھے سات بجے میں نے اپنی سائیکل سنبھالی، اپنا تھیلا اس کے ہینڈل میں ٹانگا اور ہوم اسٹیشن کے لیے چل دیا۔ اسٹیشن پر میں نے اپنے لیے اور اپنی سائیکل کے لیے دو شلنگ، گیارہ پینی کا کرایہ ادا کیا اور بیورلی کے لیے سوار ہو گیا۔

فوجی زندگی میں واپس جانا، خصوصاً ایسے وقت میں جب جنگ ختم ہو چکی تھی، ایک لایعنی کسرت محسوس ہوئی۔ مجھ جیسے ہزارہا تھے جو اپنے اپنے رجمنٹل ڈپو میں خالی خولی گھوم رہے تھے اور انتظار کے سوا انھیں کچھ کام نہ تھا۔ اچھی بات صرف اتنی تھی کہ فی الحال ہمیں روزی کے لیے فکر نہیں کرنی تھی۔

میرے کمانڈنگ افسر نے طے کیا کہ چونکہ میرے پاس یونیورسٹی ڈگری ہے اس لیے وہ مجھے تعلیمی کام سونپے گا۔ فوجیوں کو مصروف رکھنے کے لیے میرا کام 'اپنی پسند کے کسی بھی موضوع' پر لیکچر دینا تھا۔ اگلے دن میں نے اپنا پہلا لیکچر جرمنی کی عصری صورتِ حال پر دیا۔ یہ اس معلومات پر مبنی تھا جو میں نے کرس کے خطوں سے حاصل کی تھی۔ یہ خاصا کامیاب رہا اور اگلے دن میں نے دو الگ الگ گروپوں کے سامنے پھر سے اسی موضوع پر لیکچر دیا۔ ان میں موضوع سے دلچسپی پیدا کرانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور میرے لیکچر پر زوردار بحث ہوئی۔ میرے لیے یہ جاننے کا یہ ایک چشم کشا موقع تھا کہ بڑے بڑے مسائل پر عام فوجی کس طرح سوچتے ہیں۔ اطالویوں کے لیے ان کا رویہ معاندانہ تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ جرمنوں کے لیے وہ فراخدلی کا جذبہ رکھتے تھے۔ سرد جنگ کے نقطۂ نظر کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان سے انھوں نے ابھی سے متاثر ہونا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ اگلا سب سے بڑا خطرہ روس ہوگا اور اس کے خلاف جنگ کرنے کے لیے ہمیں جرمنوں کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کوئی ایسی خراب بھی پوسٹنگ نہیں ہے کہ اگلی ہی صبح مجھے میس میں یہ اطلاع ملی کہ مجھے یارک شائر کے رچمنڈ ڈپو (Richmond Depot) بھیجا جا رہا ہے۔ اس طرح تدریس میں میرے اس مختصر کیریر کا خاتمہ ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

جب میں پہلی بار رچمنڈ پہنچا تو سخت سردی پڑ رہی تھی —— زمین پر برف بچھی تھی جو مئی تک جمی رہتی تھی۔ وہاں مجھے انتظامی آفس میں فوجیوں کی تنخواہ کے معاملات دیکھنے کا کام سونپا گیا۔ حساب کتاب میں میرا حال بہت گیا گزرا ہے، اور اس سے قبل صرف ایک ہی بار فوج میں جب مجھے آفس کا کام سونپا گیا تھا تو میں اس قدر پریشان ہوا تھا کہ بس اعصابی خلل کا شکار ہوتے ہوتے بچا۔ اس لیے یہ شروعات کچھ اچھی نہ تھی۔ پہلے دن کھانے کی میز پر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے افسروں کا مجھ پر خاصا منفی اثر پڑا، اور ان میں سے ایک نے مجھے جو کچھ بتایا اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا —— ہماری تفریح طبع کے لیے 'ڈیوٹی رقص' جیسی چیزوں کا بھی اہتمام تھا۔ میرا اگلا پورا دن اپنے لیے موزوں لباس مہیا کرنے کی ناکام کوشش میں صرف ہوا۔ جنگ کے زمانے میں کفایت شعاری کی پالیسی کی وجہ سے اس طرح کے کام میں وقت کا بے جا صرفہ ہوتا تھا۔ ساڑھے چودہ انچ سائز کے خاکی کالروں کی تلاش کا ذکر میری اس وقت کی ڈائری میں کئی دن تک بار بار آیا ہے۔

امن کے دنوں میں ایک جونیئر افسر کا دن جن لایعنی سرگرمیوں میں گزرتا ہے ویسے ہی معمولات میں ہم واپس آ گئے تھے۔ فوجیوں کو ڈرل کرتے ہوئے دیکھنا، بیرکوں کا معائنہ، رائفلوں کا معائنہ کرنا، وغیرہ۔ رچمنڈ آنے کے تین ہفتے بعد کے میرے روزنامچے میں نے کچھ اس طرح سے اپنا غصہ ظاہر کیا:

> میرے دن بغیر کسی واقعے کے، یوں ہی ضائع ہو رہے ہیں۔ پورے پانچ سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود، جب میں نچلا درجہ چھوڑ کے آفیسر کیڈٹ ٹریننگ یونٹ میں شامل ہوا تھا، تب سے اب تک مایوسی ہی غالب احساس ہے۔ میں صبح سات بجے یا اس کے بعد اٹھتا ہوں، نہاتا ہوں، داڑھی بناتا ہوں، کپڑے پہنتا ہوں، بال کاڑھتا ہوں، ناشتے کے لیے جاتا ہوں، اور اس کے بعد وہاں سے تقریباً 8:05 اور 8:15 بجے کے درمیان کمپنی آفس کے لیے روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس وقت وہاں چولھا جلاتے ہوئے اردلی کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا، اور کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ کمپنی کوارٹر ماسٹر سارجنٹ کوئی ساڑھے آٹھ اور پونے نو بجے کے درمیان داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی کرنے کو کوئی کوئی کام نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ دستخط کے لیے کبھی کوئی کاغذ آ جائے۔ صرف اس

Scanned with CamScanner

روز میں پورے دن کے لیے مصروف ہوتا ہوں جس دن تنخواہ بانٹی جاتی ہے — اور پورے دن کا مطلب ہے پونے دس بجے سے صرف ساڑھے تین بجے تک۔ میری، جو اے ٹی ایس کلرک ہے، اور کمپنی کوارٹر ماسٹر سارجنٹ سب کچھ جانتے ہیں، مجھے اپنے کام کے بارے میں کچھ نہیں آتا، اور وہ دونوں اپنے اپنے کاموں میں اتنا مصروف ہیں کہ مجھے سکھانے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں۔ یہ بھی ہے کہ اس خالی وقت میں کوئی نہ تو ڈھنگ سے پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی خط لکھ سکتا ہے۔ میں اس جگہ سے عموماً ساڑھے چار بجے رخصت ہوتا ہوں، چائے پیتا ہوں اور سوا پانچ بجے تک اپنے کمرے پر پہنچتا ہوں جو سرد، خالی اور ناخوشگوار ہے۔ اگر لکڑی جلاؤ تو دھواں اٹھتا ہے، اور اگر بجھا کوئلہ جلاؤ تو یہ جلد ہی ٹھنڈا ہونے لگتا ہے۔ اب اسے جلائے رکھنے کے لیے اس کے سامنے پنکھا رکھو تو ساری گرمائی چمنی کے راستے باہر چلی جاتی ہے۔ خالی وقت کی یہ سرگرمی ایسی فراریت بن جاتی ہے جس سے نجات نہیں۔

یہ کوفت کبھی کبھار کسی ہنسانے والے واقعے کے سبب دور ہوتی تھی۔ ایک بار یہ ہوا کہ میں اردلی افسر کے طور پر سنتری کی جگہ سنبھالنے کو چلا، جو میرے فرائض کا ایک حصہ تھا۔ میں بیرک چوک کے پار چیخ چیخ کر احکام دینے لگا۔ ہندستان کے لیے بھیجے جانے سے قبل میں سیکڑوں مرتبہ یہ کام کر چکا تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ اردلی سارجنٹ کھڑا ہوا دانت نکوس رہا ہے۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا کہ اب افسر یہ کام نہیں کرتے — ظاہر تھا کہ اب افسر کا کام ڈرل میں ایسا ہی تھا جیسے کسی کی شادی میں ایک فاضل ڈکر کا ہونا (سخت گیر اور شہوت پرست فوجی گروہ اسی طرح کی باتیں کرتے تھے) جبکہ سارا کام سارجنٹ کو کرنا ہوتا تھا۔ ایک اور موقعے پر میں اور میرا ساتھی افسر آلف ڈکنسن (Alf Dickinson) دو سارجنٹوں کے ساتھ آفس کے باہر کھڑے ہوئے تھے کہ سارجنٹوں نے ادھر سے گزرنے والی اے ٹی ایس لڑکیوں پر فقرہ کسا۔ اے ٹی ایس فوج کی زنانہ شاخ تھی، اور اس کی کچھ لڑکیاں کمپنی آفس میں کام کر رہی تھیں۔ سارجنٹ ہاویل (Howell) کا جملہ تھا، ''وہ spanner face (ڈھبری کسنے کے شکنجے جیسے چہرے والی) کہلاتی ہے — کیونکہ جب بھی وہ کسی کی طرف دیکھتی ہے اس کی ڈھبریاں کس جاتی ہیں۔''

میں اور آلف ڈکنسن ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ وہ ایک گھڑی ساز کا بیٹا تھا اور خود بھی گھڑیوں کی مرمت کرنا جانتا تھا۔ اس کا لہجہ یارک شائر کا پاٹ دار لہجہ تھا، اور اس کے ذہن میں جو کچھ ہوتا وہ اس کو دوٹوک کہہ ڈالتا تھا۔ ایک دن جب ہمارا خدمت گار صبح کی چائے لے کر آیا تو ڈکنسن اس پر پھٹ پڑا، ''چائے؟ تم اسے چائے کہتے ہو؟ اگر یہ چائے ہے تو پھر میں لکڑی کی ٹانگ والی چینی عورت ہوں۔'' اس کا گفتگو کا انداز مجھے پسند تھا کیونکہ وہ ہر ایک شخص سے یہ مان کر بات کرتا تھا کہ پہلے ہم انسان ہیں، اور افسر ہونے سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ڈکنسن اور میں، ہمارے باہمی بنیادی اختلافات سے بخوبی واقف تھے اور انھیں اپنے تعلقات کی راہ میں نہ آنے دیتے تھے۔ ایک اتوار کی ٹھنڈی مگر روشن سہ پہر کو جب ہم ساتھ ساتھ ایزبی ابی (Easby Abbey) کی طرف جا رہے تھے، اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ حال ہی میں ہونے والے انتخابات میں میں نے لیبر پارٹی کو ووٹ دیا تھا۔ ''تم ضرور پاگل ہو گئے ہو،'' اس نے کہا۔ وہ خود ایک راسخ قسم کا ٹوری (برطانیہ کی قدامت پسند سیاسی جماعت کا حامی) تھا، اور مجھے معلوم تھا کہ اس کی نظر میں سرمایہ دارانہ نظام میں کچھ بھی غلط کیوں نہ تھا۔ وہ ایک ایسی چھوٹی سی فرم میں کام کر چکا تھا جس میں مالک بھی اتنی ہی محنت سے کام کرتا تھا جتنی کہ دوسرے لوگ، اور وہاں ایک طرح کا فیض رساں پدری نظام قائم تھا۔

اپنے دوسرے ساتھی افسروں کے ساتھ بھی میرا نباہ بغیر کسی اختلاف کے ہو رہا تھا، اور خاموش طبع اور غیر دنیادار ہونے کے باوجود مجھے خاصی پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا (لفظ 'خاموش طبع' پر میرے سیاسی کامریڈ خاصے محظوظ ہوں گے)۔ لیکن اس مسلسل فریب سے جو مجھے اصل مسائل سے دور کیے ہوئے تھا، میں بے چین ہوا تھا۔ جب بھی وقت ملتا میں مطالعہ کرتا، لیکن ذہن کو یکسو کرنا مجھے بڑا مشکل لگتا تھا۔ جتنی توانائی دلیلوں اور بحثوں کے ذریعے اپنے خیالات کو پرکھنے کے بعد بچ سکتی ہے مجھ میں اس کی آدھی بھی توانائی نہیں بچتی تھی۔ کبھی کبھار میں خط لکھتا، اور قومی جنگ کا مطالعہ کر کے اپنی اردو کو تازہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ سب سے زیادہ ناگوار بات یہ تھی کہ ہر شام کو میرے پاس کئی گھنٹے کا وقت ہوتا تھا لیکن اس کا کوئی مصرف میرے پاس نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

وہاں کرنے کے لیے کچھ بھی نہ ہونے کا فائدہ یہ تھا کہ چھٹیاں لینا آسان تھا۔ چھٹی لے کر کرس جرمنی سے واپس آچکا تھا۔ کوئی دو ہفتے پہلے اس کا بیٹا ایلن (Alan) پیدا ہو چکا تھا، اور پیکوٹی نے اپنے خط میں یہ اصرار مجھے بھی مدعو کیا تھا۔ چونکہ اپنے حمل کی مدت میں وہ خود بھی کرس سے نہیں ملی تھی، اس لیے اس کا یہ دعوت نامہ ان لوگوں کی زندگی میں میرے خاص مقام کو تسلیم کرنے کا ایک مخصوص فراخدلانہ اشارہ تھا۔ اس کے بعد کئی ہفتہ واری چھٹیوں کے دن میں راشد اور پیٹر چیپل سے ملنے لیڈز گیا، جہاں ہم رات رات بھر، صبح کے آثار نمایاں ہونے تک، ہندستان میں رونما ہونے والے واقعات پر باتیں کرتے رہتے تھے۔ پیٹر نے ہندستان کے سیاسی مسائل کے موضوع پر لیڈز کے ہندستانی طالب علموں کے ساتھ مذاکروں کا اہتمام کیا۔ میری تقریریں خاصی کامیاب رہیں۔ میں نے روزنامچے میں درج کیا:

> میں جتنی بار ان سے ملتا ہوں، ان کے لیے میری پسندیدگی بڑھ جاتی ہے — لیکن میں اسے مکمل پسندیدگی نہیں سمجھتا کیونکہ میں ان سے ایسے حالات میں ملتا ہوں جو میرے لیے قدرے خوشامدانہ ہوتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ یہ لوگ جب تک یہاں ہیں، میں ان کے لیے بہت کچھ کروں۔ اس ملک میں ان کے قریب رہ کر کام کرنا میرے نزدیک ہندستان میں سی پی آئی کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد دوسری بہترین بات ہوگی۔

پارٹی لیڈروں کے بارے میں میرے فریبِ نظر کے دور ہونے کی کہانیاں پیٹر نے سنیں۔ ان کی معقولیت سے اس نے انکار تو نہیں کیا لیکن یہ بات بھی صاف تھی کہ میرے رویے سے، جس کو وہ میری تلخی سمجھتا تھا، اسے زیادہ صدمہ پہنچا تھا۔ لیڈروں پر اعتماد کرنے کا وہ اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اس کا طرزِ فکر ہی یہ ہو گیا تھا کہ انسان بہترین چیزوں پر یقین رکھنے کی کوشش کرے اور ان پر ہمیشہ اعتماد کرتا رہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں ابھی تک اس حقیقت کو گلے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اعلیٰ ترین رتبوں پر فائز لیڈر شپ کے نزدیک ایسے بہت سے بنیادی اصولوں کا کوئی مطلب نہیں ہے جو یہ بتاتے ہیں کہ کمیونسٹ کس طرح کام کریں اور آپسی تعلق کو محسوس کریں۔

برطانوی اور ہندستانی کمیونسٹ پارٹیوں کے مابین اختلافات ایک بار پھر سے ابھرنے لگے تھے۔ لیبر منتھلی کے مارچ 1946 کے شمارے میں دت نے لکھا کہ کمیونسٹوں کو پاکستان کا

Scanned with CamScanner

مطالبہ مسترد کر دینا چاہیے ـــــ دراصل یہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی پر حملہ تھا جس نے اس مطالبے کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔ اس بنیادی معاملے پر میرا دت سے کوئی اختلاف نہیں تھا کہ مسلم لیگ کے قول وفعل سے یہ بات واضح ہوتی جارہی تھی کہ اس مطالبے کا تعلق قومی بیداری سے بالکل نہیں بلکہ مسلم عصبیت سے بہت زیادہ تھا۔ لیکن دت نے صورتِ حال کی جو تصویر پیش کی تھی، یا جس طرح وہ اس کی سمجھ میں آئی، وہ مزید پیچیدہ تھی۔ مسلم شاونیت کے فروغ کا سبب ہندو اکثریت کے مسلم مخالف تعصبات، اور ایک اہم اور بڑی اقلیت کے طور پر مسلمانوں کے جائز حقوق کو مناسب ڈھنگ سے تسلیم نہ کرنا تھا۔ ان حقوق کو تسلیم کرانے کے لیے دباؤ ڈالنے میں ہندستانی کمیونسٹ حق بجانب تھے؛ اور اتنے ہی حق بجانب مسلمانوں پر یہ ماننے کے لیے دباؤ ڈالنے میں بھی تھے کہ مستقبل کا مفید ترین سودا یہی ہوگا کہ وہ انگریزوں کے خلاف کل ہند تحریکِ آزادی میں دوستانہ اتحاد پیدا کرنے کی کوششیں کریں، اور اس کے خلاف کام نہ کریں۔

دت کے خیالات نے مجھے اتنا مشتعل نہیں کیا جتنا اس بات نے کہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی سے برطانوی پارٹی کے اختلاف کی بات کو اس نے ایسے وقت میں برسرِ عام کیا جب ہندستانی کمیونسٹوں کے خلاف دشمنی کا ماحول اپنے عروج پر تھا، اور اس بات سے بھی میں سخت آزردہ تھا کہ ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کو پہلے سے خبردار کیے بغیر اس مضمون کو شائع کیا گیا۔ یہ وہی برطانوی لیڈر تھے جو صرف چند مہینے پہلے امریکی پارٹی کے ساتھ اپنے اختلافات ظاہر نہ کرنے کی یہ دلیل دے رہے تھے کہ امریکی کمیونسٹ اس وقت جن مشکلوں میں ہیں ہم ان میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے اس رویے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سفید فام کمیونسٹ پارٹیوں کو تو وہ اپنا ہمسر تسلیم کرتے تھے لیکن براؤن کولونیل کامریڈوں کو اس قسم کی کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔

فوجی نوکری سے میری سبکدوشی میں بس کچھ ہی عرصہ باقی تھا اور مجھے کوئی روزگار تلاش کرنا تھا، لیکن میں تھا کہ ابھی تک اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچ رہا تھا۔ استاد کے طور پر تربیت حاصل کرنے کے لیے جو گرانٹ ان دنوں فراہم کی جارہی تھی، میں نے اس کے لیے درخواست دینے کے بارے میں سوچا تھا لیکن اس سمت میں پیش رفت کے لیے کوئی جوش محسوس نہیں کر رہا تھا۔ پیٹر اُن دنوں سے ہی

جب میں کیمبرج میں پارٹی برانچ کا سربراہ تھا، میرا بڑا معترف تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ پارٹی کا کل وقتی کارکن بننے کے بارے میں مجھے دوبارہ غور کرنا چاہیے، اور بہر طور مجھے اب بھی اپنے لیے یہی راہ پسند تھی —لیڈروں کے بارے میں میرا فریب دور ہو جانے کے باوجود میری وفاداری پر ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا تھا— لیکن موجودہ حالات میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اب میرے اختیار میں نہ تھی۔ کولونیل کمیٹی میں میری دریدہ دہنی کی طرف دت کی توجہ ضرور دلائی گئی ہوگی، اور اس کو پسند نہیں کیا گیا ہوگا۔ اگر فوج نے میرے ہندستان لوٹنے کے منصوبے میں اڑنگا نہ لگایا ہوتا تو بھی یہ تقریباً طے تھا کہ کل وقتی کارکن بننے کے میرے ارادے کی انھوں نے جو حمایت شروع میں کی تھی وہ اب واپس لے لیں گے۔

محض حسن اتفاق سے ایک اور سمت میں کچھ پیش رفت کی مجھے امید نظر آئی۔ فراوڈ کی بہن نے جو اخبار نیو اسٹیٹس مین (New Statesman) منگاتی تھی، ایک روز اس میں لندن یونیورسٹی کے ایک کالج، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (School of Oriental and African Studies- SOAS) میں طالب علموں کے داخلے سے متعلق ایک اشتہار دیکھا۔ وظیفے کے ساتھ یہ داخلے کئی مضامین کے علاوہ اردو میں بھی دیے جا رہے تھے۔ داخلے کے خواہاں امیدواروں کے لیے لازم تھا کہ انھوں نے کسی برطانوی یونیورسٹی سے آنرز گریجویٹ کی سند لے رکھی ہو، لیکن وہ ایک مرتبہ پھر سے بی اے آنرز کا نصاب پڑھنے کو تیار ہوں —اور اس کے لیے انھیں 250 سے 350 پونڈ سالانہ کی رقم کا ٹیکس فری وظیفہ تین یا چار سال کے لیے ملنا تھا، جو یقیناً اتنی رقم تھی کہ اس میں فراغت کے ساتھ گزارا ہو سکتا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ سواس (SOAS) کس قسم کا ادارہ ہے اور وہ تعلیم کے لیے وظیفہ کیوں دے رہا ہے۔ میں نے صرف اتنا سوچا کہ مجھے ایک غیر متوقع اور بڑا خوش آئند موقع مل رہا ہے جس کا فائدہ اٹھا کر میں اردو کے ذریعے ہندستان کے بارے میں اپنے علم کو وسیع کر سکتا ہوں، اور مجھے ہر حال میں داخلہ لے لینا چاہیے۔ اگر سواس نے ملیالم (دکنی ہندستان میں واقع ریاست کیرالہ کی زبان) پڑھنے کے لیے بھی وظیفہ دیا ہوتا تو میں اس کو ترجیح دیتا— میرے فوجی یونٹ کے سپاہیوں میں بہت سے لوگ ملیالی تھے، اور وہ مجھے بہت پر کشش لوگ لگتے تھے۔ لیکن اس خیال سے ہی میں بڑا جوش محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنی اردو کی

Scanned with CamScanner

تعلیم کو آگے بڑھا سکوں گا، اور اس بات سے بہت پر امید تھا کہ یہ زبان مجھے پہلے ہی سے بولنی آتی ہے اور میں اس کا رسم خط بھی جانتا ہوں، اس سے داخلہ ملنے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ حالانکہ کاغذ کا واحد ٹکڑا جس سے اردو میں میری استطاعت کی سند ملتی تھی وہ سرٹیفکیٹ تھا جو میں نے ہندستانی فوج کا لوئر لیول امتحان پاس کر کے حاصل کیا تھا — اس کا معیار کچھ اچھا نہ تھا، اور یہ صرف اتنی سی استطاعت حاصل کرنے کے لیے دیا جاتا تھا کہ آپ اردو کو رومن رسمِ خط میں لکھنا پڑھنا جان لیں۔ ایک امتحان ہائر لیول کا بھی ہوتا تھا جس میں بیٹھنے کا خیال مجھے کبھی نہیں گزرا، لیکن اس کے لیے ضروری تیاری میں نے کر لی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں اسے پاس بھی کر سکتا ہوں۔

دو باتیں ایسی تھیں جن کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ میرے خلاف جائیں گی۔ ایک میری کیمبرج ڈگری، جس کے بارے میں کچھ نہ ہی کہا جائے تو بہتر ہے، بالکل متاثر کن نہ تھی — میں اپنا سارا وقت سیاسی سرگرمیوں میں صرف کرتا تھا اور مطالعے کو اقل ترین وقت دیا کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جس آنرز ڈگری کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ ڈگری میرے پاس ہے بھی یا نہیں — مجھے جو دستاویز دی گئی تھی اس پر صرف اتنا درج تھا کہ میں نے یونیورسٹی آف کیمبرج سے بی اے کیا ہے، اور میرا اندازہ یہ تھا کہ صرف 'بی اے' لکھنا کیمبرج والوں کا ایک مہذبانہ طریقہ تھا یہ بتانے کا کہ میری کارگزاری اتنی خراب ہے کہ وہ اس پر آنرز کی ڈگری نہیں دے سکتے۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں ایک جانا پہچانا کمیونسٹ تھا۔ چرچل نے حال ہی میں امریکہ کے فلٹن شہر میں ایک تقریر کی تھی جس میں مشرقی یورپ میں سوویت یونین کے رول کے بارے میں یہ مشہور فقرہ استعمال کیا تھا: ''براعظم [یورپ] پر ایک لوہے کی چادر تن گئی ہے۔'' کہا جا سکتا ہے کہ یہ جملہ سرد جنگ کا باقاعدہ اعلان تھا۔ نوکریوں میں کمیونسٹوں کے خلاف غیر رسمی جانبداری پہلے ہی عام ہو چکی تھی، اور بجا طور پر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ سوایس میں بھی وہ لوگ حاوی ہوں گے جو اربابِ اقتدار کے نظریاتی حامی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس بات کو درست خیال کرتے کہ میرے بارے میں احتیاطاً تصدیق کرائی جائے، اور نتیجے میں انھیں جو کچھ معلوم ہوتا وہ یقیناً خوش کن نہ ہوتا۔ میں جب ہندستان میں تھا، مجھے معلوم تھا کہ میرے خط روک لیے جاتے تھے، اور یہ بھی جانتا تھا کہ میرے کمانڈنگ افسر کو یہ ہدایت تھی کہ وہ مجھ پر نظر رکھے۔ لندن واپس آنے کے بعد کیمبرج کے دنوں کے ایک ساتھی مائیکل کلارک

Scanned with CamScanner

(Michael Clarke) سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ انٹیلی جنس نے میری فائل بنا رکھی ہے۔ یہ مجھے اس طرح معلوم ہوا تھا کہ ایک بار جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں ہندستان میں تھا تو اس نے جواب دیا تھا، ''مجھے معلوم ہے''۔ ''تمھیں کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا، ''چونکہ میں انٹیلی جنس میں تھا، جب کبھی میں آفس میں ہوتا اور مجھے خیال آتا کہ فلاں فلاں شخص آج کل کہاں ہوگا، تو میں اس سے متعلق فائل کی دراز کھول کر دیکھ لیا کرتا تھا۔ اور بس اسی طرح تمھارے بارے میں پتا چلا۔'' بعد میں مجھے اس پر حیرانی ہوتی تھی کہ مائیکل جیسا کوئی شخص، ایک کمیونسٹ، آخر کس طرح اس قسم کے عہدے تک پہنچ گیا، اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسی فاش قسم کی غلطی صرف فوج سے ہی مخصوص کی جاسکتی ہے۔ اس کو اس لیے بھرتی کیا گیا ہوگا کہ اس نے کیمبرج میں جرمن زبان پڑھی تھی، اور انٹیلی جنس میں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو دشمنوں کی زبان سے واقف ہوں۔ انٹیلی جنس کا ایک کام کمیونسٹوں کی نگرانی کرنا بھی تھا، لیکن اگر کوئی ایک بار اس نظام میں داخل ہو جائے تو پھر اس کے ذمے کسی بھی قسم کا کام کیا جاسکتا ہے۔

انٹیلی جنس فائل جو بھی ہو، میں نے طے کرلیا کہ سوالیس میں داخلے کے لیے ایک بار کوشش ضرور کر دیکھوں گا۔ 26 مارچ 1946 کو میں نے اپنی درخواست سپرد ڈاک کی، جس میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا، اور اپنے پرانے کالج ٹیوٹر کا نام بھی تصدیق کنندہ کے طور پر نہیں دیا۔

اس دوران فوج کو بھی بالآخر لام توڑے جانے تک ہمیں مصروف رکھنے کا ایک معقول طریقہ سمجھ میں آ ہی گیا۔ اس نے ایک 'فورمیشن کالج' (Formation College) یعنی تشکیلی یا تربیتی کالج قائم کر دیا تھا جس میں کورسوں کی ایک لمبی فہرست میں سے پسند کے مطابق کورس منتخب کیا جاسکتا تھا۔ میں نے درخواست دی اور ایک ایسے کورس کے لیے میرا انتخاب ہو گیا جس کو مئی کے مہینے تک جاری رہنا تھا۔ ہشاش بشاش سا میں کورس کرنے کو روانہ ہوا۔ ''میں اب اتنا ہی کارگزار ہوں جتنا رچمنڈ میں ناکارہ تھا۔'' میرے روزنامچے میں درج ہے، ''فوجی ملازمت سے موقوفی، بڑھی چلی آ!'' (Roll on demob!)۔

5

فورمیشن کالج، اور سوالیس؟

ہمارا فورمیشن کالج ویل بیک ابی (Welbeck Abbey) میں تھا جو نوٹنگم شائر ورکشاپ (Workshop in Nottinghamshire) کے قریب واقع ہے۔ یہ ان سرکاری محلوں میں سے تھا جو جنگی مساعی میں تعاون کے عوض فوج کے تصرف میں دے دیے گئے تھے۔ لائبریریوں اور رقص گاہوں سے آراستہ یہ ایک نہایت شاندار مقام تھا جس کی وسیع اراضی میں لان اور باغ بھی خوب تھے۔ فوج میں ہمیں جو کتابچہ دیا گیا تھا اس میں اس کا بیان یوں درج تھا:

> طویل سڑک کے کنارے دو رویہ درخت ہیں جو وسطی فاصلے پر اور نیچی پہاڑیوں کی چوٹیوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ شاہ بلوط کے چند قدیم درخت جو کسی زمانے میں شیروڈ فورسٹ (Sherwood Forest) میں شامل تھے، اب بھی موجود ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ پتیوں سے ڈھکے بن پتھ کی پگڈنڈی پر آپ میلوں تک چلتے چلے جائیں اور اراضی کی زمین ختم نہ ہو۔

اس سے بھی زیادہ مسرت بخش وہاں کا انسانی ماحول تھا، یہ فوج کے ان لایعنی قاعدوں کے بالکل برعکس تھا جن کے ہم گذشتہ برسوں میں سخت کاربند تھے۔ میں نے سری نواسن کو لکھا تھا:

> ان کورسوں کا معیار اعلیٰ درجے کا ہے۔ ہر کوئی اپنی پسند کا مضمون یہاں پڑھ سکتا ہے اور کلاس میں تمام لوگ، مرتبے یا جنس کی تفریق کے بغیر، ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں۔ لوگ یہاں

Scanned with CamScanner

عہدے سے نہیں بلکہ نام سے مخاطب کیے جاتے ہیں، مثلاً 'مسٹر رسل' یا 'مس ٹرنز' وغیرہ، گویا وہ فوجی نہیں، عام شہری ہوں۔ اراضی کے میدانوں میں کتنی بھی دور تک ٹوپی کے بغیر جانے کی اجازت ہے، اور اب کوئی سلامی بھی نہیں دینی پڑتی۔

میں پورے جوش کے ساتھ مطالعے میں ڈوب گیا— میں نے انگریزی ادب اور یورپی تاریخ کا انتخاب کیا— اور پہلے ہفتے کی بیشتر شامیں لائبریری میں گزاریں۔ اس کے بعد سماجی قسم کی تفریحات ترجیح پانے لگیں۔ میں اپنی تاریخ کی ٹیچر کی دلکشیوں میں گم تھا— جو میرے خطوط کی 'مس ٹرنز' (Ms Turner) تھی۔ میں اس کی کلاس میں پیچھے بیٹھتا اور اس کی ہر بات کا جائزہ لیتا۔ اس کا چہرہ دلکش اور بال چھوٹے اور کالے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو اور حرکات وسکنات کو ذہن نشیں کرلیا— بات کرتے ہوئے وہ دایاں ہاتھ اپنے اسکرٹ کی جیب میں رکھنے کی عادی تھی، اور کبھی کبھار چاک کو اپنے دوسرے ہاتھ سے اچھالتی جاتی تھی۔ میری نظر میں اس کی واحد خرابی اس کا اعلیٰ طبقے والا متکبر لہجہ تھا— کیمبرج میں اور پھر ہندستان میں اپنے ساتھی افسروں سے پڑے سابقے نے مجھے اس قسم کے لہجوں سے بیزار کردیا تھا— لیکن اس کی کشش کی قوت نے اس جبلی ردِعمل پر غلبہ پالیا۔

کلاس میں پیچھے بیٹھنے کے بجائے اب میں اس سے ذاتی رابطے کا موقع پانے کا خواہاں تھا۔ ابتدائی دنوں کی ایک کلاس میں اس نے پوچھا تھا کہ اس کلاس میں کیا کوئی کمیونسٹ بھی ہے— ہم جو کچھ پڑھ رہے تھے، اِس سوال کا اُس سے تعلق تھا۔ میں نے فوج میں جو وقت گزارا تھا اس نے مجھے اس بارے میں محتاط رہنا سکھا دیا تھا، اس لیے میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ اب ہم 1848 کے انقلابات کا مطالعہ کررہے تھے۔ میں نے مارکس اور اینگلس کی تاریخ سے متعلق تحریریں پڑھ رکھی تھیں جس کے سبب مجھے اس عہد کی تاریخ کا اچھا خاصا اندازہ تھا۔ میری گفتگو سے جین (Jean) نے میرے علم کا اندازہ کرلیا اور اپنی بات کہتے ہوئے وہ کبھی کبھار میری جانب مڑتی اور اپنی بات کی تصدیق چاہتی یا اس میں ترمیم چاہتی۔ میں اس بات سے خوش ہوتا تھا کہ اسے میرا خیال رہتا ہے۔

ایک دن کلاس ختم ہونے کے بعد وہ میرے پاس آئی اور بولی ''تم کو یہ سب بہت ابتدائی درجے کا لگ رہا ہوگا۔ کیا تم کسی دن پڑھانا پسند کروگے؟'' میں نے اس کو یقین دلایا کہ مجھے اس کی کلاسیں بہت معلوماتی لگیں اور اس بارے میں مجھے اُس سے زیادہ علم نہیں جو میں نے اپنے عمومی قسم

Scanned with CamScanner

کے نجی مطالعے سے حاصل کیا ہے — میں کیا کہہ رہا ہوں، مجھے کچھ پتا نہ تھا۔ مجھے تو بس اس بات سے بے حد خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ آخر کار میں اس سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔

ایک دن آؤٹنگ کا منصوبہ بنایا گیا۔ ہمیں شیفیلڈ میں آیا ہوا بیلے دیکھنے جانا تھا۔ میں نے اب سے پہلے بیلے نہیں دیکھا تھا اس لیے اپنا نام لکھوا دیا۔ ایک ٹرک ہم لوگوں کو شہر لے گیا، اور ٹرک میں مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ جین ٹرز میرے سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کو سینڈوچ پیش کیے لیکن اس نے کہا کہ وہ کھانا کھا چکی ہے۔ بات کو جاری رکھنے کا کوئی بہانہ نہ پا کر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے باتیں شروع کر دیں۔ اس کا نام لیس رابرٹ شا (Les Robertshaw) تھا۔ اس سے بات کر کے پتا چلا کہ وہ بھی پارٹی ممبر ہے۔ ہم فوراً ہی سیاسی گفتگو میں محو ہو گئے جس کی وجہ سے میں وقتی طور پر جین کی موجودگی کو بھی بھول گیا۔ جیفرے ہیرس (Geoffrey Harris) نام کا ایک اور شخص بات چیت میں شریک ہو گیا۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ بھی ہماری تاریخ کی کلاسوں میں شامل ہوتا ہے لیکن اب سے پہلے ہم نے کبھی آپس میں بات نہیں کی تھی۔ نظر انداز کیے ہوئے سینڈوچوں کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اپنے سامنے بیٹھی دو نوجوان اے ٹی ایس خواتین کو دیکھا جو میری طرف رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں — صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی کچھ کھائے پیے بغیر آ گئی ہیں۔ میں نے فوراً ہی بچے کھچے سینڈوچ ان کی طرف بڑھا دیے، اور چاکلیٹ والا بسکٹ بھی دے دیا جو مجھے راشن میں ملا تھا۔ اس پر جین بولی، ''آپ بڑے شفیق ہیں۔'' ایک مرتبہ پھر اس طرح توجہ دیے جانے سے میں نے اپنے دل میں خوشی محسوس کی۔

اگلے چند ہفتوں میں میرے وہ شناسا جن سے بیلے والے سفر کے دوران ملاقات ہوئی تھی، میرے مستقل ساتھی بن چکے تھے۔ دونوں نوجوان عورتیں، جین ٹوِگ (Jean Twigg) اور مارجری گوڈفرے (Margery Godfrey) تھیں — میری ڈائری میں ان کا ذکر فوجی انداز میں 'ٹوِگ اور گوڈفرے' کے طور پر ہے۔ رابرٹ شا ڈرہم (Durham) کی جورڈی (Geordie)، یعنی دریائے ٹائن کی وادی کا رہنے والا تھا۔ نہ صرف سیاسی معاملات میں بلکہ گانے میں بھی ہماری دلچسپیاں یکساں تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے مجھ کو ایک گیت (Cushy Butterfield) سکھایا تھا جس میں سے مجھے اب صرف وَرس کی لائنیں ہی یاد رہ گئی ہیں:

Scanned with CamScanner

She's a big lass and a bonny lass
And she likes her beer
And they call her Cushy Butterfield
And I wish she was here.

(وہ ایک تندرست وتوانا خوبصورت دوشیزہ ہے/ اس کو بیئر پینا پسند ہے/ اور وہ اسے کُشی بٹرفیلڈ کہہ کر بلاتے ہیں/ کاش وہ یہاں ہوتی)

شاید اسی نے میرا تعارف جورڈی ہنی (Geordie Hinny)، (Hinny بمعنی honey) سے کرایا تھا جس کی دُھن نیلی گرے (Nelly Gray) کی دھن کے مطابق تھی۔

I dreamt there was a dancing held and Mary Clark was
there
And I thought we tripped it lightly on the floor,
And I pressed her heaving breast to mine when walzing
round the room
Tha-at's more than I dor ever do afore
Keep your feet still Geordie hinny, let's be Happy through
the night
For we may not be so happy through the day.
So-o give us that bit comfort, keep your feet still Geordie
lad
And divvent drive me bonny dreams away.

(میں نے خواب میں دیکھا کہ رقص چل رہا ہے اور میری کلارک بھی وہاں موجود ہے/ ہم رقص گاہ کے فرش پر ہلکا پھلکا رقص کرنے لگے/ کمرے میں والز کرتے ہوئے میں نے اس کے ہچکولے کھاتے سینے کو اپنے سینے سے لگا لیا/ یہ بہت زیادہ تھا اس سے، جو میں نے اب سے پہلے کبھی کیا تھا/ جورڈی ہنی، اپنے پاؤں کی گردش تھام لو، آؤ آج رات ہم لطف اندوز ہوتے رہیں/ کیونکہ شاید دن میں ہم اتنے خوش نہ ہو سکیں گے/ اس لیے ہمیں یہ تھوڑی سی راحت دے دو، اپنے پاؤں کی گردش تھام لو جورڈی/ اور میرے صحت مند خوبصورت خواب کو مجھ سے دور نہ ہونے دو)

Scanned with CamScanner

خالی اوقات میں ہم آپسی میل جول کی ملاقاتیں کرتے، وہ بھی اس طرح جو میں نے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ ہم نے لندن انٹرنیشنل آرکسٹرا سے لے کر "Flicks" تک سننے گئے — خصوصاً Brief Encounter کا میں نے خوب لطف اٹھایا۔ ایسی محفلوں کے بعد ہم بیئر پینے کے لیے پب جاتے تھے یا کسی کیفے میں بیٹھ کر مچھلی، چپس اور نرم مٹر کھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کا گہرا ہرا رنگ مجھے بہت بھلا لگتا تھا۔ ٹوِگ اور گوڈفرے میرے اشتراکی ولولے پر مجھے چڑاتی تھیں۔ لوگوں کو اب میرے اس جوش وخروش کا پتا چل چکا تھا کہ میں جن لوگوں کو پسند کرتا ہوں ان کو اشتراکی مقاصد کی جانب مائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ٹوِگ نے اب مجھ میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی لیکن میں اس کی جانب مائل نہیں تھا کیونکہ میری رومانی دلچسپیوں کا مرکز مکمل طور پر جین ٹرنر تھی۔ میں اس کی تعریف جتنی سرخوشی سے کرتا تھا اس سے ٹوِگ اور گوڈفرے تھک چکی تھیں اور انھوں نے جین کے ذکر پر پابندی لگادی تھی۔

میں اب بھی جین سے بات کرنے کے مواقع پیدا کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ اس کو تیرنے کا لباس خریدنا ہے جس کے لیے پانچ کوپن کی ضرورت تھی اور اس کے پاس سب کوپن ختم ہو چکے تھے — میں نے فوراً ہی اپنے کوپن اسے پیش کردیے۔ وہ گھبرا گئی اور بولی کہ اس نے اس وجہ سے ذکر نہیں کیا تھا، اور کسی صورت میں بھی انھیں نہیں لے سکتی۔ اس کے بعد ہماری بات چیت کا رخ لام ٹوٹ جانے کے بعد مستقبل کے منصوبوں کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اس سے سوایس (SOAS) میں داخلے کے لیے اپنی درخواست کا ذکر کیا۔ اس نے کہا، ''میرے انکل اس کے ڈائرکٹر ہیں۔'' میں نے مذاقاً کہا، ''پھر تو تم میرے لیے سفارشی چٹھی لکھ سکتی ہو۔'' وہ فوراً تیار ہوگئی۔ میں نے کہا، ''ٹھیک ہے، میرا خیال ہے کہ یہ کام پانچ کوپن کے برابر قیمت تو رکھتا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟'' وہ ہنس پڑی اور کوپن قبول کرلیے۔ اس کے بعد میں نے سوچا: توقع کرنی چاہیے کہ وہ اپنے انکل کو یہ نہیں بتائے گی کہ میں کمیونسٹ ہوں!

اس کورس کو جاری ہوئے ابھی تین ہفتے گزرے تھے کہ میں اٹھائیس برس کا ہوگیا۔ ٹوِگ اور گوڈفرے نے کارڈبورڈ کے ایک باکس میں رکھ کر مجھے کچھ تحفے دیے۔ ان میں سے ہر ایک ٹشو پیپر میں لپٹا ہوا تھا اور ان پر کچھ مذاقیہ عبارتوں والے لیبل چپکے ہوئے تھے جو زیادہ تر سیاسی جملوں پر مبنی

Scanned with CamScanner

تھے۔ ایک پیکٹ میں روسی اسٹیمپ تھے جس پر لکھا تھا: ''صرف کمیشار کے استعمال کے لیے'' صابن کی ٹکیا تھی جس پر لکھا تھا: ''ترمیم: jois کی جگہ geois پڑھیں۔'' (یعنی Bourjois (Bourgeois)۔ کچھ Beecham اور Rennies کی قبض کشا گولیاں بھی تھیں جن کے پیکٹ پر لکھا تھا "For the great purge"۔ مقبول عام گیتوں کی ایک تین پینی والی کتاب بھی تھی جس پر لکھا تھا: ''اس شخص کے لیے جو ہر وقت گاتا ہے۔''

ایک دن بالآخر میں نے جین سے یہ کہنے کی ہمت جتائی کہ وہ میرے ساتھ سینما دیکھنے چلے۔ جب اس نے ہاں کہا تو میرا دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ آفیسرز میس میں جب میں دوپہر کے کھانے کا انتظار کر رہا تھا تو ریڈیو پر ڈوراک (Dvorak) کی New World سمفنی بج رہی تھی۔ اس سے پہلے میں نے موسیقی سے اس قدر خوشی محسوس نہ کی تھی جیسی میں اب محسوس کر رہا تھا۔ ڈوراک کی اہمیت گھٹائے بغیر مجھے اقرار کرنے دیں کہ میری اس مسرت کی وجہ ڈوریک کے بجائے جین تھی۔

اگلے چار دن تک میں امید وبیم کا شکار رہا اور مجھے مبہم سے اشارے ملتے رہے۔ جب ہم سینما سے لوٹ رہے تھے تو راستے میں ہمت کر کے میں نے اپنی بانہیں اس کی کمر کے گرد ڈال دیں اور اس کے تئیں اپنے جذبے کے بارے میں بتایا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اس سلسلے میں سنجیدہ نہیں، لیکن اس نے میرا ہاتھ ہٹایا نہیں۔ اگلے دن طبقاتی جدوجہد اور 1640 کی خانہ جنگی پر بات کرتے ہوئے ہماری تکرار ہوگئی۔ بعد میں ہم نے صلح کر لی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ الوداعی رقص کے لیے میرے ساتھ جائے گی۔ میری حد تک یہ ایک پاگل پن کا اقدام تھا کیونکہ مجھے رقص کرنا نہیں آتا تھا۔ جب تک رقص چلا وہ بیشتر وقت میرے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ آدھی رات کے بعد جب ہم رقص سے واپس لوٹ رہے تھے تو اس نے وضاحت کی کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اس کے باوجود میرے دل میں اس کے لیے تحسین کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ میں نے اپنی ڈائری میں لکھا: ''اس سے ہر بات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ میرے تئیں اس کی مہربانی اور صبر ناقابل یقین ہے۔''

کورس بڑے اٹ پٹے ڈھنگ سے ختم ہوا۔ ہم سب کو علی الصباح اٹھنا پڑتا تھا۔ ایک دن ہمیں مخصوص انداز میں فوجی ہدایات ملیں: ''کچن بلاک کے باہر پانچ بج کر پچاس منٹ پر پریڈ کریں گے، جہاں سے آپ کو ورکشاپ اسٹیشن لے جایا جائے گا۔'' اب سے پانچ گھنٹے پہلے ہی تو مجھ پر یہ

Scanned with CamScanner

انکشاف ہوا تھا کہ اب جین یقیناً مجھے نہیں ملنے والی۔ میں ٹرک کے پچھلے حصے میں ایک نہایت آزاد خیال اے ٹی ایس نوجوان خاتون کے پاس جا بیٹھا جس کا نام میوِس (Mavis) تھا اور جو آفیسرز میس میں ہم کو کھانا کھلواتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرا چومنا اسے بھی اتنا ہی اچھا لگ رہا تھا جتنا مجھ کو۔ میں نے اس کا آخری بوسہ اس وقت لیا جب اس کی ٹرین نے چلنا شروع کیا اور وہ اپنے ڈبے کی کھڑکی سے باہر جھک آئی۔ اس کے جانے کے بعد ہی میں اپنی ٹرین کی طرف گیا۔

جب میں رچمنڈ واپس آیا تو میرے لیے دو خبریں تھیں جن کا میں شدت سے منتظر تھا—میری فوجی ملازمت کے خاتمے کے کاغذ اور ایک خط جس میں مجھے سواس میں انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ فوج نے میرے لیے غیر فوجی کپڑے فراہم کیے اور میں باضابطہ "102 دن کی سبکدوشی کی تعطیل" (Release Leave) پر چلا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ تین ماہ تک مجھے فوج سے تنخواہ ملتی رہے گی۔ فوج میں میری نوکری کو چند دن کم چھ سال ہو چکے تھے، اور فوجی خدمات کے لیے مجھے دو تمغے بھی ملے تھے جن کے نام 'برما اسٹار' اور 'ڈیفنس میڈل' تھے۔ یہ کوئی خاص اعزاز کی بات معلوم نہ ہوتی تھی کیونکہ اس طرح کے تمغے حاصل کرنے کے لیے آپ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا—صرف اتنا ہی کہ کسی خاص وقت میں آپ کسی خاص جگہ پر موجود ہوں۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ اہمیت اس خط کی تھی جس میں مجھے بتایا گیا تھا کہ شاہ جارج ششم جنگ میں اپنے تئیں آپ کی خدمات کے بے حد معترف ہیں، اور یہ کہ عام شہری زندگی میں بھی آپ خود کو 'کیپٹن آر ایل اسٹرائڈ آف سامرسیٹ لائٹ انفنٹری' کہلوانا جاری رکھ سکتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیپٹن آر ایل اسٹرائڈ کو بھی یہ اجازت نامہ موصول ہوا ہوگا یا نہیں کہ وہ اپنے آپ کو 'لیفٹیننٹ رالف رسل' کہلوانا جاری رکھ سکتے ہیں۔

سواس کی عمارت رسل اسکوائر کے قریب واقع ایک سڑک پر ہے۔ یہ 1930 کے عشرے کی بنی ہوئی ہے جس کے صدر دروازے تک کشادہ اور نیچی نیچی سیڑھیاں بنی ہیں۔ مجھے ایسے کمرے میں بھیج دیا گیا جہاں تقریباً ایک درجن نفوس پر مشتمل ایک انٹرویو پینل نے میرا استقبال کیا۔ پینل کی سربراہی ڈائرکٹر رالف ٹرنر (Ralph Turner) جو جین کے انکل تھے (کیا جین نے ان سے میرے بارے میں بات کی تھی؟) اور پروفیسر جان برو (John Brough) کر رہے تھے، جو جلد ہی ہندستانی شعبے

کے سربراہ بھی بننے والے تھے۔ انٹرویو کی شروعات ٹھیک ٹھاک ہوئی اور مجھے پتا چلا کہ ٹرنر اور برو دونوں ہی کیمبرج سے فارغ ہیں اور میری طرح ان دونوں نے بھی کلاسکس کی تعلیم حاصل کی تھی۔ برو تو میری مانند سینٹ جانز کالج سے پڑھے تھے لیکن ٹرنر کی تعلیم کرائسٹ میں ہوئی تھی۔ یہ وہ کالج ہے جس کے تاریخی رابطے سینٹ جانز کے ساتھ رہے ہیں۔ یہ باتیں میرے نزدیک تو اہم نہ تھیں لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کے لیے اہم ہوں گی۔ میری خوش بختی سے ایک اچھی بات اس وقت سامنے آئی جب انھوں نے مجھ سے مضامین کے انتخاب کے بارے میں پوچھا۔ اردو میں ڈگری پانے کے لیے لازمی تھا کہ معاون مضمون کے طور پر میں فارسی یا سنسکرت پڑھوں۔ میں نے سنسکرت پڑھنے کا فیصلہ اس موہوم امید پر کیا تھا کہ اس سے شاید مستقبل میں دوسری جدید ہندستانی زبانیں پڑھنے میں مدد مل سکے گی۔ ٹرنر اور برو کے نقطۂ نظر سے بھی میں نے بالکل درست جواب دیا تھا کیونکہ وہ دونوں ہی سنسکرت کے ماہر تھے۔ پینل کے ایک رکن جو مڈل ایسٹ شعبے سے تھے، کہنے لگے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے مطالعے میں سنسکرت سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا، جبکہ فارسی یقیناً زیادہ مفید ہوگی۔ ٹرنر اور برو دونوں ہی اس پر برس پڑے۔ یہ بات تو واضح تھی کہ مضمون لینے کا فیصلہ مجھی کو کرنا تھا۔ اس انٹرویو کے دوران پریشان کن لمحات بھی آئے۔ پینل کے ایک رکن نے کہا، ''اوہ، رسل، ہم نے دیکھا ہے کہ آپ نے ریفرنس کے طور پر اپنے کالج ٹیوٹر کا نام نہیں دیا ہے۔ خیر ہم نے انھیں خط لکھ دیا تھا۔'' مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے داخلے میں اڑچن آئے۔

ہوم (Holme) واپس لوٹ کر میں نے خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کی اور سوالیس سے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ میں نے اپنی تمام کتابوں کو ترتیب سے یکجا کیا، جس کے لیے مجھے بار بار انھیں شیلف سے اتارنا اور لگانا پڑتا تھا۔ میری ماں ملی میرے آس پاس رہتی اور مسلسل بولتی رہتی تھیں۔ میں البیریز کاٹیج میں ریکس اور فراؤڈ کے گراموفون ریکارڈوں کی چھان پھٹک کرتا اور وہ نغمے سنتا جو میں نے اب تک نہیں سنے تھے، اور بہت سے گیتوں کے بول ازبر کرتا۔ کپڑوں کے لیے مجھے جو کوپن ملے تھے، ان کے بہترین استعمال کے لیے بھی میں نے فراؤڈ سے مشورہ کیا۔

ریکس بھی فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا لیکن اکثر باہر رہتا تاکہ اپنے مستقبل کے لیے بہتر امکانات تلاش کر سکے۔ کلینا دو برس کی ہو چکی تھی اور مجھے اس کی صحبت میں بڑا مزہ آتا تھا۔ میں

Scanned with CamScanner

اپنی ڈائری میں اس کے بولنا سیکھنے کے مختلف مدارج لکھتا جاتا تھا۔ ایک بار جب ریکس اور فراوڈ دونوں ہی گھر پر نہیں تھے، میں اور ٹاٹس کلیلا کے ساتھ تھے۔ خیال تو یہ تھا کہ ٹاٹس کو چونکہ بچوں کی دیکھ بھال کا بڑا تجربہ ہے اس لیے وہ انچارج ہوگی لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑا مزہ آیا کہ ہر کام کے لیے کلیلا میرے ہی پاس آرہی تھی۔ ہم لوگ قریبی قصبوں کو دن بھر کے لیے جاتے رہتے تھے۔ میں جہاں بھی جاتا، اپنے ہمراہ پیپلز وار (People's War) کی ایک جلد ضرور لے جاتا تھا جس کا میں نے اشاریہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ اگر مجھے کبھی پارک میں ریکس کا انتظار کرنا پڑتا، یا ٹاٹس کو ٹرین پر سوار کرانے کے لیے رکنا پڑتا تو میں اپنے کام میں لگ جاتا اور ان الفاظ کو خط کشیدہ کرنا شروع کر دیتا جن کا اشاریہ بنانا تھا۔ ایک بار جب ہم اسٹیشن کی انتظار گاہ میں بیٹھے تھے تو کلیلا غور سے کاغذ پر ابھرنے والی چھوٹی چھوٹی لائنوں کو دیکھتی رہی اور بولی، ''کیا آپ ریلوے لائن بنا رہے ہیں؟''

میرا بنگالی دوست راشد جو لیڈز میں رہتا تھا، ایک بار پھر مجھ سے ملنے آیا۔ اس بار اس کے ساتھ اس کا ایک عراقی دوست اکرم بھی تھا۔ ایک اور دن ایک موٹر بائیک آکر رکی۔ ریکس کا ایک دوست (جو کمیونسٹ تھا) آیا تھا۔ وہ بھی فوج سے سبکدوش ہو چکا تھا اور اس کی کچھ کتابیں واپس کرنے آیا تھا۔ اس نے چینی اور خشک دودھ ملی بہت سی چائے لی اور ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ میری ڈائری میں لکھے نوٹ کے مطابق اِدھر اُدھر کی باتوں سے مراد ہے: ''ہندستان کی سماجی تاریخ، اسلام کی مارکسی توضیح، ضمنی افادیت کی تھیوری (marginal utility theory) وغیرہ وغیرہ۔''

میری کی ایک بہن، لینا (Lena)، ایک دن فراوڈ سے ملنے آئی۔ میری اپنے والدین سے ملنے کے لیے آئی ہوئی تھی اور اس نے لینا سے یہ کہلوایا تھا کہ ''آپ اس سے ملنے آئیں۔'' 'آپ' سے مراد کیا تھی؟ — کیا صرف فراوڈ سے کہلوایا گیا تھا یا پھر یہ جمع کا صیغہ تھا جس میں میں بھی شامل تھا؟ میں نہیں گیا۔ اس سے دوبارہ ملنے میں کسی کا فائدہ نہ تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ میں اس سے ملنے کی خواہش پر پابندی لگا لیتا۔ کئی گھنٹے تک میں افسردہ رہا۔

بالآخر 8 جولائی کو سوا ایس سے خط آگیا۔ میری درخواست منظور کر لی گئی تھی — وہ بھی سب سے زیادہ وظیفے کے ساتھ۔ آئندہ تین سال تک کے اخراجات اور اپنی قوت اور صلاحیت کو کسی ڈھنگ کے کام میں لگانے کا انتظام ہو گیا تھا۔ جنگ کی بدولت میں اردو کے میدان میں اترا تھا اور اب امن

Scanned with CamScanner

کی بدولت میرے سامنے اردو کے استعمال کا نیا راستہ کھل گیا تھا۔

خط ملنے کے بعد میرا پہلا ردّعمل یہ تھا کہ کرس سے بات کروں۔ وہ بھی اب سبکدوش ہو کر لوٹ آیا تھا۔ چنانچہ میں نے لندن جانے والی ٹرین پکڑ لی۔ آئندہ کئی دنوں تک ان کے گھر کے عقبی لان میں بیٹھ کر، ہیمسٹیڈ ہیتھ (Hampstead Heath) پر چہل قدمی کرتے ہوئے یا ساتھ ساتھ لندن جاتے ہوئے میں اور کرس اپنے منصوبوں پر گفتگو کرتے رہے۔ اکتوبر میں وہ بھی اپنی تعلیم ازسرنو شروع کرنے والا تھا۔ اسے لندن اسکول آف اکنامکس جانا تھا۔ اسی دوران کرس اور پیگوٹی باہمی ہم آہنگی کے ان مسائل سے بھی دوچار تھے جو جن کا سامنا ایک عرصے کے بعد ملنے والے جوڑے اکثر کرتے ہیں۔ ایسے گھر میں نباہ کرنا آسان نہیں لگ رہا تھا جو ایک طویل عرصے سے اس کی بیوی کا گھر زیادہ ہو چکا تھا۔ دونوں ہی الگ الگ ایسے دلچسپ تجربات سے گزرے تھے جن میں ایک کے تجربے میں دوسرے کی کوئی شرکت نہ تھی۔ پیگوٹی بچے کی پیدائش اور اپنے ننھے بچے کی دیکھ بھال کے دور سے گزری تھی اور کرس نے ایک عرصہ فوج میں گزارا تھا اور جرمنی کے حالات کا مشاہدہ کیا تھا۔ اب اچانک وہ دونوں کل وقتی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تھے لیکن ذہنی طور پر اس رفاقت کے لیے تیار نہ تھے۔ کرس کو ہیمسٹیڈ گارڈن کے مضافات میں رہنا بالکل پسند نہیں تھا۔ یہاں ان کا ایک وسیع گھر تھا جس میں ان کے علاوہ ایک اور جوڑا رہتا تھا۔ کرس کا خیال تھا کہ یہاں ضرورت سے زیادہ مادی آسائشیں مہیا ہیں۔ اس کے برخلاف پیگوٹی کو اس مکان سے محبت تھی۔ اس کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا اور مکان خریدنے میں اس کی ماں نے مدد کی تھی۔ اس کے نزدیک متوسط طبقے کی آسائشیں ایک نارمل طرزِ زندگی کا حصہ ہیں جبکہ کرس اور میرے نزدیک یہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ ہماری اقدار کے منافی بھی تھیں۔ ایک 'اچھے گھر' کا تصور کرس ہی کی طرح میری بھی سمجھ سے باہر کی شے تھا۔

اب مجھے بھی رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ تلاش کرنا تھا۔ اس سے پہلے مجھے اس سلسلے میں کبھی سوچنا نہیں پڑا تھا — میں جہاں کہیں بھی رہا، یا تو والدین کے فیصلے کے مطابق رہا، یا اسکول، یونیورسٹی اور فوج کے فیصلے کے مطابق۔ میں ہندستان میں ایک خیمے میں بھی خوش تھا اور دوستوں کے گھروں میں صوفوں پر بھی۔ مجھے تو بس کوئی ایسی جگہ چاہیے تھی جہاں سو سکوں، کھانا کھا سکوں اور ان کاموں پر

Scanned with CamScanner

توجہ دے سکوں جو میرے نزدیک اہم تھے۔ لیکن ایسی جگہ بھی کہاں ملے؟ گھروں کی ویسے ہی شدید قلت چل رہی تھی۔ بمباری میں لندن کے ہزارہا مکان تباہ ہو چکے تھے اور ان کی تعمیرِ نو کا کام اس ڈھرے پر نہیں آیا تھا کہ اس قلت پر قابو پا سکے۔ نئے شادی شدہ جوڑے اپنے والدین کے گھروں میں ایک ایک کمرے میں رہ رہے تھے۔ لوگ اپنے فاضل کمروں میں کرایہ دار رکھ رہے تھے۔ لیکن میں کرائے کا گھر کس طرح تلاش کرتا؟ یونیورسٹی کی رہائشی بیورو میں ایک پُرکشش نوجوان ٹائپسٹ نے بتایا کہ اس سلسلے میں ٹرم کے شروع ہونے تک کوئی مدد نہیں کی جا سکے گی، بعد میں آیئے۔ لندن میں سڑ گشتی کرتے ہوئے میں ایسے موقعوں کی تلاش میں چوکنا رہتا تھا جب ہندستانیوں سے ملاقات ہو سکے۔ ہوبرن (Holborn) اسٹیشن پر ایک دن میں نے ایک خوش لباس ہندستانی آدمی کو پلیٹ فارم پر دیکھا۔ میری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ میں نے ایک ہندستانی فلم کے پاپولر گیت ''ساون کے نظارے ہیں'' کی دھن سیٹی میں بجانی شروع کر دی۔ وہ شخص تیزی سے گھوما، میرے قریب آیا اور بات کرنے لگا۔ جاتے جاتے اس نے کہا، ''میرا پتا 46 میوزیم اسٹریٹ ہے۔ کسی وقت آیئے۔'' اور میری ٹرین آگے بڑھ گئی۔ دوسرے دن میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا، لیکن گھر میں کوئی نہیں تھا۔ دروازے پر کئی ہندستانی نام لکھے تھے لیکن میرے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے اس کا نام کون سا ہے؟

Scanned with CamScanner

6

مزید تعلیم، پارٹی اور دوسرے معاملات

سوالیس میں پڑھائی شروع ہونے سے کچھ مہینوں پہلے میں نے ولبیک ایبی (Welbeck Abbey) کورس میں داخلہ لے لیا۔ یہ کورس پارٹی کے شعبۂ تعلیم کے ذریعے چند ہفتوں کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ پارٹی کے زیرِ اہتمام بالکل عمومی قسم کے کورسوں کے علاوہ اب سبکدوش کامریڈوں کے لیے خصوصی اسکول بھی شروع کیے جا رہے تھے۔ اس کا مقصد پارٹی کے ساتھ اپنی زندگی میں ہم آہنگی کی جستجو میں ان کی مدد کرنا تھا۔ ماضی میں مجھ کو جو تجربے ہو چکے تھے ان کے سبب مجھے شک تھا کہ 'ہم آہنگی کی جستجو' کے معنی دراصل اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ لیڈر شپ کے بارے میں کسی قسم کا ناقدانہ رویہ نہ پنپنے پائے۔ یہ کورس کرنے میں میری دلچسپی اسی لیے بڑھ گئی کہ دیکھ سکوں کہ وہاں کس قسم کی بحثیں ہوتی ہیں، اور اگر ممکن ہو سکے تو ان کو ایک ایماندار سمت میں موڑ سکوں۔

پہلا کورس ہیسٹنگز (Hastings) میں منعقد ہونے والا 'سمر اسکول' تھا جس میں پارٹی کا کوئی بھی رکن داخلہ لے سکتا تھا۔ یہ نیدر روڈ (Netherwood) نام کے ایک گیسٹ ہاؤس میں تھا جس کا انتظام پارٹی، یا پارٹی سے وابستہ لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کورس میں داخلہ لینے والے ہم طالب علموں کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔ حالاتِ حاضرہ اور تاریخ سے متعلق ہر قسم کے مسائل پر وہاں لیکچر ہوتے۔ اس کے بعد بحث کا آغاز ہوتا اور ہم لوگوں کو چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بانٹ دیا جاتا۔ مجھے اپنے گروپ کا لیڈر چنا گیا۔ نصاب پر مجھے کئی طرح کے اعتراض تھے لیکن میں نے پھر بھی مثبت

Scanned with CamScanner

جذبے کے ساتھ بحث شروع کی۔ دوسرے دن ذرا خلافِ توقع بات اس وقت ہوئی جب ہمارا گروپ بین الاقوامی صورتِ حال پر بات کر رہا تھا۔ پارٹی کے شعبۂ تعلیم کے سربراہ ڈگلس گارمین (Douglas Garman)، جن پر ان کورسوں کے انعقاد کی ذمے داری تھی، بحث میں کود پڑے۔ اس مداخلت سے، ظاہر ہے، میں بالکل متاثر نہیں ہوا۔ ڈگلس کو 'لیفٹ ازم' پر نکتہ چینی سے بڑی تکلیف ہوئی تھی (پارٹی کی مروجہ زبان میں اس کا مطلب 'لیڈر شپ سے زیادہ انقلاب پسند' ہونا تھا)، جبکہ گروپ میں سے کسی نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس کو اس زمرے میں رکھا جا سکتا۔

لیکن ایک لیکچرر ایسے تھے جن سے میں واقعی متاثر ہوا۔ ایلکس میسی (Alex Massie) نام کے یہ لیکچرر اسکاٹ تھے اور کچھ عرصے کے لیے انھوں نے ینگ کمیونسٹ انٹرنیشنل (Young Communist International) میں کام کیا تھا جو کومنٹرن کی نوجوانوں کی تنظیم تھی۔ اس سبب بھی ہم ان کا زیادہ احترام کرتے تھے اور یہ سوچنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں کہ وہ اس احترام کے مستحق نہ تھے۔ بحیثیت ٹیچر وہ ہماری بات بغور سنتے۔ ایک بار ان کے ایک لیکچر کے بعد بحث کے دوران میں نے غالباً کوئی ایسی بات کہی جس کے سبب وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ وہ بعد میں اس وقت میرے پاس آئے جب میں نوٹس تیار کر رہا تھا اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس کو ذرا وضاحت سے بتانے کے لیے کہا۔ اس کے بعد انھوں نے اسکول کے نصاب کے بارے میں میری عمومی رائے پوچھی۔ ہم لوگ ساتھ ساتھ ہیسٹنگز تک گئے اور راستے بھر باتیں کرتے رہے — ہم نے برطانوی مزدور تحریک کی تاریخ کے بارے میں، اور اس تحریک کے مارکسی مطالعے کے فقدان کے بارے میں، اور جنگ کے زمانے میں پارٹی نے جو غلطیاں کی تھیں ان کو تسلیم کرنے میں پارٹی کی ناکامی کے بارے میں گفتگو کی۔ ہم نے اسٹالن کی فروری 1946 کی اس تقریر کے بارے میں بھی بات کی جس میں اس نے کہا تھا کہ یہ جنگ ''پہلے ہی دن سے فسطائیت مخالف جنگ کا، آزادی کی جنگ کا روپ لے چکی تھی۔'' اگر یہ بات درست تھی تو پھر کمیونسٹ پارٹیوں نے 1939 میں اس سے اپنی حمایت واپس کیوں لے لی تھی؟ اور بعد میں لیڈر شپ میں سے کسی نے بھی دوٹوک الفاظ میں کیوں نہیں کہا کہ وہ غلطی پر تھے؟

ہر موضوع پر ایلکس نے کھل کر اور غور و فکر کے ساتھ اظہارِ خیال کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ

Scanned with CamScanner

میری ہی طرح ان کے نزدیک بھی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان پر شدت سے غور کرنا دراصل کمٹ منٹ کا اظہار تھا، ایک ایسا وسیلہ تھا جس کے ذریعے وہ ایک بہتر دنیا کی تعمیر کی کوشش کر سکیں۔ حالانکہ وہ بہت ذی علم تھے لیکن ان میں اپنی اہمیت کا احساس بالکل نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے اوپر ہنسنا جانتے تھے۔ (مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے جو اس نے مجھے سنایا تھا۔ ایک بار کسی نے ایک اسکاٹ شخص سے پوچھا کہ آخر اسکاٹ لوگ کسی سوال کا جواب سوال سے ہی کیوں دیتے ہیں؟ اس اسکاٹ نے جواب دیا تھا، ''کیوں نہیں؟'')۔ برسوں بعد جب میں نے کلاڈ کاکبرن (Claud Cockburn) کی آپ بیتی I, Claud پڑھی تو اس میں ایک جگہ ایک آدمی کے بارے میں پڑھ کر میں چونک گیا جو مجھے بالکل ایلکس جیسا لگا:

> اس میں بہت سی خوبیاں تھیں، مثلاً حوصلہ مندی، واضح فکر، مستحکم فلسفہ وغیرہ، جو بہترین [بین الاقوامی تحریک کے کمیونسٹ] لوگوں کا وصف ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ساتھیوں سے بھائیوں جیسی محبت کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنی جان تک دینے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ سخت قسم کے نظم و ضبط کو اس لیے قبول کرتے ہیں کیونکہ فتح و نصرت کے لیے وہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اسکول ختم ہونے کے ایک ہفتے بعد میں نے ڈگلس گارمین کو لکھا کہ اسکول میں میرے خیال میں کیا کیا خامیاں رہ گئی تھیں۔ اگلے کورس ''سبکدوش کامریڈوں کا اسکول'' کے لیے میں نے (مدد کی غرض سے) کچھ تجاویز بھی رکھیں جو ستمبر میں شروع ہونے والا تھا اور جس میں مجھے بھی داخلہ لینا تھا۔ اس نے فوراً جواب دیا — ویسے کنگ اسٹریٹ میں بیٹھے عہدیدار اراکین کے اس قسم کے خطوں کا جواب دینے میں ذمے داری برتتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان کے سوالوں پر سنجیدگی سے غور بھی کرتے تھے۔ گارمین نے خوش اخلاقی سے میرا شکریہ ادا کیا اور ہر ایک تجویز کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ اس پر کام کرنا کس لیے ممکن نہیں ہے۔ اس نے خط ان الفاظ پر ختم کیا: ''دوسرے سوالوں پر شاید ہم زیادہ تفصیل کے ساتھ اس وقت بات کریں گے جب اسکول میں ملاقات ہوگی۔'' میں نے طے کر لیا تھا کہ وہاں سوال ضرور اٹھاؤں گا۔

ہیسٹنگز کے قیام کے دوران ایک اور قابل ذکر ملاقات ہمارے گروپ کی ایک نوجوان عورت

Scanned with CamScanner

کے ساتھ ہے جس کا نام فل گریفتھس (Phyl Griffiths) تھا۔ میں اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا لیکن وہ مجھ میں دلچسپی لیتی تھی اور کہتی رہتی تھی کہ ہمیں گھومنے کے لیے ساتھ جانا چاہیے۔ وہ اپنی بانہہ میری بانہہ میں ڈال دیتی تھی اور ایک بار اس نے پوچھا کہ کیا تم شرماتے ہو۔ میں شرمیلا نہیں تھا، اور میں نے اس سے یہ کہہ بھی دیا۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس کی سوچ کے مطابق اس کے ساتھ معاملات آگے نہ بڑھانے کا واحد سبب یہی تھا۔ میں نے اپنی ڈائری میں اس خام خیالی کے تجربے پر عمومی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا، ''ان عورتوں کی یہ حیرت ناک نخوت — کبھی ان کو یہ خیال بھی آتا ہے کہ لوگ ان کے تئیں جنسی طور پر لاتعلق بھی محسوس کر سکتے ہیں؟''

فل سے ملاقات کا لیکن ایک اچھا نتیجہ نکلا — وہ لندن میں رہتی تھی اور چاہتی تھی کہ ہم لوگ ملتے جلتے رہیں۔ اس کو کسی حد تک یقینی بنانے کے لیے اس نے میرے رہائش کے مسئلے کو حل کرنے کی ذمے داری اپنے سر لے لی اور کچھ عرصے بعد ایک ایسے پارٹی ممبر کے بارے میں بتایا جو کرائے دار رکھتا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ مکان مالکن بیٹی مزگروف (Betty Musgrove) سے ملنے شیفرڈس بش (Shepherd's Bush) میں اس کے مکان پر گئے — میرے لیے یہ بالکل حیرت کی بات نہ تھی کہ یہ مکان فل کے فلیٹ کے قریب تھا۔ مسز مزگروف ایکٹن (Acton) میں واقع نیپیئر فیکٹری کی ایک سرگرم ٹریڈ یونینسٹ تھی۔ اس فیکٹری میں (میرا خیال ہے) جنگ کے دوران ہوائی جہاز کے انجن بنائے جاتے تھے۔ لیکن اب جنگ سے عام شہری زندگی کی طرف لوٹنے والے مردوں کے سبب وہ بھی بہت سی دوسری عورتوں کی طرح اپنی ملازمت کھو چکی تھیں۔ دو برس پہلے ان کا شوہر راہ چلتے اچانک مر گیا تھا۔ اب کرائے کی آمدنی پر ہی گزر بسر تھی۔ ان کے گھر میں ایک کمرہ خالی تھا جو وہ مجھے کرائے پر دینے کے لیے تیار ہو گئیں۔

یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد فل نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں اس کی مدد کے لیے ممنون تو تھا لیکن اب حالات کو واضح کر دینے کا وقت آ گیا تھا، چنانچہ میں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

> فل سے میری اور جین ٹرنر کے بارے میں بات کی۔ میرے سینے کا ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔
> اس سے وہ بھی ذرا ٹھنڈی پڑی جس کے لیے میں اس کا بے حد شکر گذار رہوں۔

دوسری بار ولبیک ابی میں آنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ بیس میں میری ملاقات خاتون اے ٹی ایس

Scanned with CamScanner

میوس سے ہوئی جس پر میں نے ٹرک کے پچھلے حصے میں بوسوں کی بارش کردی تھی۔ یہ خیال کر کے کہ میری اہمیت بوسوں سے کہیں زیادہ ہے اس نے مجھے کپڑا خریدنے کے کوپنوں کے بارے میں مشورے دیے تھے۔ جین اب بھی وہاں پڑھا رہی تھی۔ اس بار ہم دوستانہ انداز میں ملے اور میرے دل میں پہلے کی مانند اس کے لیے خواہش پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے اعلیٰ طبقے کے ایک کمیونسٹ ایڈمنڈ پیننگ راسیل (Edmund Penning Rowsell) سے شناسائی بڑھائی۔ اعلیٰ طبقے والے تمام دم چھلے اس کے ساتھ بھی لگے تھے — مثلاً شراب کے بارے میں اس کی معلومات غضب کی تھی، اور ایک دن میرے جوتوں پر فقرہ کس کے اس نے مجھے شرمندہ بھی کیا۔ یہ جوتے میں نے فوج سے سبکدوشی کے وقت لیے تھے۔ ان پر سلوٹیں سی پڑ چکی تھیں جو کچھ سلیقے کی بات نہ تھی۔ لیکن شرمندگی کا یہ احساس جلد ہی ختم ہو گیا۔

ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ جلد ہی مجھے ایسے ساتھی مل گئے جن کے ساتھ شام کو چہل قدمی کرتا دور دور تک نکل جاتا۔ ہفتے کی چھٹیوں میں اور شام کو ہم لوگ لفٹ لیتے یا بس یا ٹرین پکڑ کر کسی قریبی قصبے جا پہنچتے۔ اس بار میں نے رقص کی کلاس میں داخلہ لینے کا فیصلہ تک کر ڈالا، اور کوئک اسٹیپ (quick steps) سیکھنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن میں اب بھی رقص کے موقعوں پر باہر بیٹھ کر لوگوں سے بات کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ ایک بار کسی نے ہمارے لیے کوئلے کی کانیں دیکھنے کا بھی انتظام کیا جہاں ہم نے وائنڈنگ مشینیں دیکھیں، پاور ہاؤس دیکھا اور پھر ہمیں کان کے اندر لے جایا گیا۔ اس کے بعد ہم نے کان کنوں سے ان کے کام کے حالات اور مشاہرے وغیرہ پر بات چیت کی۔

میں اس جگہ کے معمولات سے چونکہ پہلے ہی واقف تھا اس لیے میرے ذہن میں کچھ منصوبے تھے جن پر میں اپنا وقت صرف کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پہلے ہفتے کی انگریزی کی کلاس سے غیر حاضر رہنے کی اجازت لے لی اور اپنے طور پر چند دوسرے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلا کام ای ایم فارسٹر کے ناول *Howard's End* کا مطالعہ کرنا اور اس پر تبصرہ لکھنا تھا۔ فارسٹر کی تحریر کے کون سے پہلو میری پسند کے اور کون سے ناپسندیدہ ہیں، یہ سب میں نے خاصے انہماک سے لکھا۔ پھر میں نے اس کی دو تحریریں اور *Aspets of the Novel* اور *What I Believe* پڑھیں۔ لیکن بنیادی طور پر میں اس کورس میں داخلے کو ایک ایسا موقع سمجھتا تھا جو نئے لوگوں کو اشتراکیت کی

جانب راغب کرنے کے لیے مجھے ملا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر سرد جنگ شروع ہو جانے کے باوجود برطانیہ میں اب بھی ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جن کے رویے خاصے کشادہ تھے اور سیاست پر گفتگو کرنا اب بھی روزمرہ میں شامل تھا۔ جنگ کے بعد کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا، نئے رہائشی علاقے تیار ہو رہے تھے، اور ریلوے اور کانوں کو قومیانے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ معاشرہ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا اور ایسی بہت سی چیزیں ہمارے سامنے تھیں جن پر ردعمل ظاہر کیا جا سکتا تھا۔ اس کورس کے سبب مختلف نظریات اور مختلف پس منظر رکھنے والے بہت سے لوگ یکجا ہو گئے تھے، جس کے سبب یہ نادر موقع میرے ہاتھ آ گیا تھا کہ ان لوگوں سے، جن سے بصورتِ دیگر ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا، ایسے تمام معاملات پر گفتگو کر سکوں۔ ان میں سے بہت سے لوگ اس خیال کے حامی تھے کہ ایک بہتر سماج کی تعمیر ضروری ہے لیکن انھوں نے کبھی سنجیدگی سے یہ غور نہیں کیا تھا کہ حالات ایسے کیوں ہیں، یا یہ کہ حقیقی سیاسی تبدیلی لانے کے لیے کیا کرنے کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ان معاملات میں دلچسپی لیں اور زیادہ شدت اور سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کریں۔

جمعرات کی شام کی ڈسکشن گروپ سیریز کے لیے میں نے پہلے ہی دن یہ تجویز رکھی کہ میں معاصر سیاسی مسائل پر بات کروں گا۔ میں نے سوویت یونین کی خارجہ پالیسی پر گفتگو کی۔ تقریر کے دوران مجھے یہ سبق بھی ملا کہ جب آپ کو پندرہ منٹ کا وقت دیا جائے تو آپ کو چاہیے کہ اس کے لیے چالیس منٹ کی گفتگو کا مواد تیار نہ کریں۔ مجھے یاد ہے کہ جو باتیں میں نے کہیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ جنگ کے اس تجربے کے بعد سوویت یونین اپنی سرحدوں کے قریب ایسی ریاستوں کا وجود برداشت نہیں کرے گا جو اس سے عداوت رکھتی ہیں۔ بعد میں پیٹنگ رائیل نے مجھ سے کہا کہ تمھیں یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ یہ بات درست ہے لیکن اس کے خیال میں یہ بات لوگوں سے کہنے کی نہیں تھی۔ یہ بات صاف تھی کہ کڑی سچائیوں سے منھ چھپانے کی فطرت صرف پارٹی کے لیڈروں تک ہی محدود نہ تھی۔

اس کورس میں شامل پارٹی کے دوسرے اراکین اپنی شناخت ظاہر کرنے میں اتنی بھی دلچسپی نہ رکھتے تھے جتنی مجھے تھی۔ ان کے رویوں میں راز داری برتنے کا سارجحان تھا جس کا اندازہ مجھے جلد ہی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ رجحان یہ تھا کہ پارٹی کی رکنیت کو آپ اس وقت تک چھپائیں جب تک کہ

Scanned with CamScanner

مخصوص حالات میں اسے ظاہر کرنا ضروری نہ ہو جائے۔ میرا طرزِ فکر اس سے بالکل مختلف تھا، وہ یہ تھا کہ کمیونسٹوں کو بہر حال اپنی رکنیت اس وقت تک راز نہیں رکھنی چاہیے جب تک کہ مخصوص حالات اسے چھپانے کا مطالبہ نہ کریں۔

پہلے ہی جمعرات کی شام کو میری اس تقریر سے سب کو معلوم ہو گیا کہ میں کمیونسٹ ہوں، اور ایک ایسا شخص ہوں جس کو سیاسی معاملات پر بات کرنے سے دلچسپی ہے۔ کلاس سے الگ وقت میں لوگ میرے پاس گفتگو کے لیے آنے لگے۔ اس وقت ڈائری میں میں نے جو کچھ لکھا اس سے اس صورتِ حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

> ٹیڈ پول (Ted Pool) میرے پاس یہ پوچھنے آیا کہ مذہب، شادی، خاندان وغیرہ کے بارے میں پارٹی کا رویہ کیا ہے۔ شام کو جھیل کے قریب سیر کرتے ہوئے میں نے اس موضوع پر بات کی... آدھی رات کو میجر گارنر نے مجھے اور جان سٹن (John Sutton) کو اپنے دروازے پر سے رخصت کیا جہاں ہم حکومت کی قومیانے کی پالیسی پر بحث میں مشغول تھے۔

اپنے مستقل ساتھیوں میں سے ایک ساتھی پیٹ ریٹی (Pat Rattee) کے سیاسی شعور کے متعلق میں ایک مسلسل تردد کا شکار رہتا تھا۔ اس کے بارے میں اپنی ڈائری میں لکھا کہ وہ ایک انقلابی رواداری ہے اور مانچسٹر گارجین پڑھتی ہے:

> ایک لاطینی اَن دیکھی عبارت (سیسرو) کے سلسلے میں پیٹ ریٹی کی مدد کی۔ بعد میں اس کے ساتھ پھر سے بند دکان، قومیانے کی پالیسی وغیرہ پر بحث کی، اور بالآخر اسے اپنی بات ماننے پر آمادہ کیا... رقص کی شام — پیٹ ریٹی کے ساتھ طویل بحث۔ اس کے ساتھ کمیونسٹ نظریے پر بنیادی بحث کے لیے وقت دینے پر آمادگی... پیٹ ریٹی کو جھیل کے پل پر کھینچ لایا اور پوری شام کمیونزم پر بحث میں گزاری۔ اس موقعے پر طبقاتی جدوجہد اور اس کے نتائج پر بات کی جس کی تصویر کشی 1905 تا 1937 کے روس میں ملتی ہے۔ وہ سنتی رہی اور میری تقریباً تمام باتوں سے اس نے اتفاق کیا۔

(اب میں پیٹ کو یہ محسوس کرتے تصور کر سکتا ہوں کہ کئی گھنٹوں کی اس متواتر گفتگو کے بعد میری باتوں

سے متفق ہونا آسان ترین کام تھا!)

ایک اور نوجوان عورت پامیلا پول (Pamela Pool) تھی میں جس میں، گو بالکل مختلف اسباب سے، دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھیوں کے گروہ میں شامل تھی اور ایک صاف گو اور پُرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ مجھے اس کا نئے نئے اور پُرمعنی لفظ گڑھنے کا انداز بڑا بھلا لگتا تھا۔ مثلاً ایک لفظ Capurtling اس نے فلرٹ کرنے کی عادت کے معنی میں گڑھا۔ میں نے بار بار کوششیں کی کہ اس کو اپنے ساتھ تنہا چہل قدمی کے لیے آمادہ کرسکوں لیکن ناکام رہا۔ ایسے ہی ایک موقعے پر اس نے دانت نکوسے اور یہ کہہ کر غائب ہوگئی کہ تم bugger (بدقماش/ اغلام باز) ہو۔ اگلے دن میں پھر اس کو منانے کی کوشش کر رہا تھا تو کسی نے قریب سے کہا، ''اس پر رعب نہ ڈالو۔'' لیکن وہ مجھ ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتی تھی۔ کورس کے خاتمے والے روز، رات کو جب ہم ایک مقامی پب میں الوداعی پارٹی سے لوٹ رہے تھے، وہ اتنی نرم ضرور پڑی کہ اس نے مجھے الوداعی بوسہ لینے دیا۔

کورس کے خاتمے تک میں دو لوگوں کو کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنا چکا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ تقریباً بیس لوگ ایسے تھے جو کبھی کسی کمیونسٹ کے رابطے میں نہیں رہے تھے لیکن اب وہ ہمارے مقاصد کے بارے میں اچھی رائے رکھنے لگے تھے۔

1946 کی گرمیوں کے اس زمانے میں کسی موقعے پر کرس، پیگوٹی اور میں نے جنسی معاملات پر گفتگو کی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی ازدواجی زندگی میں وہ کچھ بے اطمینانی کے دور سے گزر رہے تھے۔ کرس نے پوچھا تھا کہ ''کیا تم اور تمھاری ساتھی اختلاط کے دوران بیک وقت جنسی لذت کے عروج پر پہنچتے ہو؟'' اُن دنوں اس کیفیت کو اس رشتے کا اہم ترین مقصد سمجھا جاتا تھا۔ ان کے سوال پر مجھے حیرت ہوئی اور میں نے جواب دیا، ''ہاں، ہمارے لیے یہ کبھی مسئلہ نہیں بنا۔'' لیکن اب میں غور کرتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ میرا جواب حقیقت سے بعید، لیکن میرے لاابالی پن میں مفروضے قائم کرنے کے رجحان کے عین مطابق تھا۔ اب تک میری زندگی میں دو ہی عورتیں آئی تھیں۔ پہلی محبوبہ مجھ سے تقریباً دگنی عمر کی تھی اور اُس وقت میری زندگی میں آئی تھی جب میں سترہ برس کا اسکولی لڑکا تھا۔ اس عمر میں میں خود ہی یہ فرض کر لیتا تھا کہ میرے ساتھ ہی وہ بھی لذت کے عروج پر پہنچی ہے۔ میں اپنے پہلے پہل کے جنسی تجربے میں ایسا ڈوبا ہوا تھا کہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ شاید

Scanned with CamScanner

اپنے ناتجربہ کار نوجوان عاشق کے اطمینان کے لیے محض اداکاری کر رہی ہو۔ میری دوسری محبوبہ میری (Marie) تھی، اور ہمیں یکجا سونے کا صرف ایک ہی موقع ملا تھا، البیریز کالج کے اوپر والے کمرے میں۔ میں اپنی دبی ہوئی خواہش سے اتنا مغلوب تھا کہ میرا جلد ہی انزال ہو گیا اور اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ لیکن کرس اور پیگوٹی سے بات کرتے ہوئے یہ حقائق میرے ذہن سے یکسر محو ہو گئے تھے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ اپنے ایک سفر کے دوران میں نے اپنی ایک پرانی دوست سے ملنے ڈربی (Derby) جانے کا فیصلہ کیا۔ کرس ڈکنسن (Chris Dickinson) نام کی یہ دوست پارٹی کی وُڈفرڈ (Woodford) شاخ میں کام کرتی تھی۔ وہ مزدور طبقے کی ایک نوجوان عورت تھی اور عمر میں مجھ سے کئی سال بڑی تھی۔ جب میں اٹھارہ برس کا اسکولی طالب علم تھا تو اس کے لیے بہت کشش محسوس کرتا تھا۔ وہ چونکہ شادی شدہ تھی اس لیے میں نے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بعد اس سے کوئی دس برس کے بعد اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب وہ اپنے بچے کے ساتھ ریکس اور فراوڈ سے ملنے آئی تھی۔ اس کی شادی کچھ کامیاب ثابت نہ ہوئی تھی۔ اس کا شوہر جیک (Jack) ابھی تک فوج میں تھا لیکن وہ جب بھی گھر لوٹتا تھا دونوں میں خوب تناتنی ہوتی تھی۔

کرس نے مجھے اپنے گھر آنے اور قیام کی دعوت دی تھی۔ میں خاصی رات کو اس کے گھر پہنچا۔ اس کا بچہ غالباً سو چکا تھا۔ باہر موسم بڑا سرد اور نم تھا۔ جب میں اپنا گیلا کوٹ اتار کر اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا تو اس نے اپنا ڈریسنگ گاؤن (یا ہاؤس کوٹ، آپ جو بھی کہیں) کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے نیچے وہ بالکل عریاں تھی۔ ہم لوگ بہ عجلت بستر میں گھس گئے اور جلد ہی وہ عمل کر گزرے جس کی توقع ہم کر رہے تھے۔ آسودہ ہونے کے بعد اس کے ساتھ لیٹے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ میرے بھائی ریکس کے لیے وہ کتنی کشش رکھتی تھی۔ ''اوہ، ہاں! میں ریکس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' اور مجھے یہ خیال آیا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ریکس کے متبادل کے طور پر مجھے قبول کر کے وہ کتنی خوش ہے۔

کچھ ہفتے گزرنے کے بعد اپنے ایک اور سفر کے دوران میں ایک بار پھر ڈربی سے گزرا۔ اس بار کی ملاقات مایوس کن پیرائے میں شروع ہوئی۔ جیسے ہی میں پہنچا، وہ بول اٹھی، ''تم میرے ساتھ

نہیں سوؤ گے۔'' لیکن اس کا سبب بتانے سے اس نے انکار کر دیا۔ یوں میں اکیلا سویا۔ لیکن اگلے دن علی الصباح میں کانپتا ہوا اس کے بستر کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بالآخر اس نے مجھے اپنے بستر میں آنے اور گذشتہ تجربہ دہرانے کی اجازت دے دی۔ بعد میں اس نے بتایا کہ اس نے اپنے ناقابل قبول شوہر کے ساتھ جنسی تعلقات ان دنوں از سر نو استوار کر لیے تھے جب وہ چھٹیوں میں گھر آیا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی اور پوچھنے لگی، ''کیسے؟'' میں نے کہا، ''کیونکہ تمھاری مہبل پہلے کے مقابلے میں کم چست لگی۔'' کچھ عرصے کے بعد جب ہماری ملاقات ریکس کے گھر پر ہوئی تو اس دن کو اس نے ایک کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ ان الفاظ میں یاد کیا، ''جب تم نے مجھے ریپ کیا تھا...'' لیکن میں اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس کیے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ریپ نہیں تھا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ بھی اسے ریپ نہیں سمجھ رہی تھی۔ ہم دونوں کو ہی معلوم تھا کہ ہم ایک عارضی ضرورت پوری کر رہے ہیں جس کا مستقبل پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا ہے۔ یہ صورتِ حال غالباً اس دور کی بھی عکاس تھی —— ان نوجوان عورتوں کے حالات کی عکاس جن کے شوہر جنگ پر جاتے اور بدلے ہوئے شخص کے طور پر لوٹتے تھے؛ یہ ان نوجوان مردوں کے حالات کی بھی عکاس تھی جو جنگ سے لوٹے تھے اور جنگ کے دوران جنس مخالف کے قرب سے برسوں تک دور رہے تھے۔

سوالیس میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے سے ایک ہفتہ پہلے میں پارٹی ہیڈکوارٹر میں 'سبکدوش کامریڈوں کے اسکول' میں شامل ہوا۔ اس ایک ہفتے میں جو کچھ ہوا اس نے ایک بار پھر پارٹی لیڈرشپ کے خلاف میرے غم و غصے کو جگا دیا۔

پارٹی اسکول کا پہلا سیشن 1939 سے 1946 تک پارٹی کی پالیسیوں کے جائزے کے لیے وقف تھا۔ میں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مقرر ایلک ویسٹ (Alick West) 1939-41 کے دوران پارٹی کی جنگ کی مخالفت سے متعلق حقائق کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کچھ اس طرح سے بات کر رہا تھا جس سے یہ تاثر ملتا تھا گویا شروع سے آخر تک ہم لوگ جنگ کے حمایتی رہے ہوں۔ ایسی باتیں کرنا سراسر احمق پن تو تھا ہی (کیونکہ ہم میں سے ہر شخص نے یہ دور دیکھا تھا اور جانتے تھے کہ یہ بات درست نہیں) لیکن میرے لیے یہ احساس اور بھی زیادہ پریشان کن تھا کہ ایک ذمے دار پارٹی

لیڈر کتنی بے شرمی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ بعد کے ایک سیشن میں ڈگلس گارمین خود لیکچر دینے آئے۔ ٹیسنگو پارٹی اسکول میں انھوں نے حالانکہ مجھ پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ چونکہ ایک سینئر لیڈر اور تعلیمی سرگرمیوں کے سربراہ تھے اس لیے میں ان سے سنجیدہ قسم کی گفتگو کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن جس وقت انھوں نے سترھویں صدی کے انگلش انقلاب، 1789 کے فرانسیسی انقلاب اور 1917 کے روسی انقلاب کا تجزیہ کرنا شروع کیا تو اس بات سے مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ روس میں انقلاب کے فروغ سے متعلق لینن کی تحریروں کے بارے میں وہ غالباً کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ انقلاب کے موضوع پر تقریر کرنے کو تیار، لیکن انقلاب کے مستند متون سے بظاہر بالکل ناواقف!

یہ تجربہ ان حقیقتوں کو پھر سے سامنے لے آیا تھا جن کے متعلق میری آنکھوں پر سے پہلے ہی پردہ اٹھ چکا تھا اور برطانیہ واپس لوٹنے کے بعد گذشتہ ایک سال سے جن سے میرا مسلسل واسطہ پڑ رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ پارٹی کے ساتھ جو بنیادی خرابی تھی وہ میری توقع سے کہیں زیادہ شدید تھی۔

پارٹی کے تقریباً وہ سب رہنما جن سے میں ایک سال کے عرصے میں ملا تھا، کمیونزم کے بنیادی اصولوں کو پامال کرتے رہے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ سختی کے ساتھ خود احتسابی کرتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ایک ایسی پارٹی میں رہ کر جو مساوات کے اصولوں کے لیے وقف تھی، وہ عام اراکین کے ساتھ نخوت سے پیش آتے تھے۔ ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ سب اراکین کی قدر کریں، ان کے آزادانہ طور پر کام کرنے میں مدد کریں، اوپر سے ہدایات ملے بغیر کام کرنے کی صلاحیت کو فروغ دینے میں ان کی مدد کریں اور ان نکتہ چینیوں کا خندہ پیشانی سے سامنا کریں جو اس عمل کے دوران لازمی طور پر کی جاتیں — لیکن ان میں سے وہ کچھ بھی نہیں کرتے تھے۔ پارٹی کے ضابطوں کے مطابق وہ پارٹی کانگریس کو مقتدر ترین اتھارٹی ماننے کے پابند تھے، مگر انھوں نے جان بوجھ کر یہ ناممکن بنا دیا تھا کہ کانگریس اپنے اختیار کا استعمال کر سکے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ ضروری اطلاعات اس تک نہ پہنچنے دی جائیں (پولٹ کے الفاظ میں tipping them off) جو بڑے بڑے فیصلوں کو بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ ان کی حکمت عملی کا یہ بنیادی حصہ ہونا چاہیے تھا کہ اپنے ہندستانی کامریڈوں کے ساتھ اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف لڑنے کے لیے مشترکہ محاذ بناتے، لیکن انھوں نے یہ جاننے تک کی کوشش نہیں کی کہ ان کے ہندستانی کامریڈ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان سے یہ

توقع کی جاتی تھی کہ وہ دنیا کے ہر حصے میں پھیلے تمام کمیونسٹوں کو کامریڈ سمجھیں لیکن سفید امریکی کمیونسٹوں کے ساتھ ان کا رویہ غیر ضروری نرمی کا تھا، جبکہ ہندستانی کامریڈوں کے تئیں ان کے سلوک کو جو بھی کہیں، یہ نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اور اب یہ حال تھا کہ وہ جنگ کے بارے میں اپنے موقف کے بارے میں جان بوجھ کر غلط خبریں پھیلا رہے تھے۔

دکھ اور مایوسی کے بڑھتے ہوئے احساس کے ساتھ، جو ان تجربات کی وجہ سے مجھے ملا تھا، مدد کے لیے میں نے جیمز کلگمان (James Klagman) کی طرف دیکھا جو ایک معروف کمیونسٹ تھا۔ میں ذاتی طور پر اس سے واقف تھا اور سچے دل سے اس کی قدر کرتا تھا۔ وہ پارٹی کے سب سے طاقتور لوگوں میں سے نہ تھا (ان دنوں پارٹی کے ہفت روزہ اخبار کی ادارت اس کے ذمے تھی جو خاصے بے تاثیر سے نام World News and Views کا حامل تھا) لیکن وہ چونکہ سبھی اہم لیڈروں کے ساتھ کام کرتا تھا اس لیے ان کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات 1939 میں اس وقت ہوئی تھی جب جنگ چھڑنے والی تھی۔ میں نے اس کے لیے پسندیدگی کا زبردست جذبہ محسوس کیا تھا۔ عمر میں غالباً وہ مجھ سے چار سال بڑا تھا اور میرے زمانے سے ذرا پہلے ہی کیمبرج کا طالب علم رہ چکا تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد وہ بین الاقوامی طلبہ تحریک کے ساتھ کل وقتی کارکن کے طور پر وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر میں کمیونسٹ کنٹرول والے چینی علاقوں میں اس کی ملاقات ماؤ سے ہوئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں وہ برطانوی فوج میں شامل تھا لیکن ایک طویل عرصے تک یوگوسلاو کمیونسٹوں کے رابطے میں رہا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر وہ برطانوی کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بن گیا۔ جیمز نے میری بات سنی اور مجھے لگا کہ اس نے میرے جذبات کو سمجھ لیا ہے۔ میں نے ڈگلس گارمین کے ساتھ اپنے اختلاف کا ذکر کیا اور اس نے میری دلیلوں سے اتفاق کیا۔ دو دن کے بعد ہم نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ اس دوران میں نے برطانوی اور ہندوستانی پارٹیوں کے درمیان پچھلے ایک سال کے اختلافات کی تفصیل بتائی۔ میرے بنیادی نکات سے اسے اتفاق تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں پام دت کا نظریہ معلوم کرے گا اور اس کے بعد ہی مجھ سے اس بارے میں مزید گفتگو ہوگی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے خیال میں بھی کسی نہ کسی موقعے پر پارٹی کے بہت سے رکن ایسے پریشان کن تجربوں سے دوچار

Scanned with CamScanner

ہوتے ہیں جن میں ان کے سامنے اچانک ایسی چیزیں آتی ہیں جو ان کے لیے کبھی تحریک کا باعث تھیں اور جن کو وہ سچ جانتے تھے لیکن دراصل وہ سچ نہیں تھیں۔ اس نے کہا کہ مثال کے طور پر سوویت کمیونسٹوں کے بارے میں بہت سے لوگ یہ سوچتے تھے کہ وہ عالمی کمیونسٹ تحریک کے بہترین ذہن ہیں لیکن وہ جنگ کے دوران بہت سے سوویت کمیونسٹوں سے ملا تھا اور نہیں سمجھتا کہ ایک اوسط سوویت پارٹی ورکر برطانیہ کے کسی اوسط پارٹی ورکر سے بہتر کمیونسٹ ہوتا ہے۔ جیمز پر بھی میری ہی طرح ردعمل ہوتا تھا لیکن مسائل پر اس کو میرے مقابلے میں کم حیرت ہوتی تھی اور وہ پارٹی میں ان کو حل کرنے کے معاملے میں میرے مقابلے میں زیادہ پرامید تھا۔ اس بات نے کہ اسے قومی پارٹی لیڈرشپ کا قرب حاصل تھا جو مجھے نہیں تھا، اور اس کی انتہائی امید پرستی نے، میری پریشانی کو ایک حد تک کم کرنے میں مدد کی لیکن مجھ کو یہ بھی یاد ہے کہ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ مسائل کا حل اس کے اندازے سے زیادہ مشکل ثابت ہوگا۔

میری صورت حال پر جیمز متفکر تھا اس لیے اس نے میری مدد کی کوشش بھی کی۔ مدد کے ان اقدامات میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے جارج میتھیوز (George Matthews) سے میری ملاقات طے کرائی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی حد تک میرے اعتماد کی بحالی میں مدد کرے گا۔ جارج پارٹی میں معاون سکریٹری تھا۔ اپنے طالب علمی کے زمانے سے میں اسے جانتا تھا، لیکن زیادہ نہیں۔ اس وقت وہ طلبہ کی قومی تنظیم (National Union of Students) کا نائب صدر منتخب ہوا تھا۔ (مجھے یقین ہے کہ اس عہدے پر پہلی بار کسی کمیونسٹ کو چنا گیا تھا۔) بعد میں پارٹی لیڈرشپ میں اسے اہم مقام حاصل ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ (میرے خیال میں) یہ تھی کہ وہ کسان تھا (بگل سویڈ کے قریب سینڈی نام کے مقام پر اس کا کھیت تھا) اور یہ بھی کہ اس کا تعلق ایک ریزرو پیشے سے تھا، یعنی اس کے لیے ہتھیار بند فوج میں شامل ہونا لازمی نہیں تھا۔ ایسے وقت میں جب اس کے ہم عمر بیشتر کمیونسٹ فوج میں جبراً بھرتی کیے جا چکے تھے، پارٹی کی تنظیمی ضرورتوں کے لیے افراد کی بے حد قلت تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ جارج خوش خلقی سے دوستانہ انداز میں ملا۔ لیکن میری اس نکتہ چینی کے جواب میں کہ پارٹی لیڈرشپ خود احتسابی کے عمل سے گریز کرتی ہے، وہ ہنس پڑا اور بولا، ''اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کے لیے ہم کو خود پر تنقید کرنی چاہیے، لیکن ہم نہیں

کر سکتے۔'' میرا اعتماد بحال کرنے کے بجائے اس جواب نے مجھ پر الٹا اثر کیا۔ جو اثر مجھ پر ہوا تھا میں نہیں سمجھتا کہ جیمز پر اس سے کوئی بہتر اثر پڑا ہوگا۔ اپنے معمے جیسے بیان کی جارج نے کوئی وضاحت نہیں کی، اور اس کے پیچھے کیا اسباب تھے اس کی بھی اس نے کوئی توضیح نہیں کی۔

سو یہ تھا میرے سوال کا جواب — یعنی خاموشی۔

میرے لیے اس پریشان کن اثر کی مکمل ترسیل بڑی مشکل ہے جو پارٹی لیڈروں کے تعلق سے شکستِ التباس (disilusionment) کے سبب مجھ پر پڑا تھا۔ اس کی پیمائش میں صرف اپنے عقیدے سے ہی کر سکتا تھا۔ کیا میں حد سے زیادہ اصول پسند تھا؟ میں ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔ میں نے اپنے ان گذشتہ تجربات پر پھر سے غور کیا جنھوں نے ایک اچھے کمیونسٹ سے متعلق میرے تصورات کی تشکیل میں مدد دی تھی — اور میرے یہ تصورات حقیقت پر مبنی تھے، کسی اناڑی پن کا نتیجہ نہ تھے۔ وُڈ فرڈ برانچ کے میرے ساتھیوں نے مجھے سکھایا تھا کہ ہر رکن کا یہ فرض ہے کہ وہ خود گہرا غور و فکر کرے اور جو کچھ اسے درست نہ لگے اسے چیلنج کرے۔ اور ہم یہی کرتے بھی تھے۔ کیمبرج کی طلبہ شاخ میں بھی میرے کامریڈ اس بارے میں میرے خیالات سے متفق تھے، اور ہم نے اسی اصول کے مطابق کام کیا۔ پھر میرا اپنا تجربہ تھا ہندوستان کا، جہاں میں نے دوسرے کمیونسٹوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہ ہوتے ہوئے بھی دمیتروف کے اس آئیڈل کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کی کہ کمیونسٹ وہ ہے جو ''ہر طرح کے حالات میں آزادانہ طور پر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک بار جو فیصلہ کر لیتا ہے اس کی ذمے داری لینے سے نہیں کتراتا،'' برخلاف اس کے جو'' آزادانہ طور پر کوئی قدم نہ اٹھا سکے اور ہمیشہ اس کا انتظار کرتا رہے کہ دوسرے لوگ اس کی رہنمائی کریں گے۔'' اوستروفسکی (Ostrovsky) کے سوانحی ناول کے یہ الفاظ مجھے بے حد عزیز تھے اور بیس برس کی عمر میں جب میں نے اس ناول کو پڑھا تھا تو میں اس سے بے حد متاثر ہوا تھا:

> ایسی زندگی کے لیے تا کہ موت کے وقت وہ یہ کہہ سکے: میری تمام زندگی، میری تمام قوت دنیا کے ارفع ترین مقصد کے لیے وقف ہوئی — یعنی عالم انسانیت کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے مقصد کے لیے۔

Scanned with CamScanner

اور ایسے ہزار ہا کمیونسٹ تھے جنھوں نے بالکل اسی طرح اپنی زندگیاں گزارنے کی کوشش کی۔ دنیا بھر کے ملکوں سے آنے والے ایسے بھی کمیونسٹ تھے جو فرانکو کے خلاف جنگ کے لیے اسپین پہنچے، ایسے بھی یوروپی کمیونسٹ تھے جنھوں نے جنگ کے دوران زیرِ زمین سرگرمیاں جاری رکھ کے اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالا۔ ہندستانی کمیونسٹ تھے جن کا تعلق ہر طرح کے طبقات سے تھا— جو لوگ اعلیٰ طبقے سے آئے تھے انھوں نے اپنے سرمائے کا بیشتر حصہ پارٹی کو دے دیا اور خود کسانوں کے درمیان رہ کر کام کر رہے تھے، اور ایسے بھی کمیونسٹ تھے جن کی جیبیں خالی تھیں پھر بھی پولیس کے ہاتھوں تشدد اور جیل کا خطرہ مول لے کر برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ بات درست ہے کہ ان لوگوں میں خامیاں اور کمزوریاں بھی ہیں، وہ آپس میں لڑتے ہیں اور اپنے تمام اصولوں کے مطابق نہیں جیتے۔ یقیناً میں نے کمیونسٹوں میں انفرادی طور پر بھی اور تنظیمی سطح پر بھی خامیاں دیکھی تھیں اور یہ محسوس کیا تھا کہ ان کو دور کرنے کے لیے بہت زیادہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ محض خامیاں ہی تھیں، اس کے سوا کچھ نہیں: انھوں نے بنیادی تصویر کو نہیں بدلا تھا۔ اب میں دیکھ رہا تھا، بلکہ کئی بار دیکھ چکا تھا، کہ پارٹی کے رہنما اس سے کتنا دور تھے جو اُن کو ہونا چاہیے تھا، یا جو ہونے کے وہ دعوے کرتے تھے۔ میں نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ انھیں خود کو کمیونسٹ کہنے کا کسی بھی طرح کوئی حق نہیں ہے۔

❁❁

پاکستانی اردو کتابیں

بے نظیر بھٹو
(شہید جمہوریت کے آخری 72 دن)
مطلوب احمد وڑائچ
قیمت: 400 روپے

کارل مارکس کی مشہور کتاب
داس کیپٹل
ترجمہ: سیّد محمد تقی
قیمت: 400 روپے

خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز
یڈرک اینگلز
قیمت: 200 روپے

کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو
کارل مارکس، فریڈرک اینگلز
قیمت: 400 روپے

مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقا
(فلسفہ)
ظفر سپل
قیمت: 160 روپے

قلعہ
(ناول)
فرانز کافکا، ترجمہ: طارق عزیز سندھو
قیمت: 260 روپے

میری زندگی
(سوانح)
لیون ٹراٹسکی، ترجمہ: جاوید شاہین
قیمت: 395 روپے

انقلاب سے غداری
(سیاست)
لیون ٹراٹسکی، ترجمہ: خالد مسعود
قیمت: 300 روپے

آغا خان
(سوانح)
مہیر بوس، ترجمہ: حمید اختر
قیمت: 400 روپے

مطالعۂ قابل
(قابل اجمیری کے فن کا تنقیدی مطالعہ)
وحید الرحمٰن خان
قیمت: 120 روپے

Scanned with CamScanner

مزاح نگار ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی کتابیں "سٹی پریس" میں دستیاب ہیں

اردو نثر میں طنز و مزاح
(تنقید)
قیمت: 590 روپے

خود ستائیاں
(خود نوشت خاکے)
قیمت: 200 روپے

ذاتیات
(طنز و مزاح)
قیمت: 100 روپے

خاکہ نگری
(مزاحیہ شخصی خاکے)
قیمت: 200 روپے

قلمی دشمنی
(طنز و مزاح)
قیمت: 100 روپے

غزل آباد
(عمدہ غزلوں کا انتخاب)
قیمت: 200 روپے

اکادمی ادبیات کی "پاکستانی ادب کے معمار سیریز" کے تحت شائع کی گئی کتاب

محمد خالد اختر: شخصیت اور فن

قیمت: 145 روپے

Scanned with CamScanner

پاکستانی اردو کتابیں

جمہوریت کی آزمائش

(سیاست)

ڈاکٹر سید جعفر احمد

قیمت:625روپے

پاکستانی سماج

(سماجیات)

مدیر: یوری گنکوفسکی، ترجمہ: ڈاکٹر محمود صادق

قیمت:423روپے

سچ بولنے کا وقت

(طنزومزاح)

رضیہ فصیح احمد

قیمت:200روپے

ضربِ تنقید

(تنقید)

ناصر بغدادی

قیمت:400روپے

بطلِ حریت ــــ فقیر آف اپی

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

قیمت:220روپے

پاکستان کی قومیتیں

(سماجیات)

یوری گنکوفسکی

قیمت:275روپے

انقلابِ ایران

(سیاست)

سبطِ حسن

قیمت:350روپے

قرۃ العین حیدر کے مضامین اور خاکے

داستاں طراز

مرتبہ: آصف فرخی

قیمت:275روپے

معروف صحافی احمد بشیر کے کالموں کا مجموعہ

خونِ جگر ہونے تک

مرتب: شعیب عادل

قیمت:200روپے

دوناول

(صدیوں کی زنجیر، یہ خواب سارے)

رضیہ فصیح احمد

قیمت:700روپے

Scanned with CamScanner

چونکہ ہمارے ملک میں سرکاری محکموں کی جواب دہی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اس لیے پاکستان پوسٹ کے اس اقدام کے اسباب جاننا بہت مشکل ہے۔ اس کا نتیجہ البتہ واضح ہے، اور وہ یہ کہ رسالے کی ترسیل کے لیے شہریوں کے ادا کردہ ٹیکسوں سے چلنے والے محکمۂ ڈاک پر بھروسا کرنا اب ممکن نہیں رہا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہمیں اور رسالے کے خریداروں کو ترسیل کا خرچ کم رکھنے کے لیے نئی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔

آج کے سالانہ خریدار ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں رہتے ہیں۔ ان شہروں اور قصبوں تک رسالے کی ترسیل اور سالانہ خریداری کی تجدید کا خرچ کم رکھنے کے چند ممکن طریقے یہ ہیں:

(1) ایک مقام پر رہنے والے کئی خریدار اپنی خریداری کی تجدید کی رقم آپس میں جمع کر کے منی آرڈر کے ذریعے ایک ساتھ ارسال کر دیا کریں۔

(2) ایک شہر یا قصبے میں رہنے والے کئی خریدار کسی ایک پتے پر رسالہ منگوالیا کریں۔

(3) کراچی میں مقیم جن خریداروں کے لیے ممکن ہو وہ اپنا رسالہ آج کے دفتر سے دستی حاصل کر لیں۔

(4) لاہور، اسلام آباد، ملتان، بہاول نگر، کوئٹہ، حیدرآباد وغیرہ میں رسالے کی کاپیوں کے پیکٹ ٹرک کے ذریعے کسی ایک پتے پر بھجوا دیے جائیں اور جن خریداروں کے لیے ممکن ہو وہ اس پتے سے اپنا رسالہ دستی حاصل کر لیں۔

اگر آپ کے ذہن میں ان کے علاوہ کوئی اور تجویز ہو تو ہمیں ضرور لکھیے تاکہ رسالے کی اشاعت بند کرنے کے فیصلے کو جہاں تک ممکن ہو، ملتوی رکھا جا سکے۔ امید ہے ہمیں آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔

—— اجمل کمال

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

قیمت: ۱۵۰ روپے

Scanned with CamScanner